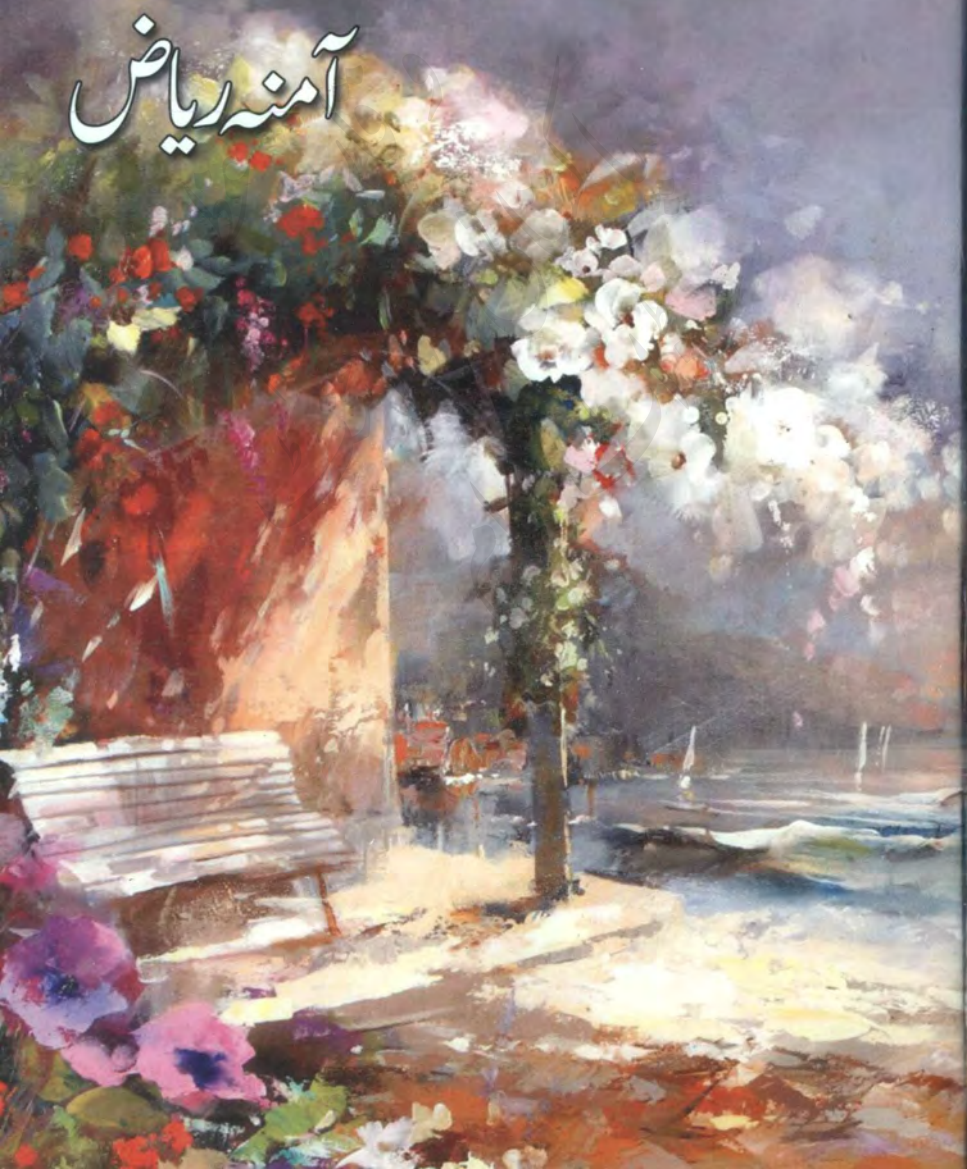


محبت کے ایمان ٹھہری

آمنہ ریاض



پیش لفظ

”محبت بے اماں ٹھہری“ میری ابتدائی دور کی لکھی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف جرائد میں شائع ہو کر قارئین کی پسندیدگی کی سند پا چکی ہیں۔ دس سال کے طویل عرصہ میں، میں نے گو کہ بہت ہی کم لکھا اس کے باوجود یہ خدا کا مجھ پر کرم ہے کہ یہی کہانیاں میرا نام قارئین کے ذہن میں زندہ رکھنے کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

ان کہانیوں میں محبت بھی ہے نفرت بھی۔ خلوص بھی ہے بددیانتی بھی۔ دوستی اور دشمنی بھی ہم قدم ہیں تو چاہت اور رقابت کو بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ غرض اس مجموعے میں آپ کو زندگی کا ہر رنگ ملے گا۔ ان رنگوں کو بڑے سلیقے سے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کتنی کامیاب رہی اس کا فیصلہ کرنا صرف میرے قارئین کا حق ہے۔

میں صائمہ اکرم کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کروانے کا خیال دیا۔ صائمہ بلاشبہ ایک بہت اچھی مصنفہ ہیں لیکن اس سے بھی اچھی دوست ہیں۔

میں القریش پبلی کیشنز اور محمد علی قریشی صاحب کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کو ترتیب دینے کا اہتمام کیا۔

آمنہ ریاض

محبت بے اماں ٹھہری

روشنی کے حکمران نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اپنی کرنیں بڑی فراخ دلی سے زمین کو سونپی تھیں۔ ساری کرنوں نے دائرہ بنا کر اپنی سمت متعین کی اور منتشر ہو گئیں۔ ایک کرن نے دور سے اس بڑے سے گھر کی کھڑکی کو دیکھا تھا جس کی چوکھٹ کے گرد جھکا تیل اپنی تمام تر خوب صورتی و رعنائی کے ساتھ آویزاں تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہاں تک آئی اور ونڈ وگلاس سے اپنی ننھی سی ناک نکا کر اندر جھانکا۔ محبت کی مہک اسے دیکھ کر مسکائی اور بڑی شوخی سے آنکھ مار کر اندر آنے کی دعوت دی۔ جواباً کرن بھی مسکرا دی اور چھلانگ مار کر شیشے کے پار اتر گئی۔ پلنگ پر خوابیدہ دونوں میں سے ایک کے چہرے پر بڑی نرمی سے بوسہ دیا۔ وہ کسمپائی اور کروٹ بدل لی۔ ہاذا باعث تملہا ہٹ ہوتی ہے سو کرن بھی تملہا اٹھی اور دور سے اپنی ہم جولیوں کو کھینچ لائی جو اس کے سارے وجود پر چھا گئیں۔

”اف! یہ صبح اتنی جلدی کیوں ہو جاتی ہے؟“

اب تملہا ہٹ کا شکار وہ ہوئی تھی اور کسلندی سے اٹھ بیٹھی تھی۔ پونٹوں پر نیند براجمان تھی۔ اس نے بال سیٹھے ہوئے دائیں طرف سوائے اسعد کو دیکھا پھر گلاس ونڈ وکو۔ دوسرے ہی لمحے وہ پردے برابر کر کے دوبارہ بیڈ پر دراز ہو چکی تھی۔ کرنیں دھکا دے کر باہر نکالے جانے پر منہ بسور نے لگیں پھر کوئی روز نہ پا کر کسی اور سمت کی طرف گامزن ہو گئیں۔ دوسری باری نیند میں خلل تب پڑا تھا جب مخصوص انگلیوں کے لمس نے اس کے بالوں میں پلچل چائی تھی۔

”پلیز سعدی! مجھے سونے دو.....“ اس نے کروٹ بدلنا چاہی لیکن اسعد نے روک دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے پھر سے سونے کی۔ میں پہلے ہی آفس سے لیٹ ہو چکا ہوں اور زبیری صاحب کا دو بار فون بھی آچکا ہے۔ جلدی سے میرے لیے کافی بنا دو اور ہاں یہ ٹائی کی ناٹ بھی لگاؤ۔“

اسے ٹائی کی ناٹ لگانی نہیں آتی تھی اسی لیے پہلے یہ کام اسعد کے والد کیا کرتے تھے اور اب دیجو۔

اسعد کی بات کا الٹا اثر ہوا تھا دیو کو سر تک کبل تانے دیکھ کر اس نے ہاتھ کمر پر رکھ کر اسے گھورا پھر ایک جھٹکے سے کبل کھینچ دیا۔

”میں نہیں چاہتا کہ زبیری صاحب پھر سے فون کریں لہذا فوراً سے پیشتر اٹھ بیٹھو..... دیا! میں تم ہی سے کہہ رہا ہوں۔“ وہ اسے یوں ہی مخاطب کیا کرتا تھا۔

”اف! یہ زبیری صاحب۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”میں ان زبیری صاحب سے بہت تنگ ہوں سعدی! آخر باس تم ہو یا وہ۔ ذرا سی دیر ہوئی نہیں اور ان کی انگلیوں میں کھجلی شروع ہوئی نہیں۔ آخر تم انہیں جاب سے فارغ کیوں نہیں کر دیتے۔ ان فیکٹ باس کو تو آفس دیر سے آنے کی اجازت ہوتی ہی چاہیے۔“ اس نے موقف بیان کیا تھا، اسعد مسکراتے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے جا رہا۔

”دیکھیے مسز دیو اسعد! اول تو آفس دیر سے جانا میرے اصولوں میں شامل نہیں ہے سو چوڑا جب آفس میں باس ہی دیر سے پہنچے گا تو در کرز اس چیز کا کیا اثر لیں گے۔ دوسری بات یہ کہ زبیری صاحب پاپا کے زمانے کے در کر ہیں۔ بہت ہی سختی اور قابل اعتماد۔ میں ان کی عزت بھی بہت کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے بیٹا کہتے ہیں لہذا انہیں فارغ کرنا ناممکن ہے۔ اب سیدی طرح یہاں آ کر ناٹ لگاؤ۔“

وہ کچھ رعب سے بولا تو دیو بچہ مند بسورتی اس کے قریب آن رکی۔ ناٹی کی ناٹ لگاتے ہوئے وہ مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی جو اسعد پر واضح نہیں ہو پاری تھی سو اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”سعدی! اب تم ناٹی کی ناٹ لگانا سیکھ لو۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے کچھ تعجب سے پوچھتے ہوئے اس کی کمر کے گرو بازو پھیلا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

”ہر روز تم یوں مجھ سے ناٹی کی ناٹ لگوانے آتے ہو جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کے پاس جا کر کہتا ہے ماما مجھے اسکول کے لیے تیار کر دو۔“

”ہا ہا ہا۔“ اس کی خنجدی اسعد کے قہقہے میں کھو گئی تھی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ گھورنے کا اسعد پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ ہنستا ہی چلا گیا تو وہ بھی مسکرا دی بالوں کی گرہ کھل کر کندھوں پر بکھر گئی تھی۔ اسعد کی نظریں زلفوں میں الجھ گئیں۔

”یوں کیا دیکھ رہے ہو؟“ پلکوں کی جھار عارض پر تھرکنے لگی تھی۔

”دیکھ رہا ہوں میری بیوی غصے میں زیادہ حسین لگتی ہے یا ہنسنے ہوئے.....“ اس کے ہونٹ دیو کی پیشانی کو چھونے لگے تھے۔

”سعدی! زبیری صاحب کا فون پھر سے آ جائے گا۔“ فقرہ معنی خیز تھا۔ اسعد کی کمر لگیا۔

”سو واٹ؟ بقول تمہارے زبیری صاحب کو تو عادت ہے بار بار فون کرنے کی۔“

متبسم و شریر لہجے نے دیو کو جھینپنے پر مجبور کر دیا تھا جسے چھپانے کے لیے اس نے دونوں ہتھیلیاں اسعد کے سینے پر رکھ کر پیچھے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اسٹول کا سہارا لینے لگا۔

”آفس دیر سے جانا تمہارے اصولوں میں شامل نہیں ہے۔ میں ناشتا تیار کرنے جا رہی ہوں تم جلدی سے آ جاؤ۔“ مختصر لفظوں میں وہ اپنی بات سمجھا گئی تھی اور کمرے سے نکلے ہوئے اس نے اسعد کا چھت پھاڑنا قہقہہ نہا تھا۔ اس کے اپنے چہرے پر بھی اسعد کی محبت تبسم کی طرح بکھر گئی۔

کچن میں آ کر اس نے الیکٹریکل کیبل کا پلگ لگایا اور خود اسعد کا فیورٹ آلیٹ تیار کرنے لگی کیونکہ اس کے بعد اسعد نے محض ڈنبری کرنا تھا۔ لٹچ ٹائم میں بھی وہ محض چائے، کافی پر گزارا کرتا تھا اور پھر ڈنر گھر پر ہی کیا کرتا تھا۔ جس طرح اسعد اس کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتا تھا اسی طرح دیو خود بھی اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ بس اس کی شخصیت میں شدت پسندی کا عنصر غالب تھا اور اسی شدت پسندی کے زیر اثر وہ اسعد کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک بار اسعد کے جوتے پالش کرنے پر اس نے ملازمہ کو تھپڑ مارا تھا۔ صبح آفس جاتے ہوئے وہ بریف کیس خود تھاتی تھی اور کوٹ بھی خود ہی پہناتی تھی۔ اب بھی وہ اسے پورچ تک چھوڑنے آتی تھی۔

”سنو سعدی! تمہیں یاد ہے نا آج ہمیں مسز فاروق کے یہاں جانا ہے۔“

وہ پوچھ رہی تھی اسعد نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک بار پھر اس کے گال پر اپنی محبت ثبت کر کے کار اشارت کر دی تھی۔ دیو گیٹ پر اس وقت تک کھڑی رہی جب تک روڈ پر کار کا نقطہ معدوم نہیں ہو گیا۔

+

مسز فاروق کے گھر کا لان بے حد خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سبز گھاس پر تھرکتی روشنیاں اور اس گھاس کو بیدردی سے روندتے قدم آپس میں برسر پیکار تھے۔ سفید وردیوں میں لمبوس ویشرز ہاتھوں میں سنہری طشتریاں اٹھائے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ رات کی مناسبت سے گہرے رنگوں کے لمبوسات سے سجے وجود، میک اپ کی جہیں چہروں پر چڑھائے ایک دوسرے میں گمن تھے۔ مسکرائیں تھیں، ریشمی کپڑوں کی سرسرائیں تھیں، قہقہے تھے، ہلکھلاٹیں تھیں۔ دنیا جہان کے مختلف پرفیومز کی خوشبوؤں کے حصار کو توڑتی، باربی کیوز کی اشتہا انگیز مہک سارے لان میں قبضہ جما رہی تھی۔

بیک گراؤنڈ میں جیتی مدھم و مدھم موسیقی نے سارے ماحول کو رومینک بنا دیا تھا اور سب سے بڑھ کر چہار سو پھیلی چاندنی فضا کی خنکی کو کھینچ کر ہر وجود پر کچکی طاری کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی جس میں اسے کسی قدر کامیابی بھی ہوئی تھی۔

اور اس سارے ماحول کا ایک جزو وہ بھی تھی جس کے سراپے کو نیوی بلیو کمر کی سازشی نے خرید رکھا بنا دیا تھا۔ اس نے اپنی شہر رنگ زلفوں سے ہم رنگ آنکھیں ایک ہی سمت میں نکار کھی تھیں جہاں اسد احمد گیلانی اپنے بیش قیمت سوٹ کی پرواہ کیے بغیر گھاس پر پھسکڑا مارے بیٹھا تھا اور رنگ برنگے لمبوسات میں لمبوس بچوں کا ایک بڑا سا گروپ اس کے گرد دائرے کی صورت بر اجماع تھا۔ محبت، شفقت اور اسی قسم کے دوسرے جذبات ایک ساتھ اس کے چہرے کا حصہ بنے ہوئے تھے..... اور وہاں کچھ اور بھی تھا شاید کچھ نہ ہونے کا دکھ..... اگرچہ اس کے چہرے پر رقم نہ تھا مگر جو آپ سے محبت کرتے ہیں وہ آپ کے اندر رہتے ہیں۔ وہ اندر کے حال سے ہر لمحہ واقف ہوتے ہیں۔ آپ کچھ نہ بھی کہیں وہ پہچان جاتے ہیں۔ سو وہ بھی پہچان گئی تھی۔

یہ شاید اس کی نظروں کی تپش ہی تھی جس نے اسد کو سرائٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بڑے جاندار انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور نفی میں گردن ہلا دی تھی۔ اسد نے کندھے اچکائے اور پھر سے بچوں میں گمن ہو گیا۔ وہ ریڈ اسٹونز سے بنی روش سے گزرتی اس حصے میں آگئی جہاں سفید سنگ مرمر کا فوارہ فمقوں سے منعکس کر کے ست رنگے موتی برسا رہا تھا۔ وہ کنارے پر تک کمر موتیوں کو تھیلی پر جمع کرنے لگی، اسے لگا شاید کچھ ایسے ہی موتی اس کی آنکھوں میں بھی نکلے ہیں ذرا جو موقع ملا تو باڑھ توڑ کر باہر نکل آئیں گے بھی اس نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی تھی، جانی پہچانی سی آواز، مانوس سی آواز۔ اس نے پلٹیں جھپک کر آنسوؤں کو واپس دھکیلا اور اس سے پہلے کہ وہ مرکز دیکھتی پیچھے والی شخصیت اس کے سامنے آگئی۔ وہ صبا تھی اس کی میٹ فرینڈ جو آتے ہی اس سے لپٹ گئی تھی۔

”کیسی ہو دیجیہ! قسم سے اتنا دل چاہ رہا تھا میرا تم سے ملنے کو۔ اگر آج یہاں ملاقات نہ ہوتی تو میں کل تمہارے گھر آنے والی تھی۔ ویسے تم مسز فاروق کے یہاں کیسے؟ میں تو کل ہی بیروت سے آئی ہوں۔ یونو فاروق بھائی، ابراہیم کے بہت اچھے دوست ہیں اور.....“

وہ یونہی نان انشاپ بولا کرتی تھی مگر اس وقت دیجیہ نے ٹوک دیا۔

”خدا کے واسطے صبا! آہستہ آہستہ بات کرو..... ممکن ہے میں تمہاری بات بہتر طریقے سے سمجھ سکوں۔“ صبا شرمندہ ہوئے بغیر ہنس دی۔

”چلو وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر کوئی والی میز پر لے آئی پھر شکوہ و شکایات کی فہرستیں نکالی گئیں۔ معافی تلانی ہوئی، گزرے قصبے دوہرائے گئے۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی لیول تک کے دوستوں کو یاد کیا گیا اور یوں وہ ماضی کے شبستان سے گزر کر حال کے گلستان میں داخل ہو گئے۔

”محض چار سال ہی تو ہوئے ہیں ہمیں یونیورسٹی چھوڑے اور لگتا ہے صدیاں بیت گئیں۔“ صبا کی

نظریں سیاہ آسمان میں جانے کیا کھوج رہی تھیں۔

”ہاں لیکن کبھی کبھی بالکل کل کی بات ہی لگتی ہے۔“ صبا تائید میں سر ہلاتے ہوئے ہنسنے لگی کوئی قصہ ذہن کی راہ گزرے گزرا تھا۔

”اور وہ تمہارا بچوں کہاں ہے؟“ صبانے پوچھا تو دیجیہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔

”اسد کی بات کر رہی ہوں۔“

دیجیہ نے مسکراتے ہوئے اسد کی طرف اشارہ کر دیا صبا اس طرف دیکھنے لگی اور بولی۔

”ایک میرے میاں ہیں جنہیں ہر محفل میں لڑکیوں کے سچے راجہ اندر بنے رہنے کا شوق ہے اور ایک یہ اسد ہے..... خیر ان بچوں میں سے تمہارا کونسا ہے؟“ دیجیہ خاموش رہی جس موضوع سے بچتی آئی تھی نادانستہ طور پر چھڑ گیا تھا۔

”ان میں سے کوئی بچہ میرا نہیں ہے صبا۔“ اس کے لہجے کا اضطراب صبا سے مخفی ہی رہا۔

”اچھا پھر وہ کہاں ہے کیا گھر پر چھوڑ آئی ہو؟“

وہ ایک بار پھر خاموش رہی۔ کیا کہے؟ کس سمت میں قدم دھرے۔ سچ کہہ دے یا موضوع بدل دے؟ سچ کڑوا ہے اور موضوع بدلنا بے حد مشکل۔

”اے! یہ تم کہاں کھو جاتی ہو۔“ صبانے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔ وہ چونکی۔

”میں پوچھ رہی تھی.....“

”یہ آخر کیوں جانا چاہتی ہے؟“ اس نے سوچا۔

”کوئی اور بات نہیں کر سکتیں صبا۔“ وہ اکتاہٹ سے بولی تھی۔ صبانے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے اگر تم نہیں بنانا چاہتی ہیں تو.....“

”نہیں نہیں صبا! میں تمہیں بتاتی ہوں۔ کوئی بچہ نہیں ہے میرا۔ خدا نے مجھے اتنی صلاحیت ہی نہیں دی کہ میں اولاد پیدا کر سکوں سمجھ رہی ہوں تم، صبا بانجھ ہوں میں.....“

وہ یک لبت ہی بھڑک اٹھی تھی۔ یہ چند لفظ بولنے میں اس کی ساری قوت صرف ہوئی تھی شاید۔ تبھی تھک کر سردنوں ہاتھوں میں گر لیا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر رو نہیں پاری تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگا تھا جیسے صبا اس راز سے واقف ہے اور جان بوجھ کر اسے کید رہی ہے۔ یقیناً دل ہی دل میں اس پر ہنس بھی رہی ہو گی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سرد ہوا کے جھوکے بھی خراماں خراماں دھرتی کا رخ کر رہے تھے اور وہ ہر احساس سے بے نیاز صرف ایک احساس کے زیر اثر تھی۔

”آئی ایم ایک سٹریٹلی سو ری دیجیہ! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ ان فیکٹ میں تو جانتی ہی نہیں تھی.....“ اس کا انداز وضاحتی تھی اور وہ کرسی پر جھکی اس کے کندھے تھپک رہی تھی۔

”اُس اوکے بس میں ہی irritate ہو جاتی ہوں۔“ وہ بمشکل مسکرائی تھی۔

”نہیں بھئی دراصل میری باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کو غصہ دلا دیں۔ تمہیں یاد ہے نا ابراہیم ہماری شادی سے پہلے کتنے کول مائنڈ ہوا کرتے تھے مگر اب.....“

صبا نے اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے اور ماحول کو خوشگوار دینا کے لیے کمال خوبصورتی سے موضوع بدل دیا تھا اور بظاہر تو وہ بھی بہل گئی تھی مگر جب احساس محرومی جاگ اٹھے تو اسے دبانے کا حد مشکل ہوتا ہے۔ پرانے زخم چھڑ جائیں تو انہیں بھرنے میں وقت تو لگتا ہی ہے نا۔

تارکول کی سیاہ سڑک ڈوبتے چاند کی زرد روشنی میں نہانی ہوئی تھی۔ دور وہ قد آور اشجار جنات کی طرح تنے ہوئے تھے اور اپنی شاخیں پھیلائے حملہ کرنے کو بیتاب۔ اسعد نے ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر اس پر ڈالی تھی جو اپنے بالوں کو انگلی پر پلپیتے ہوئے کھڑکی سے باہر نجانے کیا کھوج رہی تھی۔ اسعد نے ذرا سا جھک کر اس کے شانے سے اپنا شانہ ٹکرایا تھا وہ متوجہ ہوئی اور اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دی۔

”جب ایک بے انتہا ہینڈسم بندہ پہلو میں بیٹھا بندہ اس کا مجازی خدا بھی ہو۔“

وہ حد درجہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا لیکن آنکھوں میں شرارت ہلکورے لی رہی تھی۔ دیکھنے والے اس کے ہونٹوں پر پھیلی بیاری سی مسکان کو دیکھا جو دیکھ کے لیے اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

”اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ پہلو میں بیٹھے ہینڈسم بندے کو نظری لگا دی جائے۔“ اپنی طرف اسے ایک ٹک دیکھتا پا کر وہ شرارت سے گویا ہوا تو دیکھ پھر سے باہر دیکھنے لگی۔

”کاش میں تم کو نظر لگا سکتی تو کسی اور کی نظر لگنے کا خطرہ ہی نہ ہوتا۔“

”اور وہ کسی اور کون ہے؟“ وہ کسی قدر حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

”مسز عباس کی نند..... سارے فنکشن میں وہ تمہیں ہی دیکھتی رہی گھور گھور کے.....“ اسعد کا قبہ بڑا زور دیا تھا کیونکہ دیکھ کا زور ”گھور گھور“ ہے۔

”یقین کرو یہ خبر مجھے تم سے ملی ہے کہ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ورنہ میں نے تو آج مسز عباس کو نہیں دیکھا ان کی نند کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔“ اسعد نے دیکھ کو بھائی روکتے دیکھا تو باز وہ پھیلا دیا۔

”یہاں آ جاؤ۔“ دیکھنے والے نے ذرا سا کھسک کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اسعد کا مضبوط ہاتھ اس کے شانے پر تھا۔

”حیرت ہے کہ تم نے مسز عباس اور ان کی نند کو نہیں دیکھا حالانکہ وہ بالکل تمہارے سامنے والی ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔“

”تم مجھ پر شک کر رہی ہو دیا؟“ اسعد نے اپنے لہجے میں دل گرفتگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی

تھی۔

”بالکل نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں میرا حق کوئی غصب نہیں کر سکتا۔“ اس نے شانے پر دھرا ہاتھ ہونٹوں سے لگایا تھا۔ اس کے اس قدر پختہ یقین پر اسعد بھرپور انداز میں مسکرا دیا۔

”حقیقتاً مجھے تو آج فرصت ہی نہیں ملی کہ کسی کی نند کو دیکھوں دراصل بچوں کی مخلوق ہوتی ہی اتنی خوب صورت ہے کہ کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتی۔“ نادانستہ وہ دیکھ کے دل پر ہاتھ مار بیٹھا تھا۔ ایک آہ تھی مگر بے آواز ہونٹوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

”سعدی!“ اس نے ہولے سے پکارا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”دو باتیں پوچھ لو۔“ وہ گن سا ڈرائیو کر رہا تھا۔

”تمہیں بچہ بہت اچھے لگتے ہیں سعدی؟“ وہ پوچھ رہی تھی اور لہجہ اندرونی حالت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اسعد کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دیکھنے والے نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا تب اسعد نے اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے شانے پر مضبوط کر دی۔

”ہاں دیکھ! مجھے بچہ بہت اچھے لگتے ہیں۔“ وہ یہی کہہ پایا۔ وہاں بچوں کے بچ وہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کا یہ عمل دیکھ کو کس قدر تکلیف پہنچائے گا۔ اس کا سویا ہوا احساس کمتری بڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

”پلیز دیا! رونا نہیں۔ تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔“ اب اسعد کا ہاتھ اس کے بالوں میں تھا۔

”میں رو تو نہیں رہی سعدی!“

ہاں کچھ آنسو نظر نہیں آتے وہ محض دل پر گرتے ہیں، برستے ہیں اور برستے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود دل اور زیادہ اور زیادہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔

”میں تو صرف خدا سے شکوہ کر رہی تھی۔“ وہ پھر بولی۔

”سب عورتوں کے قدموں تلے جنت رکھ دی ایک سوائے میرے۔ ایک کو نا مجھے بھی دے دیتا تو کیا کی ہوتی اس کے خزانے میں۔“

”سب کچھ بھول جاؤ دیا! صرف یہ یاد رکھو کہ ایک تم ہو اور ایک میں..... اور ہمیں کسی تیسرے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بہت نرمی سے کہہ رہا تھا جبکہ وہ سوچ رہی تھی۔

”نہیں سعدی! ضرورت تو ہے۔ ایک ننھے وجود کی جو ہماری محبت کا جیتا جاگتا منہ بولتا ثبوت ہو۔“

ایک بار پھر ویسی ہی صبح دھرتی پر اترتی تھی۔ ویسی ہی سورج کی مست انگڑائیاں، ویسی ہی کرنوں کی اٹھیلیاں۔ پہلے تو وہ سستی سے کبل میں ہی بیٹھی رہی پھر سیاہ گرم شال اپنے گرد لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلاس وینڈو سے چمن چمن کر آتی سورج کی بیٹیاں اپنی کامیابی پر خوش ہو رہی تھیں۔ اس نے پردہ سر کا کر باہر جھانکا۔ کھڑکی کے سامنے بھی صاف ستھری سڑک پر صبح، اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ ایسا وہ تھی۔ اس نے پردے برابر کیے۔ اندر رہ جانے والی کرنیں خاموشی میں تحلیل ہو گئیں۔ اسعد جم خانہ سے آنے والا تھا۔ وہ ہاتھوں سے بال سنوارتی ٹیرس پر آگئی۔ وہ گرل پر جھکی لان میں جھانک رہی تھی جہاں بوڑھا مایا بابا بڑی شفقت سے تیل بوٹے سیراب کر رہا تھا۔ اس کے پکارنے پر سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگا پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے پیار دیا جسے قبول کرتے ہوئے وہ مسکرا دی۔

”بابا! اماں وزیراں آگئی؟“ وہ کام والی ماسی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ بابا نے اثبات میں سر بلایا تو وہ زینہ طے کر کے لاؤنج میں آ گئی، جہاں دائرے کی صورت میں پڑے بیش قیمت صوفوں کے قریب وہ بیٹھی تھی۔ اماں وزیراں کی بیٹی۔ مہرا النساء۔

”اماں وزیراں نہیں آئی؟“ اس نے مہرا النساء سے پوچھا تھا۔

”اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے اس نے آج ہمیں بھیجا ہے۔“ جواب مہرا النساء کے ساتھ کھڑی عورت کی طرف سے آیا تھا۔

”تم؟“ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم وزیراں کی کون ہو؟“

مہرا النساء نے جواب دیا۔ ”یہ ہماری سب سے بڑی بہن ہے۔“

دیکھ کو نہی آگئی کیونکہ اس نے سب سے بڑی پر زور دیا تھا۔

”ہاں اس کی شکل وزیراں سے بہت ملتی ہے۔“ اس نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنے دوپٹے سے فرنچیز کی گرد صاف کرنی شروع کر دی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس کی مخاطب وہ تھی اور نظریں مہرا النساء پر تھیں جو ہمیشہ کی طرح سائیز نیبل کے قریب دوڑاؤ بیٹھ گئی تھی اور گرد صاف کرتے ہوئے بہت اشتیاق سے نیبل پر بچے کرٹل پیسز کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شوق کا ایک جہان آباد تھا۔

”زہرہ۔“ مختصر سوالات عام طور سے مختصر جوابات کے ہی حامل ہوتے ہیں۔

مہرا النساء نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بہت احتیاط سے ہر چیز کو چھو رہی تھی۔ سولہ سترہ سال کی یہ لڑکی ہمیشہ اسے اثریکٹ کرتی تھی جس کے ہونٹ زندہ دلی سے مسکراتے تھے اور معصومیت آنکھوں میں تخت نشین تھی۔ دیکھنے پر بونہی پکار لیا۔ وہ جو منہک تھی گھبرا گئی اور ہاتھ سمجھ لیا۔

”جہیں یہ پسند ہیں؟“ دیکھنے سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا مگر اس کے باوجود مہرا النساء خاموش رہی۔ چہرہ ابھی بھی گھبراہٹ کے زیر اثر تھا لیکن آنکھوں میں معصومیت اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے مہرا النساء ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہیں وہ تم رکھ لو۔“ اثبات تحریر میں بدل گیا۔

”سچ؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ دیکھنے سے سر ہلایا تو وہ خوشی خوشی سلیکشن کرنے لگی۔ تبھی زہرہ کی سرزنش بھری آواز نے اسے ٹوک دیا۔ دیکھ کو اس کی مداخلت ناگوار گزری تھی۔

”میں تمہیں تو نہیں دے رہی زہرہ۔“ اس نے کچھ نرمی سے کہا تھا۔ اس کے باوجود طنز یہ مسکراہٹ نے زہرہ کے چہرے کا احاطہ کرنے میں لمحہ ہی لیا تھا۔

”مجھے دو یا اسے بات تو ایک ہی ہے نانی بی! اسے نہ ہی دو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی غریب کو بغیر محنت کے مل جائے تو وہ گندم کی ڈھیری کی طرح پھیل جاتا ہے اور ندیدی نظروں سے ہر چیز کو کھتا ہے پھر تم امیر لوگ ہی بذحرا می کا طعنہ دیتے ہو۔“

”تم اتنا تلخ کیوں بول رہی ہو۔“ دیکھنے سے حیرت سے اسے دیکھا۔ بات اتنی سخت تو نہ تھی۔ اس کے باوجود زہرہ کے لفظ لفظ میں کسی کا سیال تھا اور اب تبسم میں بھی۔

”یہ تلخ تو نہیں ہے۔ یہ سچ ہے جی اور تم امیر لوگ سچائی کو تلخی کا نام دیتے ہو۔ زندگی ہم غریبوں میں سچائی بھر دیتی ہے یعنی سچی۔“

دیکھ اسے دیکھ گئی تھی جس کے دھنسنے ہوئے بپوٹے اور گردن کے قریب جا بجا جھریوں کا جال، پکی عمر کا پہاڑہ پڑھ رہا تھا اور آنکھوں میں جہاندیدگی کی پیشہ دارانہ عورت کی طرح ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔

”تم شادی شدہ ہو؟“ سینٹرل نیبل سے اخبار اٹھاتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا اور مہرا النساء کو مسکرا کر فہمہ دی تھی۔

”ہاں اماں نے میری شادی کی تھی۔“

”تھی.....؟ کیا مطلب؟“

”دو روز پہلے طلاق ہو گئی۔“ زہرہ نے یوں بتایا تھا گویا اسے نہیں کسی اور کو طلاق ہوئی ہو۔ دیکھ کو جھٹکا سا لگا۔

”پھر تو تم عدت سے ہو نہیں زہرہ؟“

”نہ..... مجھے کوئی غم نہیں ہے۔“ وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے عدت کا تعلق غم ہی سے ہو۔ اطمینان قابل دید تھا۔ دیکھ نے ایک گہرا سانس بھرا اور نظریں اخبار پر ہیڈ لائن پر نکا دیں۔ اسے زہرہ کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا تھا۔

”بچے کتنے ہیں تمہارے؟“

”نا بھلا بچہ ہوتا تو وہ حرامی طلاق دیتا ہی کیوں۔ بچے کے لیے ہی تو اس نے دوسری شادی کی ہے۔“
دیجے کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”بب..... بچہ نہیں ہوا زہرہ؟“ جانے وہ کیا سننا چاہ رہی تھی۔

”رب ہی جانے۔“ زہرہ نے ایک طویل سرد آہ بھری۔

”میں گئی تھی ڈاکٹرنی کے پاس۔ وہ کہنے لگی جب رب کی مرضی ہوگی بچہ ہو جائے گا۔ پورے آٹھ سال تک میں ڈاکٹرنی کے پاس جاتی رہی۔ دم در وہ بھی کرائے۔ اس کینے کی مار بھی کھائی۔ ساس کے طعنے الگ اور سرسری گالیاں الگ۔ نندوں کے پیر دھو دھو کر پیئے اور تو اور دیور اور دیورانی کی بھی خد میں کیں۔ پر ہک ہاہ..... عورت کی قسمت ہی ایسی ہے بچہ نہ ہو تو مرد دوسری لاتا ہی ہے چاہے چمپا کر لائے یا کھلم کھلا.....“

”سب مرد ایک سے تو نہیں ہوتے نا۔“ اسے خود بھی خبر نہ تھی کہ اس کا فقرہ تا نید طلب ہے یا تردید طلب۔ بس دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

”نہ جی سب مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ مرضی کرنے پہ آئیں تو نہ عورت روک سکتی ہے اور نہ اولاد..... میں نے اب تک دو مرد دیکھے ہیں جی۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ مہر النساء شاید لان کی طرف چلی گئی تھی۔

”میرے ابا کو پتر کی زنجیر چاہیے تھی جو اس کے بڑھاپے میں اس کا سہارا بن سکے اور جب میری ماں پتر نہ پیدا کر سکی تو بڑھاپے میں میری ماں کی گود میں سات بیٹیاں ڈال کر دوسری شادی کر لی اور جب دوسری کے بھی پتر نہ ہوا تو ایک سال کے اندر اندر تیسری بیوی لے آیا۔ دونوں کو ڈالامیری ماں کے سر پر اور خود بڑی کی لت لگا بیٹھا۔ میری ماں نے تو گزراہ کر لیا تھا جی! پر ان دونوں سے نہ ہوا۔ ایک نے طلاق لے لی اور ایک بھاگ گئی۔ دوسرا مرد اکبر تھا، میرا میاں۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر اس کا مغز سڑ گیا تھا۔ خود کو ہیرو سمجھتا تھا۔ اسے بھی پتر چاہیے تھا اور میں تو بیٹی بھی نہ دے سکی۔“

دیجے نے زہرہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور نظریں گود میں رکھے اپنے لرزتے ہاتھوں پر مرکوز کر دی تھیں۔ زہرہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی دیجے مفہوم نہ سمجھ سکی۔

”تو کیا اسعد بھی.....؟“

زہن کے دالان میں بس ایک ہی سوال کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

”نہیں، نہیں اسعد ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے پر زور تردید کی تھی۔

”جی۔“ زہرہ نے جرات کی کہہ تھا۔ دیجے شاید بے اختیار ہی میں کچھ زیادہ ہی اونچا بول گئی تھی۔
”ہاں..... لک..... کچھ نہیں تم اپنا کام کرو۔“ وہ ست روی سے چلتی واپس ٹیس پر آ گئی۔ دھوپ کی

تمازت میں شدت آ چکی تھی جو بلاشبہ بدن کو پھلی لگ رہی تھی۔ اس کا دماغ سوال کر رہا تھا جبکہ دل انکاری تھا تب اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

”نہیں اسعدی ایسا کچھ نہیں کرے گا..... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔“

نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے نظر کا پیچھی گرل سے نظر آتی سڑک کے اوپر پھڑ پھڑانے لگا۔
ہاں وہ اسعد تھا اور ایک بچہ..... دو، تین سال کا..... کچھ فاصلے پر کھڑی کار کا فرنٹ ڈور وا تھا اور اسعد مسکراتے ہوئے بچے کے سامنے دوڑا تو بیٹھا اس کے گلے جھاڑ رہا تھا۔

دیجے نے کھوجنا چاہا کیا تھا اس کے چہرے پر۔

حسرت..... یاس، ناامیدی، نارسائی، تڑپ، محبت یا کچھ بھی نہیں؟ وہ چیخنا چاہتی تھی اور چیخ نہیں پا رہی تھی۔ سانس تھمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ زہرہ کی آواز اسے لرز رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے گرل کو تھام لیا سر زمین ذات زلزلے سے دوچار تھی اور اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ جوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تسخراڑاتے قہقہے پھیل رہے تھے۔ اس نے پیشانی پر نمودار ہو جانے والی چند بوندوں کو پونچھا۔ ایک نگاہ اسعد پر ڈالی جو ابھی بھی بچے سے ہلکا م تھا۔ وہ مڑی اور مضبوط قدموں سے چلتی لاؤنچ میں آ گئی۔ سامنے ہی مہر النساء بڑے سے پنجرے میں موجود آئینہ سر بلین پیروئس کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دائیں جانب زہرہ صوفوں کی گرد جھاڑتی جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔

”زہرہ۔“ اس کے پکارنے پر وہ متوجہ ہوئی ساتھ ہی مہر النساء بھی۔

”میں تمہارے گھر آنا چاہتی ہوں زہرہ..... مجھے پتا سمجھا دو۔“

وہ بہت مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ سے قسمت کی دھنی رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ قسمت اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ جو پتھر اپنی راہ میں رکھنے والی ہے اس سے ٹھوکر نہیں کھائے گی بلکہ اس سے پہلے ہی اسے ہٹا دے گی۔

وہ اندرون لاہور کی ایک تنگ و تاریک گلی تھی جس کے آغاز سے اختتام کا نقطہ دیکھنا بے حد مشکل تھا۔ بلیک شیراڈ نے آگے جانے سے انکار کیا تو وہ اسے ایک طرف پارک کر کے گلی میں ٹھس گئی۔ کھلے ہوئے کٹروں کا گندابہ بودار پانی گلی میں جا بجا پھیلا ہوا تھا جس کی بدولت اسے چلنے اور سانس لینے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ بہر حال اسے یہ رستہ طے کرنا ہی تھا کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں جو مشکلات اس کے سامنے آئیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہو سکتی تھیں۔

اس نے رک کر ایک آدمی سے اماں و زبیراں کے گھر کا پتہ معلوم کرنا چاہا۔ وہ شخص یہاں موجود بیشتر لوگوں سے قدرے بہتر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں تھامے اسے بغور دیکھتا رہا پھر پر سوچ انداز میں سر اٹھا کر پیلے پیلے دانٹوں کی نمائش کی اور ”آئیں جی میں آپ کو لے چلتا ہوں۔“ کہہ کر اس

کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دیچہ کی مجبوری اسے اس کا ساتھ دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ بندہ بولنے کا شائق تھا یا محض اس کے سامنے بولے ہی جا رہا تھا دیچہ کچھ نہ سکی۔ وہ تو بس کھیلنے کودتے، گند میں تلھڑے تنگ دھڑنگ بچوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں دیکھتے ہوئے اسے سخت کراہیت ہو رہی تھی اور اس نے ناک چڑھا رکھی تھی۔ یہ شاید فرار کی ایک راہ بھی تھی کیونکہ چار پائیوں پر اور چوتروں پر بیٹھی عورتیں اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں دیچہ کو تنگ کر رہی تھیں۔ بالا خروہ ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ دیچہ کو تھلید کرنا پڑی۔

”آئیں جی اندر ہی آ جائیں اپنا ہی گھر ہے۔“ وہ بہت پر جوش ہو رہا تھا۔ دیچہ ”اپنا ہی گھر“ پر ناک سیکڑ کر رہ گئی۔ وہ شخص کسی کو آواز بلند آوازیں دے رہا تھا پھر ایک لڑکی آئی تو وہ شخص بولا۔

”جانی اماں کو بلا لا۔ یہ بی بی ملنے آئی ہے اس سے۔“ وہ لڑکی چلی گئی تو وہ شخص ایک چھلنگا سی چار پائی پر بیٹھی سی چار پائی بچھا کر اسے بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ دیچہ الجھن زدہ سی بیٹھ گئی تو وہ اپنا بایو ڈیٹا سمجھانے لگا۔ وہ اماں وزیراں کا داماد تھا اور دیچہ کو اس سے زیادہ جاننے کی تمنا نہ تھی۔ اس نے شکر کیا جب اماں وزیراں آ گئی کیونکہ اس کی آمد نے ”داماد ناے“ میں خلل ڈال دیا تھا۔ وزیراں اس کے سامنے ہنسی جا رہی تھی۔

”میں تمہارے پاس ایک کام سے آئی تھی وزیراں۔“ دیچہ نے تہید باندھی تھی۔

+

وہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں آئی تھی۔ دائیں جانب ڈرائنگ روم کے ساتھ چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر اسٹڈی کی لائٹ ابھی بھی روشن تھی۔ وہ تخیل کی آنکھ سے اسد کو دیکھنے لگی جو کسی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اندر جائے یا نہیں۔

اسی پل تنگی دل کے کسی کو نے میں کر لانے لگی اور نارسائی نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے نوحہ خوانی شروع کی تو اس نے دل کڑا کر کے اور حسرت کا ہاتھ جھٹک کر اسٹڈی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ صحرا خریدنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس کے لیے اسے ایک برسات تو کیا اپنے سارے سادوں بھادوں وقتی طور پر رہن رکھتے تھے اور یہی بات جب اس نے اماں وزیراں سے کہی تھی تو وہ ایک لمحے کے لیے اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی اور جب بولی تو غصہ اور سختی اس کے انداز سے عیاں تھی۔

”نہم غریب ضرور ہیں بی بی! مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹیاں فروخت کرتے پھریں۔“

وہ دہلی دہلی آواز میں بول رہی تھی اور دیچہ کو پہلی بار اس بے ضروری عورت سے خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے اندر بولنے کی سکت نہیں پاری تھی لیکن اسے یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا لہذا بولی۔

”میری بات کا غلط مطلب مت نکالو وزیراں! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو اور سمجھو۔ ضرورت

مندم بھی ہو اور میں بھی۔ خدا نے مجھے ماں بننے نہیں دیا مگر ماما کا جذبہ تو ہر عورت میں ہوتا ہے نا۔ سو مجھ میں بھی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو وزیراں! مجھے بچہ چاہیے اور تمہیں چھ بیٹیوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ زہرہ کی طلاق کے بعد تو تمہارا بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔“ وہ اضطراری انداز میں ہاتھ مسل رہی تھی۔ ”تم اپنی ایک بیٹی مجھے دے دو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں جیسے ہی وہ میری گود میں بچہ ڈالے گی میں اسے واپس تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔“

”اس میں بھلا ہمارا کیا فیدا (فائدہ) بیٹی تو پھر ہمارے ہی در پر ہوگی۔“

”اس کی شادی کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گی۔ تم دیکھنا میں..... میں اس کی شادی بہت اچھی جگہ کروادوں گی۔“ اس کا انداز ناچا جتے ہوئے بھی ملتچی ہو چلا تھا وزیراں کچھ لمحے خاموش رہی۔ دیچہ کو اس کے جھریوں زدہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں پھر دفعہ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”نہیں بی بی ازہرہ کا ابا نہیں مانے گا۔“

”زہرہ کے ابا نے اب تک تمہیں کیا دیا ہے۔ سوائے سات بیٹیوں کے جو بیٹے کی چاہ میں دوسری اور پھر تیسری شادی کر سکتا ہے اسے بیٹیوں کی کیا پرواہ۔ جو خود کما نہیں سکتا وہ انکار کیسے اور کیونکر کرے گا۔“ وہ ایک لمحے کو وزیراں کے تاثرات جاننے کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔

”اس کے علاوہ؟“

”اس کے علاوہ میں تمہیں دوا لاکھ روپے دوں گی تم ایک تو کیا دو لڑکیوں کی شادی بھی آرام سے کر سکو گی۔“

وزیراں کی حیرت سے کھلی آنکھیں خوشی سے کچھ اور کھل گئیں۔ دولت کی چمک عزت، غیرت معاشرہ، ہراساں پر حاوی ہو چکی تھی۔

”لیکن کونسی بیٹی؟“ اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر اس نے اپنی تمام بیٹیاں گویا ایک قطار میں دیچہ کے سامنے پیش کر دی تھیں۔

”مہر النساء۔“ دیچہ نے بڑے آرام سے پانچویں بیٹی کا نام لے دیا تھا وہ قائل کرنے کا طریقہ جانتی تھی اور یوں بھی قسمت کی گیندنی الحال اسی کے کورٹ میں تھی۔

+

کھٹکے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اندر آنے والی دیچہ ہے۔ اس کی پیاری سی بیوی جس سے وہ محبت نہیں عشق کرتا ہے۔ بڑے جاندار انداز میں مسکراتے ہوئے کہنی چیر کر بیک پر نکا کر ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیا تھا۔ دیچہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس تک آئی تھی اور اس کا ہاتھ

تمام کر سامنے آگئی تھی۔ کمر کو تھوڑا سا خم دے کر ٹیبل کے ساتھ کھٹکتے ہوئے بولی۔
 ”اتنا کام مت کیا کرو سعدی..... تھک جاؤ گے۔“ اس نے اسعد کے گلہ ساز اتار کر میز پر رکھ دیے
 تھے۔ محبتوں سے گھلا لہجہ جس میں فکر کا عنصر غالب تھا اسعد کے اندر تک طمانیت اتار گیا۔
 ”ٹھیک ہے اب نہیں کروں گا اور تھکوں گا بھی نہیں۔“ جیڑ کی بیک سے پشت نکاتے ہوئے وہ بڑی
 فرصت سے اسے نکتے لگا تھا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“ یہ غالباً دل کا چور تھا تبھی اسے اسعد کی محبت لاثانی نگاہیں خود کو کھوجتی
 ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
 ”کچھ بھی تو نہیں۔“
 ”پھر؟“

”پھر یہ کہ میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں جو تم مجھ سے کہنا چاہتی ہو۔“ وہ واقعی کھوج رہا تھا اور دیکھ کو
 یقین تھا کہ اسعد اس کی بے چینی بھانپ لے گا۔ وہ ایسا ہی تھا باہر رہتے ہوئے بھی اندر سے واقف۔ دیکھ
 نے بس پلکیں جھکا لیں۔
 ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے سعدی۔“ وہ لفظ چننے کے مراحل طے کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں لفظ
 فقروں میں ڈھل ہی نہیں رہے تھے۔ اسعد کچھ ٹاپنے اسے تکتا رہا پھر کرسی کے ہینڈل پر دونوں ہتھیلیوں سے
 دباؤ ڈال کر اٹھنا چاہا۔

”ٹھیک ہے پھر سو جاتے ہیں۔“

”نہیں سعدی۔“ بے اختیار دیکھنے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے تھے وہ بیٹھ گیا۔

”ایک بات ہے..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں سعدی۔“

استفہام نگاہوں کا پہرہ دار تھا گویا کہہ رہا ہو ”اب کہہ بھی چکو۔“ دیکھ اس کے قدموں میں کسی داسی کی
 طرح بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر سعدی کے گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔

”سعدی تم میری ایک بات مانو گے؟“

”اس سے قبل تمہاری وہ کوئی بات ہے جو میں نے نہ مانی ہو یا ٹال دی ہو؟“ اسعد کا ہاتھ اس کے
 بالوں میں تھا۔

”نہیں تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری بات ضرور مانو گے۔“ اس نے ایک دم سر پر رکھا ہاتھ تمام لیا
 تھا۔

”ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بات ضرور مانوں گا۔“

”تم..... سعدی تم شادی کر لو۔“

اسعد کے ہاتھ کی گرفت ایک لحظہ کمزور پڑ گئی تھی۔ دوسرے بل وہ دیکھ کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”مجھے لگتا ہے دیکھ! تم نیند میں ہو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔“ اس نے حکم دیا تھا سخت لہجے میں۔ دیکھ کو
 وحشت سی ہوئی، اپنے دل کی دھڑکنوں سے۔ اسعد ریک کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے آگئی۔
 ”نہیں سعدی! میں نیند میں قطعاً نہیں ہوں بلکہ میں پورے ہوش و حواس میں تمہیں اجازت دے رہی
 ہوں۔“

”مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے دیکھ!“ وہ دھاڑا تھا۔ دیکھ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور
 ریک سے جا گئی۔

”تم کیا سمجھتی ہو میں تمہاری اجازت کا منتظر ہوں کہ ادھر تم اشارہ کرو اور میں شادی کرنے چل
 دوں..... نہیں دیکھ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ شادی کرنی ہوتی تو میں تب ہی کر لیتا جب ڈاکٹر نے تمہارے
 ہاتھ پن کی خبر دی تھی۔“ اسعد ایک بار پھر رخ موڑ گیا تو وہ پھر سامنے آگئی۔

”پلیز سعدی..... پلیز ٹرائے ٹوائڈ اسٹینڈی..... میں خود تمہاری شادی کرواؤں گی۔“

اسعد نے اسے بازو سے پکڑ کر دکھانے والے انداز میں ہٹایا تھا۔ وہ لڑکھڑا گئی تب تک اسعد دھڑ
 سے دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ دیکھ کو کچھ میں نہیں آیا کہ اس کے پیچھے جانے یا نہیں۔ اسعد کا رویہ اس کی
 توقع کے عین مطابق تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ اسے معلوم تھا اسعد مان جائے گا۔ اسے ماننا ہی
 پڑے گا۔ شاید گھنٹہ بھر وہ اسٹڈی میں بیٹھی رہی پھر بیڈ روم میں آگئی جہاں اسعد کروٹ لیے سو رہا تھا یا محض
 پوز کر رہا تھا۔ وہ بیڈ کے کونے پر تک کر سونے کی سعی کرنے لگی۔

جانے کب اس کی آنکھ لگی تھی اور پھر کھل بھی گئی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں ساڑھے سات پر ٹپکی تھیں۔
 انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے اس نے دیکھ کو دیکھا جو دوسری طرف رخ کیے سو رہی تھی۔

”میرا سکون برباد کر کے کس سکون سے سو رہی ہے بیوقوف۔“ غصے کے بادل چھٹنے لگے اور تاسف کی
 ہوا اٹھانے لگی۔ کہنی کا سہارا لے کر وہ اس کی طرف جھکا اور بڑی نرمی سے چہرے پر کھمبے مشک بار بال
 سمیٹنے لگا۔ وہ ابھی بھی بے خبر تھی۔ اسعد کے ہونٹ اس کی کپٹلی کو چھو آئے۔ اسعد نے دیکھ کا ہاتھ تمام لیا جو
 ٹیکے پر چہرے کے قریب پڑا تھا وہ انگوٹھے سے پھیلی پر سچے بتائے گوشوں کر رہا تھا جو کچھ روز قبل مہندی سے
 اس نے اپنے ہاتھ پر سجایا تھا۔ ہونٹوں نے پھیلی تک کا سفر نہایت اطمینان سے طے کیا تھا۔

دیکھ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیرت سے خود پر جھٹکے اسعد کو تک رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور اذیت
 ناک رت جیکے کا خمار دوحوں میں حلول ہو گیا۔

”تم میری ذات کی تحمیل ہو دیا! میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے میرا امتحان مت
 لو۔“ روح کی سچائیاں لہجے میں سمٹ آئی تھیں۔ ہونٹوں نے ایک بار پھر پھیلی کو چھوا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھ

نے کروٹ لی اور ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکادیں۔

”کیسی عجیب محبت ہے ہاتھ ہاری۔ ایک چھوٹے سے امتحان سے گھبرا گئی۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ اسعد نے اسے تاسف سے دیکھا۔

”امتحان چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ بس امتحان ہوتا ہے۔“ وہ باہر نکل گیا تھا۔

اب وہ دونوں اپنے اپنے انداز میں ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ اسعد نے سوچا احتجاجاً ناشائستگی کرے گا۔ دوسری طرف دیجہ بیگم نے ناشتے کے نام پر کافی بھی تیار نہ کی تھی۔ اسعد کو افسوس نے گھیر لیا۔ یہی لڑکی اس کے کھانے پینے کا کس قدر دھیان رکھتی تھی اور آج..... محض آج وہ اسے آفس سے واپسی پر پورچ میں بھی لینے نہ آئی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اگر کچھ کھانا چٹا ہوا تھا مگر وہ خود موجود نہ تھی۔ اس نے غصے سے ٹیبل کو دیکھا، بازو پر پڑا کوٹ اور بریف کیس صوفے پر اچھالا اور راستے میں آئے کارزن ٹیبل کو ٹھوکر مارا تاہم نکل گیا۔ کھٹکے کی آواز اور پھر کار اشارت ہونے کی آواز نے دیجہ کو بیڈ روم سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کارزن ٹیبل پر رکھا کر نسل کا نفیس سا گلہان اور شیشہ دیوار سے ٹکرانے کی بنا پر چٹنا چور ہو چکے تھے۔

وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی کر رہی تھیں۔

”پتا نہیں اس نے کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں؟“

اس رات وہ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ہی واپس آیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھوں کو چند ہیادیا تھا وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اسعد بڑی اجنبیت سے اس کے قریب سے گزر کر اندر جا چکا تھا۔ وہ وہیں کھڑی خود سے الجھتی رہی۔ پھر اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ دانش روم کی لائٹ آن تھی اور پانی گرنے کی واضح آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ اسعد سے بات کرنا چاہتی تھی تبھی بیڈ پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری جانب وہ شاید قصد آدیر لگا رہا تھا۔ ذہنی تکان دیجہ کے سارے وجود کا گھیراؤ کیے ہوئے تھی۔ نیند کی وادی میں اترنے میں اسے پل ہی لگے حالانکہ آکھ کی یہ بیوفائی اسے سخت ناگوار گزرتی تھی۔

اسعد نے چپ سا دھڑکھتی تھی جو ہفتوں پر محیط ہو چکی تھی۔ وہ نہ دیجہ کو مخاطب کرتا تھا اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب دیتا تھا۔ دیجہ کو اس سے اتنے سخت رویے کی توقع قطعاً نہ تھی اسعد کا رویہ اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ اس کی ناراضی کی مدت کبھی بھی اتنی طویل نہ ہوئی تھی۔ وہ رات کو بہت دیر سے آنے لگا تھا دیجہ کے لیے دن تو کٹھن تھے ہی سردی کی طویل راتیں کچھ اور طویل ہو گئیں۔ حد تو تب ہوئی جب گھڑی کی سوئیاں دو اور تین کا فکر بھی کر اس کرنے لگیں۔

+

وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اسے نکلے گئی تھی اور جب ضبط کا پارا نہ رہا تو اس کے کشادہ سینے سے سر نکلا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”میرے ساتھ یوں مت کرو اسعد! بس مر جاؤ گی مگر تمہاری بے اعتنائی کے ساتھ زندہ رہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ پلیز میرے ساتھ یوں مت کرو۔“

وہ ٹوٹی پھوٹی سی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور اسعد کی نگاہیں اس کے ریشمی بالوں پر تھیں۔ کیسی دیوانگی تھی جو اسے اس حال تک لے آئی تھی۔ اسعد نے اس کے گرد اپنا حصار کھینچ کر گویا اسے تحفظ کا احساس دیا تھا۔ دیجہ کے آنسو ہمیشہ اسے تکلیف دیتے تھے اب بھی ایسا ہی ہوا۔ دیجہ اس بات سے بخوبی واقف تھی۔ اس لمحے وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔ اسعد کا مال بڑھنے لگا۔ اسے تنگ کر کے وہ خود بھی کہاں پر سکون رہ سکا تھا۔ کتنی ہی راتیں سڑکین ناچتے، بستر کے کانٹے چٹنے گزری تھیں۔ اس نے دیجہ کے گرد اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کر لی پھر بہت دھیمی اور نرم آواز میں بولا۔

”اور جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو کیا وہ درست ہے دیا؟“ اس کی آواز دانداز میں چاہت کی شدت میں تھیں۔ دیجہ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

”میں کچھ غلط تو نہیں کر رہی سعدی۔ کیا اپنی مانتا کو تسکین پہنچانے کا انتظام کرنا غلط ہے؟“

”دیا! بیٹیم خانے بھرے پڑے ہیں۔ ایسے بچوں سے جو مانتا کے پیاسے ہیں ہم کوئی بچہ ایڈاپٹ بھی تو کر سکتے ہیں۔“ وہ اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیجہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

”مجھے ایڈاپٹ چاہئے۔ بچہ ایڈاپٹ ہی کرنا ہوتا تو میں بھی کر لیتی جب ڈاکٹر نے مجھے بانجھ قرار دیا تھا۔“ کسی گزری بات کا حوالہ زبان کی نوک پر پھسلا تھا۔

”لیکن میں کسی معجزے کی منتظر تھی اسعد! لوگ کہتے ہیں معجزے اسی دنیا میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

میں بھی انتظار کرتی رہی کہ شاید خدا کو مجھ پر ترس آ جائے اور وہ میری گود بھر دے لیکن معجزہ نہیں ہوا۔ مجھ پر آ کر تمام معجزے ختم ہو گئے۔ میں نے سنا تھا دعائیں تقدیریں بدل دیا کرتی ہیں لیکن میری تو دعائیں بھی تجبی دامان ہی رہیں۔“ وہ رونے جاری تھی برسات کا درود یک لخت ہوا تھا۔

”میں کیا کروں سعدی! میں اپنے من کو نہیں مار سکتی۔ گود لیا ہوا بچہ مانتا کی پیاس تو بجھا سکتا ہے لیکن دل کی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ یوں بھی کسی کے گناہ کو میں اپنی اولاد نہیں کہہ سکتی۔“ ہاتھ کی پشت سے گال رگڑتے ہوئے وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”مجھے تم سے اس قدر ادھر سوچ کی توقع نہیں تھی دیا!“ دکھ نے اس کی آواز کو دھیمہ کر دیا تھا۔

”یہ ادھر سوچ نہیں ہے۔ یہ میری محبت ہے جو مجھے سکون نہیں لینے دیتی۔ میں..... میں تمہارے

بچوں سے کھیلنا چاہتی ہوں سعدی! جس کی رگوں میں تمہارا خون ہو سکی اور کانٹیں نہ میں چاہتی ہوں جب وہ میری بانہوں میں ہو تو اس سے تمہاری مہک آئے۔ اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کی ناک اور گل سب..... سب کچھ تمہارا پرتو ہو۔ میں جب اسے دیکھوں تو مجھے تم نظر آؤ کوئی اور نہیں۔“ دیکھ کر آنکھوں میں اب آنسو نہ تھے بلکہ عجیب سی چمک تھی۔ اسعد خاموش رہا۔ اب کہنے کے لیے اس کے لفظوں کی صندوقچی خالی ہو گئی تھی۔ کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔ وہ یونہی اسے دیکھ گیا پھر جیسے تھک کر صوفہ کم بیڈ پر گر گیا۔

”تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟“ دیکھنے بے یقینی ہے اسے دیکھا پھر قدموں میں بیٹھ کر اول تا آخر ساری بات گوش گزار کر دی۔ اسعد ابھی بھی خاموش تھا لیکن لبوں پر طعنے مسکان تھی۔

”گویا ایک نہیں دو دو زندہ گیوں کا سودا کیا ہے تم نے۔“ انداز خود کلامی کا سا تھا پھر اسے مخاطب کر کے بولا۔

”وہی تم نے سوچا ہے اگر مہر النساء بھی ماں نہ بن سکی تو کیا تم تیسری شادی کرنے کے لیے کہو گی مجھے؟“ پن انگلیوں کے بیچ کھاتے ہوئے وہ یقیناً طنز کر رہا تھا۔

دیکھ کر نگاہوں میں سر اسیمگی سمٹ آئی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس نے اس سچ پر بالکل نہیں سوچا تھا۔

”مجھے ڈراؤ مت سعدی! اور ہم اندھیرے پہلو ہی کیوں دیکھیں، روشن پہلو بھی تو ہیں۔“ اس کا لہجہ سرسرا ہوا تھا تیز ہوا کے خوف سے کانپتے پتے جیسا۔ اسعد کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے دیکھ! میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ خوف، بے یقینی میں بدل گیا پھر خوشی میں۔

”تم سچ کہہ رہے ہو سعدی؟“

”سو فیصد لیکن اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ دار محض تم ہو گی دیکھ..... تم اپنے پاؤں پر خود کلباڑی مار رہی ہو بعد میں تکلیف ہو تو مجھ سے شکایت مت کرنا۔“

وہ بخند تھا اور آنے والے دنوں کی تباہ کاریوں کا حوالہ دے کر اسے ڈرانا چاہتا تھا۔ دیکھ خوش تھی جس کے آگے اسعد کی تنبیہ دب کر رہ گئی تھی۔

+

وہ مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا نہ جانے کیوں؟

اور رات کے اس پہر جب کہ سارا عالم کنبوں میں دبکا ہوا تھا وہ گرل پر کہنیاں نکائے دیو قامت درختوں کے پیچھے سر ابھارتے زرد چاند کو تک رہا تھا۔ یہ کوئی مناسب وقت تو نہ تھا چاند کو نکلنے کا اور وہ کچھ ایسا رو میٹک مانند ڈبھی نہ تھا کہ چاند کو نکلنے سے کوئی دلی آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ بس دیکھ کو چاند پسند تھا اور وہ

دیکھ کر کوئی بات نہیں مانتا تھا۔ سو اس کے ساتھ کھینچا ہوا آتا اور دو دھیا روشنی میں بیٹھ جاتا۔ ایسے میں دیکھ اس چاند کو کھانکرتی جس کا ایک عالم دیوانہ تھا اور وہ اس کا ہاتھ تھامے اس چاند کو کھینکتا جس کا وہ دیوانہ تھا۔ ہوا کے رتھ پر سوار ہو کر مخصوص خوشبو اس تک پہنچی تھی۔ نرم قدموں کی ہلکی سی دھمک جو اس کے لیے کسی مدھر دھن سے کم نہ تھی۔ زرد چاندنی میں ایک اور چاندنی۔

اس کی چوڑی پشت پر نظریں نکالے وہ کوئی مناسب لفظ ڈھونڈ رہی تھی جو اس کے کیے کا مداوا کر دیں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ مداوا اور ازالہ تو بے معنی ہو چکے تھے۔ اس کے نزدیک جو کچھ ہوا اسے کم و بیش یونہی ہونا تھا آج نہ ہوتا تو کل ہو جاتا لیکن تب اس سب میں اس کی رضا شامل نہ ہوتی اور اس کے مجازی خدا کا کوئی بھی قدم اس کے لیے باعث آزار ہو سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے..... لیکن مجھے لفظ کیوں نہیں مل رہے؟ یہ شرمندگی کیسی ہے؟ میں وہ کیوں نہیں کہہ پا رہی جو کہنا چاہتی ہوں۔“

اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے کی طرف بڑھایا پھر انگلیاں سمیٹ کر واپس کھینچ لیا۔ فی الوقت وہ اپنا کوئی بھی احساس اس کے دامن سے باندھنا نہیں چاہتی تھی۔ جن کی چاہ آپ کے دل کے قریب رہتی ہے۔ جن کی طلب کے پھول دل کے گلستان میں کھلا کرتے ہیں۔ جو آپ کے سنگ سانس کی طرح رہتے ہیں جب انہی لوگوں سے کلام کرنے کے لیے آپ کو لفظ کھونجے پڑیں۔ ڈکستریاں کھگانے کی ضرورت پڑنے لگے تو یہ دور دیویوں کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے جس کے اختتام پر فصیلیں تن جاتی ہیں شاید..... شاید دیوار چین سے بھی زیادہ مضبوط اور بلند و بالا۔ اسے اپنے اور اسعد کے درمیان کوئی قلمزم موجزن نظر آیا تھا جس کی وسعتوں کو ناپنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر پکار لیا۔ پتا نہیں اس نے سنا تھا یا نہیں۔ رخ ہنوز اٹھنے کی زردی جیسے چاند کی طرف تھا۔

دیکھ کر دوسری پکار پر وہ دھیرے سے مڑا اور نظریں اس پر جمادیں۔ سر دوپٹ نظریں جن میں وارفتگی تھی نہ ہی شگفتگی، نہ شرارت اور نہ بے تابی..... آنکھوں کی جوت بجھی ہوئی تھی۔

”اسعد! وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔“ اس کی بے تاثر نگاہوں نے اس پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔ نجانے یہ اظہار تھی، سرزنش یا پیغام۔ اسعد کے دل میں بر جھمی سی اتر گئی۔ وہ اسے جھنجھوڑنا چاہتا تھا اور جھنجھوڑ نہیں پا رہا تھا۔ اسے لفظوں کی مار مارنا چاہ رہا تھا مگر مار نہیں پا رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا اٹھو بیوقوف لڑکی وہ جو اس وقت میرا انتظار کر رہی ہے اور جس کے انتظار کی خبر تم مجھے دینے آئی ہو۔ وہ تمہارا شوہر قسم کھانے آئی ہے جب میں اس کے قریب رہوں گا۔ اس کا ہاتھ تھاموں گا تو کیا تم پر سکون رہے سکونگی۔ جب تمہارے بجائے میرے دم سے اس کا بیڈ روم آباد رہے گا تو کیا تم سو سکونگی۔

”چلو اسعد! ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ مہر و بیچاری تھک جائے گی۔“

”اور میری تھکاوٹ..... اسے کون سمیٹے گا۔“ لفظ پھر سے بے معنی ہو گئے دیکھنے والے نے اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے اور اسعد کو آج پہلی بار اپنا پیوں اس کے ساتھ کھینچے جانا برا لگ رہا تھا۔
 ”اف بیچارہ سو گئی۔“ اسعد نے دیکھا محترمہ بیچاری عجیب و غریب انداز میں کھواست راحت تھی۔
 ”تم اسے چلا لو گے یا میں.....؟“ وہ پوچھ رہی تھی پھر کوئی جواب نہ پا کر خود ہی جگانے لگی۔
 کسمائی اور بڑا کرانٹھ بھی تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے حیرت مترشح تھی۔
 ”مہر النساء..... اسعد۔“ دیکھنے والے غالباً اسے مطلع کیا تھا۔ مہر النساء نے اسے دیکھا تھا اور گڑبڑا کر پیچھے کھسک جانے والے دوپٹے کو کھینچ کر چہرہ چھپا لیا تھا۔ وہ مہر النساء کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھ اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ سائیڈ ٹیبل پر جھکی پھر مڑ کر اس کی طرف آگئی۔ قلمزم کی پر جوش لہریں شاخیں مار رہی تھیں۔
 ”یہ مہر النساء..... کی رونمائی اسے دے دینا۔“ سبز رنگ کا منگلیس کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دیکھنے والے سرگوشی کی تھی۔ آواز اتنی ہی تھی کہ وہ سن سکے۔

”معاذ ہے اس قسم کی چیزوں کے محتاج نہیں ہوتے دیکھ!“ بہت نارل انداز میں کہی گئی بات میں شعلوں کی سی لپک تھی جن کی تپش اپنی روح کے قریب اس نے محسوس کی تھی۔
 ”وہ خوش ہو جائے گی اسعد۔“ اسعد ہنس دیا۔ عجیب طنز یہ ہنسی تھی۔
 ”دلی وابستگی نہ ہونے کے باوجود میں اسے خوشی دل گا لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔“

”کیس تھا تھے ہوئے وہ دروازے کے آگے سے ہٹ گیا تھا گویا اسے جانے کا حکم دیا تھا۔ دیکھنے والے کو ناچا پاتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سب کچھ اس کی منشاء کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اسعد کو کہیں دور لے جائے جہاں ہر النساء کا وجود نہ ہو۔ اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی اس نے اور تیزی سے مڑی تھی۔ بند دروازہ منہ چڑا رہا تھا۔ دھڑکنوں کا ارتعاش بڑھ گیا تھا اور لہروں کا شور کانوں سے قریب تر آ گیا تھا۔ دل نے خواہش کی کہ دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالے اور جب دروازہ کھلے تو اسعد کا ہاتھ تھام کر دوڑ لگادے لیکن اسے ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اسعد نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ اب قلمزم اب اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا وہ دو قدم پیچھے ہٹی پھر مڑی اور بھاگتی ہوئی زینہ طے کر گئی۔

خاموشی بیزروم کے کسی کونے سے نکل کر سارے میں بکھر گئی۔ اس سمیت، کمرہ بھی ادھورا، نامکمل سا لگ رہا تھا۔ وہ دیر دیر چلتی کھڑکی کے قریب رکھی ایزی چیئر تک آئی جس کی بیک پر اسعد کی ٹائی پڑی تھی۔ اس نے ٹائی اٹھا کر گال سے لگالی پھر اسے بازوؤں میں بھینچ کر کرسی پر ڈھکی گئی۔ ایک دردناک جھجکاؤ کی دیواروں سے سر ٹکرا کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے بازو پر رکھی ٹائی ہونٹوں سے لگائی۔ سارے کمرے میں اور کمرے کی ایک ایک شے میں اس کی مہک تھی مگر وہ نہ تھا۔ درد آنسوؤں کی صورت بڑی فرصت سے اس

کی کپٹی پر لکیریں چھوڑنے لگا اور ہر نئی لکیر کے ساتھ ماضی کا ایک ایک ورق پلٹا جانے لگا۔
 جب اسعد اس سے پہلی بار ملا تھا وہ ایم بی اے کے فائل میں تھا اور دیکھنے والے بی اے فائن آرٹس میں ایڈمیشن لیا تھا۔ بہت سی اتفاقی ملاقات تھی ان کی جو صدیوں پر محیط ہو گئی تھی اور جب وہ دلہن بن کر اس گھر میں اتری تھی کسی ملکہ کی طرح کسی فاتح حینہ کی طرح جس نے اسعد جیسے اسٹون کو فتح کیا تھا اور اس روز اسعد کس قدر خوش تھا۔
 ”مجھے لگتا ہے آج میری تکمیل ہو گئی ہے۔“ اس کا حنائی ہاتھ تھام کر اسعد نے کہا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

”میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں دیکھ!“ آنے والے دنوں میں یہ فقرہ اس نے کئی بار سنا تھا اپنی تمام تر شدتوں اور سچائیوں کے ساتھ۔
 اور جب اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”میں اپنے پیرنس کی اکلوتی اولاد ہوں دیکھ! بہن بھائیوں کی شرارتوں، محبتوں سے ناواقف، میرے گھر میں ہمیشہ خاموشی کا راج رہا ہے اور میں نے جب بھی اس بادشاہت کو ختم کرنا چاہا تو وہ مجھ پر ہنس دی کیونکہ میری آواز میں اتنا زور نہ تھا۔ میں چاہتا ہوں ہمارے گھر میں شور ہو۔ چھوٹی چھوٹی شرارتیں، ہنسی ہنسی۔“ وہ آنکھیں موہ کر اس منظر میں کھو گیا تھا جو اس کے ذہن کی تخلیق تھا۔
 ”دیکھ ہمارے کم سے کم بارہ بچے تو ضرور ہوں گے، ہے نا؟“ دیکھ اس کی شرارت سمجھ نہ کی تھی سو گھبرا گئی۔

”بارہ بچے..... اف نہیں سعدی! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں انہیں سنبھالوں گی کیسے؟“
 ”یار آدمی تم سنبھال لینا باقی میں سنبھال لوں گا۔“
 ”میں تو پھر بھی سنبھال نہیں پاؤں گی..... دو تین کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 ”تین تو بہت ہی کم ہیں۔ چھ تو ضرور ہونے چاہئیں۔“ وہ بحث کے موڈ میں تھا۔ دیکھ اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔

”نہیں تین بچے ہی کافی ہیں۔“
 ”چھ۔“
 ”تین۔“ دیکھ روتے روتے ہنس دی وہ لہجہ یاد کر کے۔
 اور جب ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا۔
 ”آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔“
 پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ کر سر پر دے مارنے کا مطلب اسے حقیقتاً سمجھ آیا تھا۔

کر پرس میں اڑس لیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں ہلکا سا میرش پھیرا اور ہونٹوں پر نیچرل کمری لب اسٹک کا کوٹ کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔

اسعد ابھی کچھ دیر قبل آفس سے لوٹا تھا اور اب ڈرائنگ روم میں چھری کا نئے سے جنگ کر رہا تھا۔۔۔ کچھ لمحے دروازے میں ایسا تھوڑی سی پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی۔ ان کی شادی کے بعد شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اسعد تھوڑا زکر کر رہا تھا۔ مہرو اپنے کمرے میں تھی۔

”اسعد۔“ کرسی کی پشت پر ہتھیلیاں جما کر اس نے بہت ہولے سے اسے پکارا اور سر اٹھانے پر بولی۔

”میں کراچی جا رہی ہوں کچھ دنوں کے لیے۔ ایک چوکلی ماما کا فون آیا تھا وہ مجھے بہت مس کرا رہی ہیں..... یونو..... پاپا کی دُستہ کے بعد تو وہ بالکل..... ہی تمہارے گئی ہیں۔“ وہ اسعد کی نظروں سے خود کو ہٹاتا ہوا مسوس کرا رہی تھی جن میں جھوٹ پکڑ لینے کی واضح تحریر ملتی تھی۔

”واپس کب آؤ گی۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”جب ماما آنے دیں گی۔“

”او کے ٹیک کیئر آف یور سیلف اور آئی ٹی کو میرا سلام کہنا۔“ وہ پھر سے پلیٹ پر جھک گیا۔

”اسعد تم مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑ آؤ۔“ وہ خطر ہی رہی۔ اس کے خیال میں یہی فقرہ کچھ رو دہلا کے ساتھ اسعد کو کہنا چاہیے تھا لیکن اسعد کی دلچسپی و بیکر کی نسبت پلیٹ کی طرف زیادہ تھی۔

”آئی ایم سوری دیجیہ! آج میں بہت تھک چکا ہوں تم پلیز ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔“

دیجی کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ وہ ناراض تھا اور کس قدر بے اعتنائی برت رہا تھا۔ (دیکھو
تھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اپنا خیال رکھنا سعدی۔“ اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر وہ باہر نکل گئی تھی اور کراچی پہنچنے سے پہلے اپنے اپنی سارے آنسو بہا دیئے تھے۔ جہاں ماما اپنی بانہیں وا کیے اسے پناہ دینے کے لیے تیار تھیں۔

• ✦

ساحل کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی وہ سمندر کی آتی جاتی شوریدہ سرلہروں کو دیکھ رہی تھی جو پتھروں کے قریب ڈھیر سارا جھاگ چھوڑ کر واپس پلٹ جاتی تھیں۔ اسعد کا ہاتھ تھاے اسی ساحل؟ انہی لہروں میں اس نے بارہا اپنے غیر بھگوئے تھے۔ ریگ ساحل پر نقوش و فارم کئے تھے۔ گھروندے بنائے تھے۔ سپہاں چتی تھیں۔ وفا کے ان گنت وعدے، یقین کے، شبنم کی مانند ہوا کے سر دیکھے تھے۔ گیلی ریت پر قدم دھرنے لگی شاید کوئی وعدہ، کوئی لہر، کوئی گھروندہ گزرے دنوں کی نشانی بن کر سانس

جائے۔ لیکن وہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔
اس نے جبکہ کر پانی کو مٹھی میں قید کرنا چاہا اور ناکام ہو کر گھر لوٹ آئی۔ کارڈور میں ماما نے اسے
فون ریسیو کرنے کے لیے کہا تھا۔ دعائیں شاید یونہی مستجاب ہوا کرتی ہیں دوسری طرف سے آتی اسعد کی
آواز نے اندر کی گلی آگ پر جھینے ڈال دیے تھے۔

”کیسی ہو دیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“

”اور..... میرے بارے میں نہیں پوچھو گی کہ کیسا ہوں۔ کس حال میں ہوں۔“

دیجیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ جب خاموشی دل کا حال کہہ دے تو لفظوں کی حاجت نہیں رہتی۔ اسعد کے سوز اسے اندر بھی محسوس ہوا تھا۔

”پلیز دیا! واپس آ جاؤ میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔“

”میں بھی تمہیں بہت مس کر رہی ہوں سعدی! مگر واپس نہیں آ سکتی..... ماما واپس آنے نہیں دے۔“ ایک بار پھر اس نے جھوٹ کا دامن تھام کر اسعد کو خاموش کروا دیا تھا۔ حالانکہ اسعد کی بیٹابی اسے

ت سے نواز رہی تھی پھر جب فون بند کر کے وہ اندر آئی تو ماہا چائے تیار کر چکی تھیں۔ چھوٹے ہی پوچھے

”کیا کہہ رہا تھا اسعد؟“

”واپس بلارہا ہے۔“ وہ ہلکی پھلکی سی ہونٹیں تھکی۔

”ہاں دیکھ! میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی اب تم واپس چلی جاؤ۔ میری بات کو غلط مت سمجھنا جانو اور میں تین ہفتے ہو چکے ہیں تم کو کراچی میں، اسعد تنہا ہے اسے تمہاری ضرورت ہوگی ویسے بھی بیٹا مرد کو کبھی

رہ نہا نہیں چھوڑنا چاہیے وہ بہک جاتا ہے۔“ اما اسے سمجھا رہی تھیں مگر وہ جھنجھلا گئی۔

”پلیز ماما! اسعد ایسا بالکل بھی نہیں ہے اور وہ بھی مہر ہے تو اس کے پاس۔“

بے دھیانی میں وہ مہر و کا نام لے مٹی مٹی حالانکہ سارے جہان کی طرح وہ ماما سے بھی یہ بات چھپاتا تھی۔

”مہر و..... مہر و کون؟“

”اماں وزیراں کی بیٹی۔“

”اماں وزیریاں کی بیٹی۔“ وہ خود گلجامی کے سے انداز میں بولیں پھر ایک دم حیران ہوئیں۔
”لیکن وہ اسعد کے پاس کیا کر رہی ہے؟“

”ایک بیوی اسے شوہر کے ماسر رکھا کرتی۔“

ایک بیوی اپنے شوہر کے پاس کیا کرنی ہے ماما؟“ وہ النان سے پوچھ رہی تھی۔ دانستہ اطمینان کا۔

دامن تھا اس نے سب بچ بتا دیئے کی شادی تھی۔

”بب..... بیوی..... تو کیا اسعد نے دوسری شادی کر لی ہے؟“

”نہیں ماما! بلکہ میں نے اس کی شادی کروادی ہے۔“

”کیا.....“ وہ گنگ سی رہ گئی تھیں، اس کی بات سن کر۔ انہیں اپنی بیٹی کی عقل پر شک ہو رہا تھا۔

”اوہ میرے خدا یا! یہ تم کیا کر آئی ہو بے وقوف لڑکی!“ انہوں نے چند ثانیے توقف کیا۔

”اور..... اور پھر نوکرائی کی بیٹی..... تم نے غلطی کر دی ہے دیجیے بہت بڑی غلطی..... یہ بی بی کلاس لوگ“

یوں بھی بہت چالاک ہوتے ہیں۔“ وہ کچھ اور اسے ملامت کرنا چاہتی تھیں لیکن دیجیے مہلت ہی ندی۔

”فارگا ڈسک ماما! خاموش ہو جائیے۔ میں..... میں پہلے ہی بہت ڈپریشنڈ ہوں۔“ اکتاہٹ سے

کہتے ہوئے وہ اپنے بیڈروم کی طرف آگئی۔

+

بہت تاریک صحرا ہو گیا ہے

ہوا کا شور گہرا ہو گیا ہے

کسی کے لمس کا یہ معجزہ ہے

بدن سارا سنہرہ ہو گیا ہے

وہ جس خاموشی سے گئی تھی اسی خاموشی کا دامن تھا اسے واپس بھی آگئی تھی اور مہر النساء کو دکھ کر ایک لمحے کے لیے ششدر سی رہ گئی تھی۔ سیاہ رنگ کے سادہ سے سوٹ میں چٹا ہوا سرخ دوپٹہ بے نیازی سے کندھوں پر ڈالے وہ ”وہ“ والی مہر تو قطعاً نہیں لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بندے اور گلے میں نازک کا چین، کلائیوں میں خوبصورت جڑاؤنگن، پہنے وہ بڑی خوشدلی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ بدلے ہوئے لب و لہجے کے ساتھ آنکھوں کی معصومیت میں چمک آگئی تھی۔ چہرے پر خوش حالی تھرکتی پھر رہی تھی۔ کس کے لمس کا جادو واقعی چل چکا تھا۔ دیجیے خود کو ہواؤں کی زد میں محسوس کیا۔ دل میں بال سا آگیا۔ ملال بڑھ گیا تھا۔

”کیا میں کچھ کھونے والی ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

لیکن اسعد جس بیقراری سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کا سارا ملال آپوں آپ ہی دھل گیا۔

”دیجیے آج ہم باہر ڈنر کریں گے۔“ وہ یقیناً حکم دے رہا تھا۔ دیجیے نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ وارڈ روم

کھول کر کچھ لمحے وہ کچھ کھوجتا رہا پھر سیاہ رنگ کی ساڑھی اس کی طرف بڑھا دی یہ اس کا فیوریت کٹر تھا۔

”تم یہ پہن لو۔“ دیجیے نے اس کے ہاتھ سے ساڑھی لے لی۔ شاد اس نے کچھ دیر قبل لیا تھا لہذا چیخ کر کے اس نے لائٹ سامیک اپ کیا اور اسٹپس میں کئے ہوئے بالوں کو یونہی کھلا چھوڑ دیا۔ اچانک قد آدم آئینے میں مہر کا عکس ابھرا آیا تھا جس کی سیاہ چوٹی کمر سے نیچے تک جاری تھی۔ وہ ہاتھ میں برش پکڑے اپنے بالوں کو بھول کر اس کے بالوں کو ٹکٹے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ اسعد کی آواز نے اسے چونکا یا تھا۔ وہ جیسے ہوش میں آگئی تھی۔

”ہوں..... ہاں..... کچھ بھی تو نہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ تم نے مجھے کتنا یاد کیا؟“ وہ اس کے ہاتھ سے برش لے کر اس کے بالوں میں چلانے لگا۔ آنکھوں میں محبت کی جوت چلائے پوچھ رہا تھا۔

”بہت..... ہاں بے حد زیادہ۔“ وہ پوری چٹائی سے کہہ رہی تھی۔ اسعد مسکرا دیا پھر کچھ یاد آنے پر ڈر رینگ

نیمبل کے نچلے دراز سے ایک گفٹ پیک نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”دس از فار پو۔“ وہ ایک ٹانگ کے سہارے ڈر رینگ نیمبل پر بیٹھ گیا، یوں کہ کمر میں خم آگیا۔ ار

لمحے وہ بھی سیاہ شلوار سوٹ میں تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”خود ہی دیکھ لو۔“ دیجیے نے باکس کھولا آنکھوں کو خیرہ کرنا ڈاؤنٹنڈیکس تھا۔

”یہ بہت خوب صورت ہے سہی!“ وہ اسے دیکھنے لگی۔

”بالکل میری زندگی کی طرح۔“ بہت ہوئے سے شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے

اسعد نے کہا تھا اور اس کے ہاتھ سے ٹیکس لے کر اس کے پیچھے آن رکا۔

”اب چلیں۔“ ٹیکس کالاک بند کر کے اس نے پوچھا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اسعد کے

بازو میں ہاتھ ڈال کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ انہیں لاؤنج سے گزر کر پورج تک جانا تھا اور لاؤنج میں

مہر النساء بڑی دلچسپی سے کوئی مووی دیکھ رہی تھی۔ ویجے چلتے چلتے رک گئی۔

”سہی! میرے ایئر کنڈکٹر کمرے میں ہی رہ گئے ہیں تم چلو میں پہن کر آتی ہوں۔“

”او کے جلدی آنا۔“ دیجیے نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر اس کی طرف آگئی آج ویجے کے

پکارنے پر مہر النساء ہمیشہ کی طرح اچھلی نہیں تھی۔

”اٹھ کر کپڑے بدل لومہرو۔“ بنا کسی تہدید کے اس نے کہا تھا۔

”لیکن.....“ مہر نے کچھ کہنا چاہا ویجے نے ٹوک دیا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔“ اس نے ہر لفظ پر زور دیا تھا۔

”میں اور اسعد ڈنر کے لیے باہر جا رہے ہیں تم چیخ کر کے سو جانا۔“ وہ اسے اپنی حیثیت کا تعین

کرواتی، احساسِ تفاخر سے گردن تانے باہر آگئی جہاں اسداس کا منتظر تھا۔

+

”اس مہنگائی نے تو کمر ہی توڑ دی ہے۔ ادھ کلچر چاول لینے جاؤ تو بس روپے ایویں ک جاتے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے نا بی بی، ست (سات) جی ہوں گھر میں تو آدھ سیر چاولوں میں بھلا کیا بنتا ہے۔“ اماں وزیراں بڑے دکھ بھرے انداز میں اپنی داستانِ حمزہ بیان کر رہی تھی۔ دیکھ اس کا مطلب بخوبی سمجھتی تھی جی اکتا کراٹھ کھڑی ہوئی اور اسے پرس کھولتے دیکھ کر وزیراں کا راگ کچھ اور تیز ہو گیا۔

”لو وزیراں! یہ کچھ روپے رکھ لو۔“ دیکھ نے اس کی طرف نوٹ بڑھائے تھے جنہیں تھاتے ہوئے وزیراں نے دعاؤں کے ڈگرے برسانے شروع کر دیے تھے۔ پھر دیکھ بولی۔

”سنو وزیراں! میں چاہتی ہوں کہ تم مہر کو کسی اچھی ڈاکٹر کو دکھاؤ آں..... تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔“

”ہاں ہاں بی بی! تم فکر ہی نہ کرو۔ اب کے مہر کو میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں نا تو ضرور کسی اچھی ڈاکٹر کی کو دکھاؤں گی۔“ وزیراں نے جلدی سے کہا تھا۔

”یہ کچھ اور پیسے رکھ لو۔ داتا دربار جاؤ تو میری طرف سے چادر چڑھا دینا۔“ تبھی مہر واپنا بیگ لیے چلی آئی۔

+

لہو لہو ہے آرزو

کبھی گماں، کبھی یقین

قدم کہیں نظر کہیں

جب ہوش میں بھی رہیں

بے خودی کی لگتی ہے

یہ زندگی کبھی کبھی ایسی ہی لگتی ہے

ہر وقت بوجھل رہنے لگی تھیں۔ سیاہ دائرے بڑھتے جا رہے تھے۔

وہ کچھ عرصہ پہلے والی دیکھ اسدھ گیلانی تو قطعاً نہ رہی تھی جو بے انتہا نفاست پسند تھی۔ جسے لباس پر پڑی ٹکنیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ جسے بال بکھارے رکھنا پسند نہ تھا۔ جو پرفیومز اور جیولری کی شیدائی تھی۔ ہر لمحہ فارغ رہنے کے باوجود وہ ان باتوں کی طرف دھیان ہی نہ دے پاتی تھی۔ ذہن ان دونوں کی طرف سے ہٹا تو کہیں اور جاتا۔ نیند بھی روکھتی اور جب خود سے جنگ کرتے کرتے تھک جاتی تو نیند کی کئی کئی گولیاں پھاٹک لیتی اور جس خبر کی وہ منتظر تھی۔ جس کے لیے ہجر کا دامن تھا مے ہوئے تھی وہ خبر مل ہی نہیں رہی تھی تب وہ اماں وزیراں کے سر ہو گئی۔

”آخر تم کیا کرتی پھر رہی ہو وزیراں! آخر کیوں نہیں لے کر جاتیں مہر کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس..... کیوں دیر ہو رہی ہے اتنی.....“ مارے غیض کے اسے اپنی آواز اتنی لگ رہی تھی۔ وہ یوں وزیراں پر برس رہی تھی گویا وزیراں ”دیہ“ ہونے کی ذمہ دار ہو۔

”میں اسے لے گئی تھی بی بی..... مگر“ وزیراں منمنائی۔

”یہ کارڈ رکھو اپنے پاس۔“ اس نے وزینگ کارڈ وزیراں کی گود میں پھینک دیا۔

”اس پتے پر چلی جانا یہ میری سیکیل کا پرائیویٹ کلینک ہے۔ تم مہر کو یہاں لے جاؤ۔ میں نے اسے فون کر دیا ہے۔“ وہ بے ربط سا بول رہی تھی۔

”اور ہاں ڈاکٹر زبیرہ کو صرف یہ بتانا کہ مہر تمہاری بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔“ اس کا زور تمہاری پر تھا اور وزیراں سمجھ دار تو تھی ہی۔

عجیب سے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ مندی مندی آنکھوں سے وہ چھت کو مھورتی رہی جو کبھی قریب آ رہی تھی تو کبھی دور جا رہی تھی۔ اس نے انکسے کی کوشش کی تو پتھر سر پر آ لگا وہ تکلیف سے مٹھیاں سمجھتی گئی۔ چار پلو لینے کے باوجود نیند آنکھوں کے کونوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ غنودگی کی ہلکی سی دھند چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشقت سے اٹھی۔ گول گول گھومتے سر کو سنبھالتی وہ نیچے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ دفعتاً ایک آواز ہوا کے دوش پر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

”مہر..... مہر“ وہ پکار رہا تھا۔

”مہر؟ یہ کون ہے؟ اوہ..... تو..... تو وہ اب مہر ہو گئی ہے۔“

نفرت کا شدید ترین احساس رگوں میں اترنے لگا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتی کچن تک آئی تھی۔

”یہ کیا ہے مہر؟“

وہ انگلیوں پر حساب لگانے بیٹھی تو پتا چلا دس ماہ گزر گئے۔ وہ تیر زدہ سی رہ گئی۔ آخر یہ دن گئے کہاں؟ حالانکہ اسے تو پل پل صدیوں پر محیط لگتا تھا۔ اسدھ، مہر کے ساتھ ہوتا تو وہ جیل پیر کی جلی کی طرح سارے گھر میں چکر لگاتی رہتی اور جب اس کے ساتھ ہوتا۔ بے چینی واضطراب تب بھی دامن گیر رہتے۔ آنکھیں

”روٹی۔“ مہر کی من من اسے سنائی دی تھی۔ جواباً ہر طرف خاموشی چھا گئی اور جب وہ بولا تو اس کی آواز میں تبسم کی رمت تھی۔

”مجھے تو آسٹریا کا نقشہ لگ رہا ہے۔“ شریر سا انداز تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے دیجہ نے ان کے دھندلے وجود کو جتنا چاہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انگلیوں میں جیسے لوہے کی سلاخیں آن ٹھہری تھیں۔ دیوار کو تھامنا چاہا تو ہاتھ پھسلتا چلا گیا۔ ٹانگوں نے بوجھ سہارنے سے انکار کیا تو وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ وہ خود کو خلا میں جھکے لے کھاتی محسوس کر رہی تھی۔ اسعد کو پکارنا چاہا تو آواز کہیں اندر ہی ایک گئی۔ اٹھتی گرتی پلکوں تلے سیاہ دائرے بننے لگے۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کب اس نے ٹھنڈے فرش پر رکھا اور دنیا دما فیہا سے بیگانی ہو گئی۔

اسعد بہت تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کرنا چاہا تو ایسا لگا ہاتھ استری کو چھو گیا۔ برف جیسے فرش پر بے سدھ پڑی وہ بے طرح گرم ہو رہی تھی۔ اسعد نے مضطرب دہے چین سا ہو کر اسے بانہوں کا سہارا دے کر کھڑا کیا۔

”چلو بیچو اندر چلے ہیں۔“ پر سوچ انداز میں کہتے ہوئے اس نے اپنی آواز کی گرفت مضبوط کر دی تھی اور وہ شاید آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود ہوش میں نہ تھی تھی اسے بے انتہا جنینیت سے دیکھتی رہی تھی۔

”دیا! آریو آل رامیٹ۔“

ہاں تب۔ فقط تب ہی اس کے لیوں پر مکان جا گئی تھی۔ عجیب سی مکان نشے کے سمندر میں بلکوںے لیتا تبسم۔ اسعد کی نگاہوں میں ”اپنی زندگی“ کے لیے ترم سٹ آیا لیکن تب تک محترمہ زندگی عجب بے خودی کے عالم میں اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر ایک بار پھر کھو چکی تھیں۔ اس نے پوری گردن موڑ کر پیچھے کھڑی مہر النساء کو دیکھا جو اس کے ساتھ ڈنکر نے کی خواہش مند تھی۔ نظریں ملنے پر وہ اعتماد سے اسے دیکھتی رہی تھی کسی بھی ناگواری کے بغیر۔

”آپ انہیں بیڈروم میں لے جائیں یہ یقیناً سونا چاہتی ہیں۔“

اسعد نے بہت متکبرانہ نگاہوں سے اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا تھا جو عمر کی بہت سی سیلیاں عبور نہ کرنے کے باوجود مشہور کے لاتعداد زینے پھلانگ چکی تھی۔

”شکریہ..... بہت شکریہ مہر النساء۔“ اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ مہر النساء مسکرا کر برتن سینے لگی اور وہ دیجہ کو لیے بیڈروم میں آ گیا۔ اس نے دیجہ کو بہت احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا وہ اسے دیکھتا رہا جو کچھ ہی عرصے میں صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ گندی رنگت میں بے انتہا زردیاں کھل گئی تھیں۔ اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اسے ہونٹوں سے چھوتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مڑتے ہوئے اس نے ایک قدم بھی نہ بڑھایا تھا کہ ہاتھ نازک سی گرفت میں آ گیا۔ دیجہ کئی رت جکوں کا

خمار آنکھوں میں لیے اسے نک رہی تھی۔

”آج یہیں رک جاؤ اسعد..... پلیز..... یہیں میرے پاس رک جاؤ۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ایسی التجا جو فیروں سے کی جاتی ہے۔ ایسا دھڑکتا ہوا انداز جس میں گزارش کے رد کئے جانے کا خطرہ ہو۔ اسعد اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

”میں تمہارے ہی پاس ہوں دیا۔ بس لایمٹ آف کرنے جا رہا تھا۔“

”نہیں آج لایمٹ آن ہی رہے دو۔ آج ہم بہت ساری باتیں کریں گے..... بہت ڈھیر ساری۔“

”ہاں بالکل ٹھیک۔“ اسعد بہت بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔ دیجہ نے اس کا ہاتھ تھام کر سینے سے لگالیا تھا اور سر اس کے کھینے پر رکھ دیا تھا۔ گویا بھاگ جانے کے راستے مسدود کئے تھے اور اس کے کھینے پر سر رکھے وہ ایک سے دوسرا فقرہ بھی مکمل نہیں کر پاتی تھی۔ اسعد کی انگلیوں کی زماہٹ اسے نیند کے سمندر میں دھکا دے گئی تھی۔

+

یہ جو زیگ دشت فراق ہے یہ رے کے اگر
یہ رے کے اگر تو نشاں ملے یہ نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے
یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں
میرے آسمان سے کدھر گئی
حیرے التفات کی کبکشاں
میرے بے خبر، میرے بے نشاں
یہ رے کے اگر تو پتہ چلے
میں تھا کس سحر، تو رہا کہاں
کہ زمان و مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
وہ میرے نصیب کی بارشیں
ہمیں اور چھت پر برس گئیں

اپنے نصیب کی بارشوں کو اپنی چھت تک محدود کرنے کے لیے اس نے جوسی کی تھی وہ بلاشبہ رازیاں جاری تھی اور حسد و جلن کی بلیں، دل کے گلستان میں اپنی جڑیں مضبوط تر کرتی جا رہی تھیں۔

مہر دے بات کرتا تو درکنار کبھی کبھی اس کی صورت دیکھنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ اول تو وہ اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی پھر جب ملکیت کا احساس غالب ہونے لگا تو شان سے باہر آ جاتی۔ مہر کو بھی طبع کرنے کی کوشش کرتی تو ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتی یا کسی کام میں الجھ کر دانستہ مصروف ہو جاتی یا غائب کرتی۔

بہت غیر محسوس انداز میں مہر دے سامنے اسعد پر اپنا حق جتاتے ہوئے اسے مزہ آنے لگا تھا۔ مہر دے کے چہرے پر پھیلنے تاثرات اس کے اندر تک تسکین کی کرنیں اتار دیتے۔ اسے ویسا ہی سکون ملتا جیسا برسوں سے پیاسی زمین کو رگم رگم برستی بارش پہنچاتی ہے۔ سخت گرمی میں بھی شہر دل کے چوراہے میں برف باری ہونے لگتی۔ مہر دے کی رقیب بنتی جا رہی تھی اور اس رقیب سے چمٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جس مقصد کے لیے اسے لایا گیا تھا وہ پورا ہو جائے اور جس کے آثار اسے فی الحال دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے تبھی ایک بار پھر اس نے اماں و زیاں کو بلا بھیجا کیونکہ مہر دے کے مٹھلی چیک اپ کی ذمہ داری اسی پر تھی۔ وہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی تھی کیونکہ اس راز سے چند لوگ ہی واقف تھے۔ اور پتا نہیں کیوں؟ اماں و زیاں آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی تبھی اچانک مہر دے کی بہن چلی آئی۔ زہرہ سے چھوٹی، ہو بہو مہر النساء کی فوٹو کاپی۔ وہ مہر دے ملنے آئی تھی جو واش روم میں تھی۔ دیجیہ بلا ارادہ ہی اس سے باتیں کرنے لگی۔

”نام کیا ہے؟“

”شانہ۔“

”کون سے شہر سے آئی ہو۔“

”گوجرانوالہ۔“

”میاں کیا کرتا ہے تمہارا؟“

”پتا نہیں۔“

”ایس..... کیا مطلب؟“

”چار ماہ پہلے جب میں لاہور آئی تھی تو درکشاپ میں کام کرتا تھا۔ اب خدا جانے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا تم چار مہینوں سے اپنے گھر نہیں گئیں۔“ اس کی دلچسپی یونہی بڑھ گئی تھی۔ شانہ کچھ لمبے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی اور بولی۔

”طلاق دے دی اس نے مجھے، چار مہینے پہلے۔“

”اوہ..... کیوں دی اس نے تمہیں طلاق؟“ دیجیہ نے شانہ کی جھکی پکوں تلے ہلکورے لیتا دکھ دیکھا تھا مگر محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ تو خود سے الجھی ہوئی تھی ”آخر کیا پکڑتا تھا پہلے زہرہ اور اب شانہ؟“

سوال سن کر شانہ اداسی سے ہنسی تھی۔

”ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ تو دنیا ہی تھا بس میں اسے اولاد نہ دے سکی تو اس نے مجھے طلاق دے دی۔“

”کیا تم بھی زہرہ کی طرح..... میرا مطلب ہے۔“ وہ سمجھ نہیں سکی کہ کس طرح سے اپنی بات اسے سمجھائے۔ پھر اس نے شانہ کو دیکھا جو اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ دیجیہ الجھ گئی۔ اسے رہ رہ کر مہر دے کا خیال آ رہا تھا۔

”میں نے اماں سے کہا تھا میری شادی کسی بچوں والے سے کر دے مگر وہ نہیں مانی، خالہ کے بیٹے سے کر دی میری شادی۔ اب جی آپ خود بتاؤ مرد بچے کے لیے ہی تو شادی کرتا ہے نا اور مجھے پتا تھا کہ میرے بچے نہیں ہوں گے میری کوکھ بھی خالی رہے گی۔“

”یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟“ دیجیہ نے تیزی سے پوچھا تھا۔

”پتا تھا جی سب پتا تھا۔ میری ماں کو میرے دادے کی بددعا لگی تھی جی۔ میری ماں نے اس کے ہاتھ سے روٹی چھینی تھی پھر وہ مر گیا۔ پر جاتے جاتے جھولی پھیلا کر میری ماں کو بددعا دے گیا تبھی اللہ نے اماں کو بیٹا نہیں دیا اور اب ماں کا کرنا ہم نہیں بھگت رہی ہیں۔“

”یہ سب ڈھکوسلے ہیں شانہ! دعائیں اور بددعائیں کسی کی قسمت بتایا لگا نہیں سکتیں۔“

”نہ جی یوں نہ کہیں دعائیں اور بددعائیں تو وہ وہ کام کرتی ہیں جو بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”میں نہیں مانتی اس فلسفے کو۔ بہر حال تم بیٹھو مہر دے آتی ہی ہوگی۔“ وہ اٹھی اور لان میں آ گئی۔ اس پنج پر سوچتے ہوئے ایک لمحوں اس کے ذہن میں گھنٹی سی بجی۔ جی اور بجتی چلی گئی۔ وہ بددعاؤں کی کارستانی سے منحرف تھی مگر نجانے کیوں دل میں ایک شک سا سرا اٹھارنے لگا۔

+

مہر دے کا مکمل چیک اپ کروانے کے تین دن بعد وہ ڈاکٹر کے رو برو تھی۔ ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ سے انداز میں رپورٹس کا جائزہ لیا پھر سامنے ٹیبل پر رکھ کر پشت بیک سے ٹکا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی رولنگ چیئر کے ساتھ ساتھ دیجیہ کی دھڑکنیں رول کر رہی تھیں۔ خطرے کا احساس کہیں اندر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بے تاباں نے اسے ہاتھ ملنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ایک سیکس ز می ڈاکٹر آپ..... آپ مجھے بتا کیوں نہیں رہیں؟ آخر کیا پرابلم ہے مہر النساء کے ساتھ کیوں اتنی دیر ہو رہی ہے؟“

”خیر دیر تو ایک اور ہی پہلو ہے اس چیز کا..... خدا کی مصلحت ہم انسان نہیں جان سکتے۔ کچھ کاموں

میں وہ دیر کرتا ہی ہے۔ یوں بھی اکثر کھلو کے یہاں تو شادی کے دس دس سال بعد بھی اولاد نہیں ہوتی۔ کوئی بھی مسئلہ نہ ہونے کے باوجود۔ مہر النساء کی شادی کو تو محض دس ماہ ہوئے ہیں۔“ دیکھ بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

”بہر حال مہر النساء کے کس میں اس کی اپنی مرضی کا بھی عمل دخل ہے۔“

”پلیز ڈاکٹر! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی..... پلیز آپ مجھے وضاحت سے بتائیے۔“ اس نے بے چینی سے کہا تھا۔ ڈاکٹر نے ذرا سا آگے جھک کر کہیاں میز پر ٹکا میں اور ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

”یوں ہے سزگیلانی! کہ مہر النساء کی رپورٹس کے مطابق وہ وقفے کے لیے باقاعدہ میڈیسن لیتی رہی ہے۔“

”واٹ؟“ دیکھ ہنسنے کی شکل لیے ڈاکٹر کو کتنی جواہر کے بعد ایک بم بلاسٹ کر رہی تھی۔

”جی ہاں! آپ کہہ رہی ہیں کہ مہر النساء جلد اولاد کی خواہش مند ہے لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ ذرا خود سوچئے اگر وہ جلد ہی بے بی پیدا کرنا چاہتی ہے تو اتنا ریگولری میڈیسن کیوں استعمال کر رہی ہے۔ ان فیکٹ تقریبات میں بیٹے بچتر اس کا ابا رشن بھی ہو چکا ہے۔ اب آپ خود زیادہ غطند ہیں سمجھ سکتی ہیں کتنا بڑا کام عورت کی مرضی کے بغیر تو نہیں ہو سکتا۔“

دیکھنے نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

”اوہ میرے خدا یا! آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ کوئی قسمی ہے جو سلینے میں ہی نہیں آ رہی؟“

”مہر اس قدر چالاک نکلے گی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اس کی معصومیت سے متاثر ہو کر اس کا انتخاب کیا تھا اور..... وہ..... معصومیت کے پردے میں کس قدر خباثت لیے ہوئے ہے؟ کیا..... کیا اس کو مجھ سے چھیننے کی کوئی سازش..... کوئی طریقہ؟“

اگر دو راستوں پر آپ بیک وقت گامزن ہوں تو لاشعوری طور پر ایک سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سامنے سے آتا ٹرک اسے تب نظر آ رہا تھا جب وہ اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

+

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں ایک سیلاب تھا جو پلکوں کی باڑھ کو درگود میں رکھے ہاتھوں کو نرم کر رہا تھا۔ اس نے پلکوں کی بو جھل جھالری اٹھائی اور فوراً ہی جھکالی۔ عین سامنے والے صوفے کی پشت پر دونوں ہتھیلیوں سے بوجھ ڈالے دیکھ کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔ ایک ٹانگ کو اضطرابی انداز میں حرکت دینے ہوئے وہ جواب طلب نظروں سے اسے تنک رہی تھی۔ انداز میں پھاڑ کھانے والا عنصر غالب تھا۔ مہر النساء

نے بڑی مشقت سے گلے میں اٹکا گولا نکلا، سوکھے چڑی جیسے ہونٹوں کو زبان سے ترکیا اور بولی۔

”میں نے اماں کو روکا تھا مگر وہ نہیں مانی۔ اس نے کہا تھا تیرے بعد مجھے دو بیٹیاں اور بیانی ہیں اور اب تک ان کی شادی نہیں ہو جاتی تو نے پچہ پیدا نہیں کرنا۔“ اس کے رونے میں مزید شدت آگئی تھی

سکپاں کسی صورت تھمنے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔ دوسری طرف دیکھ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ واقعی اس لڑکی کو مار کھائے۔

”ہاں تم تو دودھ پیتی بچی ہو نا۔ ماں نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا۔ کل کو وہ کنویں میں چھلا گنگ لگانے کو لپے گی تو وہ بھی کر لیتا۔“ وہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اس پر برس رہی تھی۔

”بیوقوف لڑکی! تمہیں اندازہ ہے کس قدر بڑا نقصان کر چکی ہو تم۔ مجھے نہیں تو کم سے کم اس کو ہی بتا یا ہوتا۔ صحیح کہا تھا زہرہ نے۔ تم غریبوں کو بغیر محنت کے مل جائے اور وہ بھی حیثیت سے بڑھ کر تو تم پھل ہاتھ ہو۔ تمہارے علاج کے نام پر کتنا کچھ بخور چکی ہے تمہاری ماں اور تم اس میں برابر کی شریک رہی ہو۔ مہر النساء یکم..... میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں اور تمہاری ماں کو اسی وقت شوٹ کر دوں؟“

”دیکھ۔“ اس کو نسبتاً کثرت آواز نے اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔ اس نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

”پلیز دیکھ! جسٹ لیو دس ٹاپک۔ مہر دم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اور مہر تو جیسے اشارے کے انتظار میں تھی۔ دیکھ نے مضامین سمجھ کر اسے جاتے دیکھا۔ اس کا شخص بہت تیز ہو رہا تھا اور دھڑکن تیز تر۔

”کیوں بھیجا ہے تم نے اسے اندر؟“ دیکھ کا لہجہ و انداز ویسا ہی تھا۔ درشت، غصیلیا، پریش اس کے برعکس نرمی سے بولا۔

”تم پہلے ہی اسے کافی ڈانٹ چکی ہو دیکھ! جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا نا۔ اب چیخنے چلانے سے کیا ہوگا؟ یوں بھی وہ اتنی قصور وار نہیں ہے۔ تم کیوں اس بے چاری کا خون خشک کر رہی ہو؟“

”بے چاری..... تو اب وہ تمہیں بچاری لگنے لگی ہے۔“ اس کی پوری بات سے اپنے مطلب کا لفظ چننے میں اسے لمحہ ہی لگا تھا۔ اس نے کچھ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ بالکل جاہل عورتوں کی طرح طعنے دے رہی تھی۔ وہ بھی بھڑک اٹھا۔

”ٹوٹیل ددیو۔“ اس نے ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھایا اور بغیر اس کی طرف دیکھے تیز ہی سے باہر نکل گیا۔

دیکھ نے اسے باہر جاتے دیکھا اور کمرے میں پڑی چیزیں اٹھا کر بھیجی شروع کر دیں۔ ذرا سی دیر میں کمرے کی حالت اہتر ہو چکی تھی۔ وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ غبار پھیلنا جا رہا تھا۔ کتنے ہی لمبے خاموشی سے سرک گئے تھے جب اس نے دروازے پر دستک سنی۔ بیڈ پر اوندھے منہ

”کون چھین رہا ہے تمہارا شوہر؟“
 ”مہر النساء چھین رہی ہے۔“ وہ حلق کے بل چیختی تھی۔ اسعد نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر
 جھنجھوڑ ڈالا۔

”ہوش میں آؤ دیجیہ! وہ بے ضرری لڑکی کیا چھینے کی مجھے تم سے.....“
 ”وہ بے ضرر نہیں ہے اسعد..... ہرگز بھی بے ضرر نہیں ہے۔“ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو
 دی۔ اسعد نے اسے بانہوں میں بھر لیا وہ شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوئی تھی۔ اسعد اس کا سر تھک رہا تھا لیکن
 خاموش کروانے کی بہم ہی کوشش بھی نہ کی تھی اس نے۔ شاید اسی طرح غبار وصل جاتا۔ وہ بات جو وہ کئی دن
 سے محسوس کر رہا تھا آج پہلی بار اس کے منہ سے نکلتی تھی۔ خود کو تو وہ رد کر سکتا تھا مگر اب جبکہ وہ کہہ چکی تھی تو
 سوچنے کی گنجائش نہ تھی۔ اضطراب لازم تھا۔

اسعد نے بہت نرمی سے اسے خود سے الگ کر کے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے
 پانی اٹھیل کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی تھی۔ اسعد نے اس کے ہاتھ سے
 گلاس لے کر واپس ٹیبل پر رکھا اور خود بچوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”دیجیہ! میں صرف آج وضاحت کر رہا ہوں دوبارہ نہیں کروں گا۔ مہر النساء سے شادی کرنے کے
 لیے مجھے تم نے فورس کیا تھا۔ بقول تمہارے یہ ایک معاہدہ ہے۔“ ہاتھ بڑھا کر دیجیہ کے گالوں سے
 آنسوؤں کے موتی پختے تھے۔

”معاہدوں کے بھی چند اصول ہوا کرتے ہیں دیجیہ ڈیئر! اور وہ چند اصول ہمیں ہر صورت پورے
 کرنے پڑتے ہیں چاہے کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہو۔ میں بھی وہی اصول پورے کر رہا ہوں۔
 پلیز دیجیہ! مجھ پر شک کر کے مجھے میری ہی نظروں میں مت گراؤ۔“ اس کا لہجہ دھیمہ تھا مگر سلگتا ہوا تھا۔
 اس کی نگاہوں کی تپش دیجیہ نے اپنے اندر بھی محسوس کی تھی۔ آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے۔
 ”میں تم پر شک نہیں کر رہی ہوں۔“ اسعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
 ”میں چاہوں گا کہ آنے والے دنوں میں اس قسم کی مغلظات تمہارے ذہن میں نہ پلنے پائیں۔ مہر

واقعہ معصوم ہے دیجیہ! اپنی ماں کے ہاتھوں میں کھلونا۔ اس کی ماں نے اس طرح سے برین واشنگ کی ہے
 اس کی کہ وہ کچھ بھی نہ کر پائی۔ لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کچھ آج کچھ میں پائیں؟“ آخر میں وہ کچھ
 ہلکے ہلکے سے انداز میں دریافت کر رہا تھا۔ دیجیہ نے گال رگڑتے ہوئے سر ہلا دیا لیکن ایک پھانس تو اب
 بھی تھی۔

”اور تم مہر دے کوئی باز پرس بھی نہیں کرو گی۔“ دیجیہ نے پھر سے سر ہلا دیا۔
 آخر ساری ہمدردیاں مہر دے کے لیے ہی کیوں ہیں ایک ہی سوال کی بازگشت سنا کر دے رہی تھی۔

لینے، اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ دستک تیز ہوئی پھر کچھ اور تیز۔ اس نے سلگ کر نکیہ کر دیا
 وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ دروازہ ایک تو اتار سے بجنے لگا۔ ساتھ ساتھ اسعد کی آواز ابھری۔
 ”دیجیہ دروازہ کھولو۔“ پہلے اس کی آواز سپاٹ تھی کسی بھی تاثر سے عاری پھر سختی سہ آئی۔
 ”دیجیہ دروازہ کھولو۔“ کمرے میں دھشت بڑھنے لگی۔ دل کا غبار دماغ تک رسائی حاصل کر رہا
 وارڈ روم کے نچلے حصے سے ایک بڑا سا بیگ نکال لائی اور اس میں اپنا ضروری سامان ٹھونسنے لگی۔
 ایک بار پھر پوری قوت سے پینا گیا تھا۔

”دیجیہ اب تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں دروازہ توڑ دوں گا۔“ اسعد کی چنگھاڑ اس تک پہنچی تھی۔
 نے بڑھ کر لاک کھول دیا اور واپس پلٹ آئی۔

اسعد بہت غصے میں اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بہت کول مائینڈ ڈبندہ تھا مگر اس لمحے غصے میں کھول رہا
 کمرے کی تتر بتر حالت دیکھ کر غصہ کسی قدر تحیر میں بدل گیا۔

”یہ سب کیا ہوا ہے اور یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ دیجیہ نے کوئی بھی جواب دینے سے گریز کیا۔
 ”آخر تم جواب کیوں نہیں دے رہیں..... کیا کر رہی ہو تم۔“ دیجیہ کی طویل چپ اسے چڑا رہی تھی
 وہ اپنی چڑچڑاہٹ کو غصے میں چھپا رہا تھا۔

”پینلنگ کر رہی ہوں۔“ دیجیہ نے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے اطلاع بہم پہنچائی تھی۔
 ”نظر آ رہا ہے مجھے لیکن کیوں کر رہی ہو؟“
 ”میں کراچی جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“ اسعد نے اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ وہ جو جھک کر بیگ میں کپڑے ٹھونس رہا
 یوں کھینچے جانے پر اس کے سینے سے آگئی۔

”کیوں کس لیے، کس طرح؟ یہ سب جاننے کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں ہے مسٹر اسعد کیلانی! آپ
 بہت اطمینان سے رہو اپنی ”بیچاری“ کے ساتھ۔“ اس نے جھکے سے اپنا بازو اسعد کی گرفت سے آزاد کر
 تھا۔

”آئی کائنٹ بلیو دیجیہ..... آئی کائنٹ بلیو دوس..... تم ابھی تک اسی ایک لفظ کے پیچھے پڑی ہوئی
 آخر کیوں تم جاہلوں کی طرح بی ہو کر رہی ہو؟“ کیا کچھ نہیں تھا اسعد کے لہجے میں، آنکھوں میں نرم
 تاسف۔

”کیوں نہ بی ہو کروں میں جاہلوں کی طرح..... میرے گھر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔
 دوسری عورت میرے گھر پر قابض ہو رہی ہے..... میرا شوہر مجھ سے چھینا جا رہا ہے اور میں خاموش
 بنی رہوں۔“

”اور ہاں۔“ اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بھی کھڑا کر دیا۔

”اسعد، دیکھ سے محبت کرتا تھا، کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ چاہے بیچ میں کتنی ہی مہر و کیوں نہ آ جائے سمجھیں کچھ۔“ اسعد نے اس کی ناک دھیرے سے کھینچتے ہوئے خوشی سے پوچھا تھا۔ دیکھ نے جینے پر اس کے گلے میں بائیں حائل کر دیں اور اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے اپنے گرد اس کا مضبوط حصار محسوس کیا تھا۔ چنانچہ کسی قدر نکل چکی تھی۔ وحشت سر پر پیر رکھے بھاگ گئی تھی۔ بہت عرصے بعد ان کے کمرے میں رقص کرتی محبت بھری تنہائی اتری تھی اور یہ شاید اسی تنہائی کے سحر انگیز فسون کا اعجاز تھا کہ وہ ایک رومے بلکتے وجود کو کس فراموش کر بیٹھے تھے جس نے چھوٹی عمر میں شعور کا دامن تھا تھا۔ جسے اس کی معصومیت مار گئی تھی، جو اپنی جنم دینے والی کے ہاتھوں چالی کی گڑبائی رہی تھی اور جس نے اپنی بہنوں کو دلہن بنا دیکھنے کے شوق میں اپنے وجود کا حصہ ختم کر ڈالا تھا۔

+

وقت کی سبک رفتار جاری و ساری تھی اور اس سبک رفتاری میں ڈمگاہٹ کا سبب محض چند الفاظ بے تھے جس میں مہر و کے ماں بننے کی خبر دی گئی تھی۔ وہ ششدر سی ڈاکٹر کا منہ نکلے گئی جیسے یہ کوئی انہولی ہو۔۔۔۔۔ بہت ہی ناقابل یقین بات۔

وہ خوش تھی۔ بے انتہا خوش بلکہ اپنے احساسات کے اظہار کے لیے اسے خوشی کا مکمل اور بھرپور لٹا چھوٹا لگ رہا تھا۔ ساکت تالاب میں پتھر پھینک دینے سے سطح آب جس طرح ارتعاش کے زیر اثر جھوم اٹھتی ہے۔ لہریں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک رقص کرتی ہوئی اپنی حیات کا مژدہ دیتی ہیں یہی ہم ایسا ہی حال اس کے دل کی امید کا تھا جو خوشی سے پھولے نہ سار ہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گزرے وقتوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے دیسی گھی کے چراغ روشن کر کے جشن منائے یا کسی بلند مقام پر چڑھ کر چیخ کر اعلان کرے اور اس خوشی کے زیر اثر وہ یکسر فراموش کر چکی تھی کہ تخلیق کے ادوار اسے نہیں مہر و کو پورے کرنے ہیں اور اس رات اسعد کے بازو پر سر رکھے اس نے کتنی ہی باتیں اس ادھوری جان کے بارے میں کر ڈالیں جس کی نامکمل رگوں میں روح بھی نہیں پھونکی گئی تھی۔

”میں اس کا نام بہت خوب صورت سار رکھوں گی۔ جہانگیر، شاجہان یا ایسا ہی کوئی اور سنا ہے نام تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر لڑکی ہوگی تو اس کا نام نور رکھوں گی۔ ہے نا اسعد اچھا نام ہے نا نور! ان کا پیارا ہو گا نا وہ۔۔۔۔۔ بالکل تمہاری طرح اس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ، پیشانی، بال سب، سب کچھ تم سا ہو گا۔ اسعد تم چپ کیوں ہو۔۔۔۔۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔۔۔۔۔ ہے نا وہ تمہارے جیسے ہو گا نا۔“ ذرا سی گردن مڑ کر وہ تائید چاہ رہی تھی۔ اسعد ثبت انداز میں مسکرایا پھر اس کے چہرے پر نکھری لٹیں سینے سے ہونے بولا۔

”دیکھ۔۔۔۔۔“

”ہوں۔“ وہ جتن ہی اس کی شرٹ کے ٹٹوں سے کھیل رہی تھی۔

”دیکھ! مہر و میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“ دیکھ کے ہاتھ یک لخت ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے کچھ توقف سے اپنا سر اس کے بازو سے ہٹا لیا۔ اس کا چہرہ اس وقت بے حد سپاٹ تھا کچھ دیر قبل والی خوشی بھی کہیں نہ تھی وہ جب اس کے تاثرات جاننے میں ناکام رہا تو دھیرے سے اس کی پیشانی چھو کر باہر نکل گیا۔

انتظار کے لمحات واقعی بڑے جاں گسل ہوتے ہیں لیکن ان لمحات میں بھی بڑی محاسن ہوتی ہے۔ وہ اسی محاسن کے زیر اثر ہر طرح سے ”مہر و“ کا خیال رکھ رہی تھی۔ اپنی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود اس سے باتیں کرتی تھی کوئی خوراک کتنی مقدار میں لینی چاہیے اور کوئی چیز آنے والے وجود کے لیے فائدہ مند ثابت ہو گی، وہ ہر بات کا دھیان رکھتی تھی اور پھر رات کے پچھلے پہر وہ اپنا آپ مہر و کی جگہ رکھ کر خوش فہمی کے بستر پر سو جاتی تھی۔

اس دن وہ مارکیٹ سے لوٹی تھی ڈھیر ساری شاپنگ کر کے۔ چھوٹے چھوٹے فراکس، جرابیں، میجرز، ننھی مٹی چوڑیاں، ڈھیروں ڈھیر کھلونے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔ پانی پینے کے ارادے سے وہ کچن میں آئی تھی اور اسعد کو دیکھ کر رک گئی تھی پھر کچھ سوچتی ہوئی بے آواز قدموں سے اس کے پیچھے آن لگی۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اسعد جانے کس دھیان میں تھا یوں مخاطب کیے جانے پر ٹھٹک گیا اور اس کے ٹھٹکنے پر دیکھ کے تھقبہ آؤٹ آف کنٹرول ہوئے جا رہے تھے۔ اسعد نے اسے معصومی خشکی سے گھورا پھر خود بھی ہنس دیا۔ لابیٹ پر پل بکری کی ہاف سیلوئر شرٹ پر پلٹی شیڈ وڈ پہنے لیے وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ بالوں کو کپ نے جکڑ رکھا تھا۔

”کچھ نہیں مہر و کے لیے جوں نکال رہا تھا تم لوگی۔“ ٹن کی ٹوپ کھینچ کر گلاس میں جوس اٹھیلے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی باہر نکل گیا تھا۔ اس کا رخ مہر و کے بیداروں کی جانب تھا۔

”دیکھ وہیں کھڑی رہی، خاموش، متشکر، عجیب بات تھی یہی کام اسے کرنا تھا مگر اسعد کو تار دیکھ کر وہ پریشان ہی ہو گئی تھی۔

اس وقت بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھی وہ جینٹل پر چیئر بدل رہی تھی لیکن ذہن پوری طرح سے ان دونوں میں اٹکا ہوا تھا۔

”دیکھ! میں اور مہر و واک کے لیے جا رہے ہیں تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

اس نے مڑ کر دیکھا۔ مہر و عورت کا مکمل سراپا لیے اسعد کے پہلو میں ہنسی مسکراتی کھڑی تھی۔ دیکھ کے ہاتھوں میں خفیف سالرزہ طاری ہو گیا۔ وہ دونوں ایک مکمل تصویر کی مانند لگ رہے تھے۔

”تو کیا اس پہلو میں اب میری جگہ نہیں رہی۔“ اس نے سوچا اور آنکھوں کے سامنے وہ پہلا پھل دکھایا
جب اس نے مہرہ سے کہا تھا۔

”مہرہ میں اور اس حد زہر کے لیے جا رہے ہیں تم چنچ کر کے سو جاؤ۔“

”کہاں کھو گئیں یار..... چلو نا..... تم بھی فریش ہو جاؤ گی۔“ صوفے کی بیک پر رکھا ہاتھ کھینچتے ہوئے
اسعد نے کہا تھا۔ وہ رخ موڑ گئی۔

”نہیں سعدی! میرا موڈ نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ۔“ اس کا دل چاہا کہ کاش اسعد اصرار کرے مگر
اوکے جیسی تمہاری مرضی کہہ کر چلا گیا تھا۔ نصف فرشتے کے آنے میں کچھ دن ہی باقی رہ گئے تھے اور وہ اسعد
کے ساتھ شاپنگ پر جانا چاہتی تھی مگر اسعد کے پاس ٹائم نہ تھا اور اب مہرہ کے لیے مصروفیات میں سے بچے
لئے کشید کیے جا رہے تھے۔ دیجہ کے دل میں ایک بار پھر حسد و شک کی آبی سی اترتی چلی گئی۔

+

گماں یہ بے ثباتی کا

یقین بن کر ہر لمحے

بڑی شدت سے میرے ذہن کا دامن ہلاتا ہے

یہی باد کرنا ہے

کہ حرف و لفظ کا جتنا اٹا ہوا تھا

فنا کی سرحدوں پر ہے

خمن چپائی کا سارا نقا خروٹے کو ہے

محبت روٹنے کو ہے

اسعد مہرہ کو اس کی ماں سے ملوانے لے گیا تھا اور وہ ایک بار پھر اپنی تنہائی پر ماتم کناں تھی۔ ایک چمن
تھی جو خون کے ساتھ ساتھ سارے بدن میں گردش کرتی پھر رہی تھی۔ اضطراب تھا جو روح کو گھائل کیے
دے رہا تھا۔ چنانچہ کیوں آج وہ پہلی بار اپنے کئے پر پشیمان ہوتے ہوئے اسعد کی وفائیں خود کو یاد کرنا
رہی تھی۔ حسد ہر چیز پر بھاری ہوتا ہے۔ مرد جب حسد کرتا ہے تو عورت کو مقید کر لیتا ہے اور جب عورت حسد
کرتی ہے تو مرد کو مقید کرنے کی آرزو میں خود کو رول دیتی ہے۔ جنون کی آخری حدود کو چھوتے ہوئے ہر
کام کر گزرتی ہے جو گناہ کے دمرے میں آتا ہے۔ مہرہ سے کوئی بھی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بہت سے
رشتے انہیں جکڑے ہوئے تھے۔ پہلا رشتہ وہ تھا جسے زمانہ ”سوکن“ کے نام سے جانتا ہے اور یہی رشتہ اپنی
سب کی بنیاد تھا۔ دوسرا رشتہ یہ تھا کہ وہ اس کی شوہر کی اولاد کو جنم دینے والی تھی۔ یہ رشتہ یوں اہم تھا کہ وہ

کے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ تیسرا اور آخری رشتہ حسد کا تھا۔ جلن کا تھا جس نے شک کی کوکھ میں
پرورش پائی تھی۔

پہلے جس بچے کے آنے کے وہ دن گن رہی تھی اب اسی سے متنفر ہو چلی تھی۔ یہ یقین کامل ہو چکا تھا
کہ اگر مہرہ النساء ماں بن گئی تو وہ خود اسعد کو کھو دے گی اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

+

ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس نے مہرہ النساء کو دیکھا جس کی رنگت میں زردی کا مزید اضافہ ہوتا
جا رہا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار میں کسی قدر شدت آ گئی تھی۔ اسکرین پر دوبارہ نظریں نکاتے ہوئے
اس نے اپنے ذہن میں کچھ سی پکٹی محسوس کی۔ منزل بس چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس نے سوچا قلعہ
مسار کیا جاسکتا ہے۔

”اوکے مہرہ! میں اپنی فرینڈ کی طرف جا رہی ہوں۔“ وہ ریموٹ کاؤچ پر پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑی
ہوئی۔ اس کے کہنے پر مہرہ کے چہرے پر گھبراہٹ ابھرائی تھی۔

”وہ..... میں نے..... آپ سے کہا تھا نا۔“

”کیا کہا تھا بھئی۔“ وہ جانتی تھی مگر یوں بن گئی گو کچھ خبر ہی نہ ہو۔

”مم..... مجھے کچھ..... درد ہو رہا ہے..... شاید آج ہی..... آپ آج مت جائیں شاید..... ہاسپٹل
جانا پڑے۔“

”شاید نہیں یقیناً جانا پڑے گا مہرہ لی۔“ اس نے سوچا جبکہ مہرہ کہہ رہی تھی۔

”ڈاکٹر کی دی ہوئی تاریخ سے تو دور روز پہلے ہی اوپر ہو چکے ہیں آپ..... آپ سمجھ رہی ہیں نا۔“ مہرہ
کی آواز میں تکلیف تھی، الجھن تھی۔ شاید وہ اپنی کیفیت سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔

”میرا جانا بہت ضروری ہے مہرہ! اب میرا انتقال ہو چکا ہے ہوگی۔“ اس نے اپنی فرینڈ کا نام لیا تھا پھر مہرہ
کی نگاہوں میں اتحاد دیکھ کر بولی۔

”میرا جانا بہت ضروری ہے ورنہ بیان راض ہو جائے گی لیکن تم..... اچھا میں فاسٹ ڈرائیو کرتی ہوئی
جاؤں گی اور اسے تمہاری بابت بتا کر واپس آ جاؤں گی۔ اب تو خوش ہو۔“ بکری ڈھے چکی تھی اور وہ چھری
کو مزید تیز کر رہی تھی۔ مہرہ کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور مہرہ کا گال تھپتھا کر
باہر آ گئی۔ پورچ کی طرف جانے سے پہلے وہ انٹرنس کا دروازہ لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔ اب وہ سڑکیں
ناپنے کے لیے تیار تھی اور اس دوران اسے ایک بار بھی ننھے نوار کا خیال نہیں آیا تھا۔

+

”وہ مجھے مار ڈالے گی وہ مجھے مار ڈالے گی۔“

آپریشن تھیز کی سانسے والی دیوار سے ٹیک لگائے وہ ایک ہی فخرے کی بازگشت سن رہا تھا۔ نعرہ دروازے کے عین اوپر لگی سرخ بتی پر لگی تھیں جس کا جلنا بجھنا بھرپور خطرے کو ظاہر کر رہا تھا۔ اسی قسم کی شاعیں ایک ایک تواتر سے اس کی آنکھوں میں پھلتی جا رہی تھیں۔ سینے پر بازو لپیٹے وہ اپنے دل میں ایک دم محسوس کر رہا تھا۔ کاریڈور میں آتے جاتے لوگوں کو وہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاں وہ فقط ایک نظر اسے دیکھتا تھا جو اس کی نسل کے آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ موت کو مات دینے کی سعی کر رہی تھی۔ آج تک اس نے نظر بھر کر محض اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ مبادا دیچہ سے بے وفائی کا مرتکب ٹھہرے۔ حقیقت تھی کہ اسے دیچہ سے بے انتہا محبت تھی اور اسی محبت کے طفیل وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار تھا۔

وہ گہرا ہٹ تھی جو اسے گھر کھینچ لاتی تھی۔ کیٹ ان لاکڈ تھا اور انٹرنس ڈور لاکڈ تھا۔ اسے کچھ حیرت ہوئی تھی اور پہلا دھیان مہر کی طرف ہی گیا تھا۔ اسے معلوم تھا ڈیوری کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ڈاکٹر اس مینیے کی بارہ تاریخ دی تھی اور آج تو چودہ تاریخ ہو چکی تھی۔ وہ لیڈر گڈز کا کام شروع کرنے والا تھا۔ لوکیشن کے انتخاب اور خرید کے سلسلے میں جن لوگوں سے بات ہوئی تھی انہیں آج ہی انکلیشن فلائی کرنا تھا۔ لہذا ان سے بھی ملنا ضروری تھا اور اس کے بعد ایک اپورٹنٹ مینٹگ تھی۔ اسی دوران کچھ ایسا ہوا تھا کہ کادل غیر معمولی انداز میں دھڑکنے لگا تھا پہلے تو وہ ناٹار ہا پھر گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مسلسل آگ ٹون آ رہی تھی۔ اب آفس میں بیٹھے رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا تب اس نے مینٹگ کی نسل کی اور گھر کیا جہاں اس لئے ہو کا سامعالم تھا۔

چوکیدار کچھ دن سے چھٹی پر تھا۔ وہ کچھ لمبے وہیں کھڑا ہا پھر گاڑی کی طرف آ گیا۔ فرنٹ بینڈ بیٹھ کر وہ سیٹنی سیٹ باندھ رہا تھا جب ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا ایک آواز تھی بہت مدہم اس نے غور سے سننے کی کوشش کی پھر جیسے وہ تمام تر حیات بیدار ہو گئیں، وہ گاڑی سے نکل آیا اور آواز کے تعاقب میں گلی کی طرف آ گیا۔ یہ گلی گھر ہی کا الگ تھلگ حصہ تھی، گھر کے پچھلے حصے کی ایک کمر کی طرف نکلتی تھی۔ گلاس ڈور کے دوسری طرف اسے جو کچھ نظر آیا وہ بے حد غیر یقینی تھا۔ اس نے گلاس پر ہاتھ رکھ کر مہر و کوسلی دینی چاہی پھر تیزی سے پورچ کی طرف آ گیا۔ اس کے پاس انٹرنس کی ڈپلکیت چابی تھی کہاں یہ اسے معلوم نہ تھا۔ کوٹ کی جیبیں کھانگتا وہ گاڑی کی طرف آیا تھا ڈیش بورڈ پر بھی چابی نہ تھی۔ نے بریف کیس کھول کر سیٹ پر الٹ دیا اور بلا خرہ چابی مل گئی۔ وہ جتنی جلدی کر رہا تھا اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ سیزجیوں میں رکھے کپلے سے ٹھوکر کھائی تھی۔ چابی ہاتھ سے نکل کر لان کے گھاس میں کھو گئی تھی اس

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس لمحے جیسے مفقود ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر چابی تلاش کی۔ کانپتے ہاتھوں سے لاک کھلی ہی نہیں رہا تھا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ اس سا مضبوط اعصاب کا بندہ بھی ڈرگیا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی گیس کی نہایت ناگوار بو اس کے منتھوں سے ٹکرا کر سانسوں میں اتر گئی تھی۔ وہ پروا کیے بغیر مہر و تک پہنچا تھا جو تکلیف کی شدت سے غڑھال ہوئی جا رہی تھی۔ اسعد نے اسے بازوؤں میں بھر کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا تھا اور بہت ریش ڈرائیو کرتے ہوئے، اگلی پچھلی گاڑیوں اور ٹریفک سنکڑ کی پروا کیے بغیر ہاسپل پہنچا تھا۔ اس کے اعصاب چٹخے ہوئے تھے اور وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا اور کیسے ہوا ہے۔ مہر و آپریشن تھیز میں تھی اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔

”بہت دیر ہو چکی ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں کی جان خطرے میں ہے۔“

اور تب سے اب تک وہ یونہی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایک ایک ورق الٹا جا رہا تھا۔ ایک ایک پیچ کھل رہا تھا گزرے دنوں کے کتنے ہی پل فلم کی طرح اس کے سامنے چل رہے تھے۔ کچھ دیر قبل دیچہ نے موبائل پر کاٹیکٹ کیا تھا۔ اسعد اس کی آواز سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ انٹرنس ڈور لاک کرتے وقت سوئی گیس کا والوس نے کھول دیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کا متنی بھی نہ تھا لیکن اس کے باوجود ہاسپل کا نام بتا کر اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس لمحے صرف مہر و تھی باقی ایک مہیب چپ تھی ایک خلا تھا۔ طویل خلا ذہن و دل پر جیسے دھند چھائی ہوئی تھی جس کے زیر اثر وہ دعا بھی نہیں کر پا رہا تھا بھی اس نے اپنے نزدیک ایک آواز سنی لیکن اس کی طرف دیکھا نہ تھا۔

اس نے ایک بار پھر اسعد کو پکارتے ہوئے اس کا کندھا بلایا تھا تب اس نے ذرا سی گردن موڑ کر دیچہ کی طرف دیکھا تھا۔

”مم..... مہر و؟“ اسعد کی نگاہوں کی سرد مہری نے اسے گڑبڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسعد نے گردن موڑ کر نظریں واپس آپریشن تھیز کے دروازے پر نکادیں اور بولا۔

”آپریشن تھیز میں ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے اس کی جان خطرے میں ہے۔“

اس کا لہجہ آنکھوں جیسا ہی ٹھنڈا ٹھار تھا۔

”یو ڈونٹ وری اسعد! اسے کچھ نہیں ہوگا ہم..... ہمارا بے بی بالکل ٹھیک ہوگا۔“

اب اسعد نے جھٹکے سے گردن اس کی طرف موڑ لی تھی۔ وہ کیسی مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ کیا وہ اپنے کئے پر شرمندہ نہیں ہے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اور کہنا چاہتا تھا۔ ”صرف بچہ ہی نہیں بچے کو جنم دینے والی کی جان بھی خطرے میں ہے۔“ لیکن وہ نہیں کہہ پایا تھا کیونکہ ڈاکٹر نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔

”دیری سوری مسٹر اسعد! آپ نے مریضہ کو لانے میں بہت دیر کر دی تھی..... ہم نے پوری کوشش کی

لیکن ہم انہیں نہیں بچا سکے۔“ ڈاکٹر تسلی آمیز نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ اسحد کی نگاہیں ڈاکٹر کے ہر ماؤں سے ہوتی ہوئی بند ہو گئیں۔ گردن ہڈ حال ہو کر پیچھے کی طرف لڑھک گئی تھی۔

+

اس نے بڑی محبت سے براؤن کبل میں لپٹے اس ننھے وجود کو دیکھا تھا اور جھک کر اس کے چھوٹے پھولے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔ دودن تک بچی کو I.C.U. میں رکھا گیا تھا کیونکہ سوئی گیس نہ بچی کی سانس کی نالی کو کسی قدر متاثر کیا تھا۔ پیدائش کے تین دن بعد ڈاکٹر نے اسے گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور آج مہر النساء کا سوئم تھا۔ ڈیڈ باڈی اماں وزیراں کے گھر پہنچا دی گئی تھی اور وہاں تجبیر و تکفین کا سارا کام ہوا تھا۔ ایک بار پھر وزیراں کا منہ نوٹوں کی گڈیوں نے بند کر دیا تھا۔ اس دوران ایک بار اس کے گھر بھی گئی تھی اور جلد ہی بچی کا بہانہ بنا کو لوٹ آئی تھی۔

وہ خوش تھی بے انتہا خوش۔ سانپ مر گیا تھا اور لاٹھی صحیح سلامت تھی۔ کوئی دہنی خلش نہ تھی۔ کوئی غم نہ تھا وہ یوں مطمئن تھی جیسے یہ سب یونہی ہوتا تھا۔ بچی کو کات میں لٹا کر وہ اسٹڈی روم کی طرف آگئی جہاں اسحد ایزی چیئر پر جھول رہا تھا۔ اپنی خوشی کی بدولت اسے اسحد کی سرد مہری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا آنکھوں کے بدلے ہوئے رنگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں اس کی خاموشی کو دیکھنے والے نے محسوس کیا تھا۔ ”کیسے مرنے پر افسوس تو ہوتا ہے نا۔“ کہہ کر اس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم دھرتی اس کا پشت پر آرکی پھر اس کی گردن میں بازو ڈال کر ٹھوڑی اس کے بالوں پر رکھ دی تھی۔

”وہ سو گئی؟“ اسحد نے پوچھا تھا۔

”ہاں سو گئی۔“ اس کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر وہ ننھا وجود آ گیا تھا وہ محسوس کر اسحد کے سامنے آئی اور کرکی کی ہتھی پر بیٹھ گئی تھی۔ بازو ابھی بھی اس کی گردن کے گرد جاملے تھے۔

”تم نے دیکھا ہے اسحد! وہ کتنی پیاری ہے اور اس کی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔ بالکل تھملا طرح..... میں اس کا نام اجالا رکھوں گی یا پھر سویرا..... مجھے لگتا ہے اس کے آنے سے ہر طرف روشنی ملنا گئی ہے۔ سویرا ہو گیا ہے۔ اجالا پھیل گیا ہے۔“

”نہیں دیکھ! میں اس کا نام سویرا رکھوں گا اور نہ اجالا۔ بلکہ میں اس کا نام مہر و رکھوں گا صرف۔“ صرف مہر النساء۔“ اپنی گردن سے اس کے بازو الگ کرتے ہوئے اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔ نظریں اس کے چہرے پر گاڑی تھیں۔ ان نظروں کا مفہوم دیکھنے کی سمجھ سے بالاتر تھا لیکن وہ گزرباگئی۔

”ہاں..... اچھا نام ہے مہر و..... النساء“

”جاؤ دیکھ اور اس بچی کو غور سے دیکھو۔ اس کی آنکھیں مجھ سے نہیں بلکہ مہر النساء سے ملتی ہیں۔“

کی تاک اور ہونٹ بھی مجھ جیسے نہیں ہیں وہ ہو پناہی ماں جیسی ہے۔“ اس کا لہجہ بہت بے تاثر سا تھا۔

”ہاں..... شاید..... میں نے غور نہیں کیا۔“ دیکھ جینپ مٹانے کو ہولے سے ہنسی تھی۔

”مجھے اعزاز ہے اسحد! تم بہت دکنی ہو اور اس کی موت پر..... مجھے بھی بے حد افسوس ہے۔ مگر شاید اس کی موت یونہی آئی تھی۔“ وہ چپ ہوئی پھر بولی۔

”وہ اچھی تھی بے حد اچھی..... دیکھنا جاتے جاتے ہمیں ایک بیٹی دے گئی۔“

”ہمیں نہیں..... مجھے ایک بیٹی دے گئی۔“ اس نے دیکھ کی بات نہایت سہولت سے قطع کی اور اپنی بات پر زور دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں..... میں سمجھی نہیں..... اسحد۔“

اسحد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ وہ اسٹڈی ٹیبل تک چلا گیا تھا۔

”یونو دیکھ! ڈیوری سے چند روز قبل مہر و کی دہنی حالت کچھ عجیب ہو گئی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ تم اسے کھانا نہیں دیتے اور اسے مارتی ہو اور یہی کہ تم اسے جان سے مار ڈالو گی۔“ وہ دروازے سے کچھ نکال کر اس کے سامنے آن رکھا تھا۔

”لیکن میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا یقیناً یہ مجھے تم سے متفر کرنے کی کوئی کوشش ہے۔ میں نے سوچا تھا دیکھ کہ میری دیکھ ایسی ہو ہی نہیں سکتی وہ تو بہت نرم دل ہے۔“ دیکھ کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے اس بچ پر بار بار سوچا تھا ہر سوال کا جواب تیار تھا۔ اسحد اس بات پر فخر رہا تھا لیکن آنکھوں کے تاثرات بہت عجیب سے تھے۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی۔ اسے خاموش دیکھ کر اسحد نے پشت پر بندھے ہاتھ کھولے اور دیکھ کا ہاتھ پکڑ کر ایک لفافہ تھما دیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”خود دیکھ لو مگر اس سے قبل مجھے ایک سوال کا جواب چاہیے۔“ دیکھ لفافے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

”سوئی گیس کا والوکس نے کھولا تھا دیکھ! تم نے..... ہے نا؟“ اسحد کا لہجہ بے انتہا سخت تھا۔ وہ ”ناں“ کہنا چاہتی تھی مگر زبان تالو سے چٹ گئی۔

”بتاؤ دیکھ! والوکس نے کھولا تھا نا؟“ وہ حلق کے بل چٹکھاڑا تھا۔ دیکھ پیچھے ہٹ گئی مگر بازو مضبوط آہنی گرفت میں تھا۔ ہاں نہیں یہ خوف تھا، گھبراہٹ یا احساس جرم کہ وہ بولتی ہی چلی گئی۔

”میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی..... آئی سویر میں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر.....“

”مگر تم نے اسے مار ڈالا۔“ اسحد نے اس کی بات ایک بار پھر قطع کر دی تھی۔

”تم نے اسے مار ڈالا دیکھ اور تمہیں ایک بار بھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ تم کتنا بڑا گناہ کرنے جا

رہی ہو۔ ایک نہیں بلکہ دو، دو جانوں کو تم نے کتنی آسانی سے خطرے میں ڈال دیا۔ تم اس حد تک خود غرض رہے جس ہو سکتی ہو مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ اسعد نے ملاحتی انداز میں اس کا بازو جھٹک دیا تھا۔

”تم مہر کو مارنا نہیں چاہتی تھیں لیکن تم نے اسے مار ڈالا اور میں.....“ اس نے توقف کیا اور بولا۔

”اور میں تمہیں اپنی زندگی سے نکالنا نہیں چاہتا تھا مگر نکال رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت عام سا تھا لیکن دیکھ کر اندر تک دہلا گیا۔

”تمہاری آنکھوں اور دل پر حسد کا اتنا گہرا پردہ پڑ چکا ہے دیکھ کہ شاید اس پردے کے پیچھے میں بھی کہیں کھو جاؤں گا۔ اسی لیے میں اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کچھ عرصے بعد جب اس کے چہرے میں مہر النساء کا عکس واضح ہو تو تم اس کا بھی وہی حشر کرو جو اس کی ماں کا کیا ہے۔ مائیں وحشی نہیں ہوتیں دیکھ، شاید اسی لیے خدا نے تمہیں ماں نہیں بنایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایک ایسی لڑکی کو چاہا جس کے لیے صرف اس کا اپنا آپ اہم ہے جو کوئی بچہ اس لیے ایذا پہن کرنا نہیں چاہتی کہ وہ کسی کا گناہ بھی ہو سکتا ہے۔ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں دیکھ عباس! گناہ و ثواب سے مبرا۔“

اسعد نے اس سے اپنے نام کا مان بھی چھین لیا اور اب وہ خاموش تھا۔ کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔

”یہ مگر تمہارا ہے۔ اس گھر کی ایک ایک چیز تمہاری ہے۔ حق مہر کی رقم میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرادی ہے۔ میں اب تمہارے نام کے ساتھ اپنا نام بھی بڑا رہنے نہیں دینا چاہتا ہوں۔ یوں بھی بے حس و خود غرض لوگوں کو تنہا ہی رہنا پڑتا ہے۔“

”کیا تم مجھے معافی مانگنے کا ایک موقع بھی نہیں دو گے اسعد۔“

”معافی..... کس سے مانگو گی دیکھ! مہر تو مر چکی۔“ اسعد کے لہجے میں دکھ بہت تھا۔

”اور مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے ہر تعلق توڑ چکا ہوں۔ بیوی دیکھ! میں تم کو کبھی نہیں بھولوں گا کیونکہ تم وہ واحد عورت ہو جس سے میں نے بے انتہا محبت کی ہے اور اب..... بے انتہا نفرت بھی.....“

دیکھ کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ گرنے کے سے انداز میں زمین پر دوڑا تو بیٹھ گئی وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے اشک سینٹا چاہتی تھی لیکن وہ بکھرتے چلے گئے۔ گود میں رکھے ہاتھ اس برسات میں بے طرح بھیگ رہے تھے۔ اسعد نے اسے تاسف سے دیکھا اور بولا۔

”میرا مقصد تمہیں ہرانا نہیں دیکھ! لیکن اب میں تمہارے ساتھ کسی صورت نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ تمہارے دل سے مہر کی نفرت نکل جائے لیکن تم ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ تمہارے لیے صرف تمہارا اپنا آپ مقدم رہا۔ تم نے ہمیشہ اپنی ذات کو اہمیت دی اور اگر آج تم خالی ہاتھ ہو تو بھی محض اپنی

ہی وجہ سے..... میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ تم پرسکون زندگی گزارو اور ضمیر کی چیخیں تمہیں سونے دے۔“

اس کی نظریں ابھی بھی اپنے ہاتھوں پر تھیں۔ مضبوط قدموں کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی اور خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو زور سے زمین پر پٹخا اور روتی ہی چلی گئی۔ اس کی سسکیاں فضا میں بکھرتی جا رہی تھیں۔ کمرے کے کونے میں بیٹھی نحیف و زار محبت نے اس کو تاسف و ہمدردی سے دیکھا اور آنکھیں موند کر ابدی نیند سو گئی۔

ہوتا ہے..... یوں ہی ہوتا ہے اپنے لیے محل تعمیر کروانے والے ہمیشہ اسی میں نہیں رہتے۔ وہ دوسروں کے لیے گڑھے کھودتے ہیں اور بالآخر ان میں گر جاتے ہیں اور ضروری تو نہیں کہ ہر داستان اپنے اختتام میں راجا رانی کو ہنستی مسکراتی زندگی دے جائے۔ آنسو تو ان کے مقدر میں بھی ہوتے ہیں۔ رونا تو راجا رانی کو بھی پڑتا ہے۔

اسے کیا تھا تو زیر اثر خود کشف بھی تھی۔ اس کا متوشل چہرہ اور متورم آنکھیں مخفی تو نہ رہی تھیں۔ عجیب بات تھی تاکہ سر کشف آذر کمال، آذر کمال سے یاور بن سہیل کی وجہ سے خفا تھی۔ اس ایک خیال کے ساتھ ہی اس کی انگلیاں بے اختیار بچھن گئیں۔

یاور بن سہیل۔ کشف کا کیا تھا؟ کچھ نہیں جبکہ آذر کمال اس کا سب کچھ تھا، پھر بھی..... پھر بھی اتنے قائلے..... اتنی مخفی..... اتنی دوری اور اجنبیت صرف اور صرف یاور بن سہیل کی وجہ سے۔

کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ وہ پاکستان آیا۔ اس نے کشف حسام کو دیکھا اور شادی کر لی۔ یہاں تک کوئی الجھاؤ نہ تھا کہ کشف اس کے مرحوم تایا کی بیٹی تھی۔ کینیڈا کی ایک ملٹی نیشنل فرم میں وہ چیف ایگزیکٹو کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا اور پچھلے دو سالوں میں پہلی بار تین ماہ کی لیو پر پاکستان آیا تھا۔ منگنی کے بعد ظاہر ہے کہ شادی بھی ہوئی تھی اور یہاں بھی کسی نے نعرہ اعتراض بلند نہیں کیا تھا سوائے کشف کے۔ منگنی کے بعد پہلی بار اس نے خود آذر سے کانٹیکٹ کیا تھا اور یہ بات اس کے لیے باعث خوشی یوں تھی کہ اس نے قتل یہ کام وہ خود کرتا رہا تھا۔ جہاں وہ خوش ہوا تھا کشف کی اگلی بات سن کر جھلا گیا تھا۔

”دور در بعد تو یاور بھائی جا پاں جا رہے ہیں۔ انہیں ان کی فرم کی جانب سے چھ ماہ کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تم خود سوچو آذر۔ یاور بھائی کی غیر موجودگی میں ہماری شادی کیسے ہوگی۔“

”یاور بھائی نے کیا ہمارا نکاح پڑھوانا ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں ہماری شادی نہ ہو سکے گی۔“ وہ تیزی و تندہی سے بولا تھا۔

پہلی بار اسے یاور بن سہیل کے نام سے چڑھائی تھی۔ جس کا مختصر تعارف فقط اتنا ہی ہے کہ وہ تایا جان کے کسی مرحوم دوست کا بیٹا تھا۔ قریبی رشتے داروں کے منہ موڑ لینے کی بنا پر بارہ سال کی عمر سے اس گھر میں تھا اور تایا جان کے انتقال کے بعد سے وہ اس گھر کا بڑا بیٹا ہونے کا حق ادا کر رہا تھا۔ پھر ایک اور تعارف یوں تھا کہ وہ اس گھر کا ہونے والا بڑا داماد تھا۔ تایا جان نے اپنی زندگی میں ہی ماہ نور کو یاور سے منسوب کر دیا تھا۔

پھر وہی ہوا جو آذر نے چاہا۔ یعنی شادی اور شادی کے ٹھیک ایک ماہ بعد وہ کشف کو لے کر کینیڈا آ گیا جسے پاکر اسے زمین و آسمان اپنی منگی میں مقید لگنے لگے تھے۔

اس روز موسم بے حد خوشگوار تھا۔ بخ بے فضاؤں میں سورج کی نرمابٹ نکھری ہوئی تھی اور وہ ہفتہ وار تعطیل کا بھرپور لطف لے رہا تھا۔ کشف اس کی فرمائش پر کافی بتالائی۔ پھر ساتھ ہی بڑا سا الم بھی کیبنٹ سے نکال لیا۔

”آج مجھے سب گھر والے بہت یاد آ رہے ہیں۔“ کشف کی رودنی صورت دیکھ کر وہ ہنس دیا۔ پھر الم دیکھنے لگا۔ جس میں جابجا یاور بن سہیل کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک کا سارا کلکیشن موجود

راکھ

وہ کب سے لان اور برآمدے کی درمیانی سیزھیوں میں بیٹھا تھا۔ کہنیاں گھٹنوں پر لگی تھیں جبکہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں نے ایک دوسرے کو یوں جکڑ رکھا تھا گویا آج دونوں ہتھیلیوں کا آپس میں پیوست ہو جانے کا ارادہ ہو۔ آنکھیں کسی ان دیکھے نقطے پر لگی تھیں اعصاب میں ایک واضح محسوس کیا جانے والا کھچاؤ اور پیشانی پر ان گنت لکیروں کا الجھا ہوا جال تھا۔

آسمان سیاہی مائل سرمئی بدلیوں کی لپیٹ میں تھا اور ہوانے تو شاید آج زمین کا رخ نہ کرنے کی تم کھائی تھی۔ عجیب طرح کا لالہ یعنی ساکوت اور جس چہرہ سو چھایا ہوا تھا اور اس کے اندر گویا لاؤڈن تھا۔ کپٹنی پر ایک پسینے کی دھار مسلسل بہہ رہی تھی اور جڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمائے گویا وہ مضبوطی کی انتہائی حدود سے گزر رہا تھا۔

اسے غصہ اس بات پر نہیں آ رہا تھا کہ کشف اس سے خفا ہے بلکہ اصل غصہ اس بات پر تھا کہ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے لیے خفا ہے جو اس کا کچھ بھی نہیں ہے۔

اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے شکنجے سے آزاد کیا اور ہتھیلی اپنے سامنے پھیلا لی۔ انہی آہنی ہاتھوں نے بار بار کشف کے نازک مرمریں ہاتھوں کو اپنی قید میں لیا تھا۔ بار بار اس نے کشف کو اپنے دل سے وجود تک محسوس کیا تھا اور پچھلے پانچ دن سے اس نے کشف کی آواز تک نہ سنی تھی سارے گھر میں فقط ایک آواز گونجتی رہی تھی اور وہ تھی ان کی ننھی سی بیٹی محرقے ہٹنے پھر رونے کی آواز..... خود اس نے کئی بار بحر کے حوالے سے اس جنگ کو ختم کرنے کے مواقع پیدا کیے مگر کشف جان بوجھ کر انجان رہی۔

اس سے قتل وہ خود صبح سویرے اسے آفس جانے کے لیے جگاتی تھی۔ آفس کی تیاری میں اس کی مدد کرتی تھی۔ اس کے لیے ناشتیاں کرتی تھی۔ پھر لپچ اور ڈر زکا معاملہ بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھا۔ مگر پچھلے چار بلکہ پانچ دنوں میں ان دونوں کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار آپوں آپ تن گئی تھی۔ جس نے اگر مضطرب

”بیار۔“ آذر اس کے پیچھے آن رکا ”اور وہ بھی صرف مجھ سے۔“ اس کی کمر کے گرد اپنے بازو حائل کرتے ہوئے آذر نے ٹھوڑی اس کے شانے پر رکھ دی تھی۔ کشف کی نگاہوں میں حد درجہ تحیر اُٹھ آئی تھا۔ اس نے آہنیہ میں نظر آتے آذر کے گس کی نگاہوں میں جھانکا۔

”تم..... پاگل ہو آؤ؟“ اگلے ہی پل وہ ہنس دی تھی۔ نجانے کیوں اور آذر کمال کے پاس اس کے

سال کا لے حد مربوط جواب موجود تھا۔

اس سوال کا بے حد مربوط جواب موجود تھا۔
 ”ہاں میں پاگل ہوں اور صرف تمہارے لیے۔“ وہ اس کی مہکتی زلفوں سے الجھ گیا تھا اور کشف کے
 بے ساختہ قہقیرے اس کے اندر تک تراوت اُتار گئے تھے۔

اولاً کشف اس کی پسند تھی۔ گھنٹوں کے فرق سے محبت بنی پھر بیوی اور اب؟..... اب وہ اس کا عشق تھی اسے اس نغمے میں وجود سے بھی زیادہ عزیز تھی جو چند مہینوں کے وقفے سے اس دنیا میں اس کی محبت اور اس کے قانونی ورثے کا حقیقی روپ لے کر دنیا میں وارد ہونے والا تھا۔

وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پایا تھا اور نام دینا چاہتا بھی نہیں تھا کہ اس کے خیال میں یہ ایک احقانہ سوچ تھی مگر وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ جب کبھی کشف یا در سے فون پر بات کر رہی ہوتی تھی یا کبھی اس کے ساتھ چیننگ پر گھنٹوں صرف کرتی تھی تو نجانے کیوں وہ مضطرب سا ہو جاتا تھا۔ دل بالکل سمندر بن جاتا جس کی وسعتیں کسی بڑے سے گرداب کی زد میں ہوتیں کشف کی باتوں میں یاد رہن سہل کا حوالہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے درخت کے لیے جڑ ناگزیر۔

اس روز کشف کے ویلگی چیک اپ کے بعد آذر نے اس کی عجیب سی کیفیت کو وہیں ہاسپٹل میں ہی بھانپ لیا اور واپسی پر جب استفسار کیا تھا تو وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر بے اختیار رو دی تھی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آذر۔“ واقعی سراسیمگی اس کے ہر ہر انداز سے مترشح تھی اور آج سے نہیں بلکہ کئی دن سے۔ آذر نے بے اختیار بازو پھیلا کر اسے خود سے نزدیک کر لیا تھا کشف کو شاید اس سہارے کی ضرورت تھی اس کے شانے سے سر نہا کر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ آذر نے اس کے وجود کا ارتعاش اپنے دل تک محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا پھر ڈاکٹر نے بھی تو یہی کہا تھا کہ پریگنٹنسی کے دوران ہر عورت، معمول سے ہٹ کر حساس ہو جاتی ہے۔

آذر نے اسٹیرنگ ویل پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پہلے احتیاط سے موز کا نا پچھ کار کی رفتار قدرے دھیمی کر کے بہت نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا تھا۔

”سہیں ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت بالکل بھی نہیں ہے، انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر نے بھی تو کہا ہے کہ کوئی Complication نہیں ہے اور پھر میں بھی تو تمہارے لیے دعا کر اؤں گا شفا۔“ ایک بار پھر اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے تسلی دی۔ کبھی کبھار وہ موڈ میں ہوتا تو اسے

”یہ گھروالوں میں صرف یاد شمار ہوتے ہیں۔“ اس نے سادگی سے دریافت کیا تھا بس یونہی کہاں کی یاد سے انیسیت سے بخوبی آگاہ تھا وہ بس دی جھپٹ کر۔

”بعض باتوں اور بعض جذبوں کی وضاحت کرنا خاصا مشکل کام ہے اور میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں وضاحت دینا ہمیشہ مشکل لگتا ہے۔“

”یہ وضاحت کسوں نے یہاں کہاں سے آگئی۔“ الہم کو صفحہ در صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے سرسری سی نگاہ کشف پر ڈالی تھی۔

”مکسوٹی زر خیزد ہنوں کی پیداوار ہے اور کیا۔“ وہ ایک تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میں خود بھی نہیں جانتی کہ یاد بھائی میرے لیے کیا ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے لیے بہت کچھ ہیں۔ تم نے ابھی پوچھا تھا کہ کیا گھروالوں میں صرف یاد بھائی شمار ہوتے ہیں؟ تو اس کا جواب صرف اتنا ہے آؤ کہ وہ میرے سب ہی گھروالوں سے بڑھ کر ہیں۔ میں ان سے بے حد محبت کرتی ہوں..... بے تحاشا..... سب سے زیادہ۔“

اور آذر نے بے اختیار تصویر اس کے ہاتھ سے کھینچ لی تھی۔ کشف کا اتنے جذب سے کسی اور کے لیے محبت کا اظہار کرنا اس کے دل کو عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ کتنی محبت باریگا ہوں سے تصویر میں موجود اس بے تحاشا شاندار پرسنلٹی کے مالک شخص کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی لگاؤ سے اس کے لیے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ کتنے ہی جگنو تھے جو اس بل اس کی نگاہوں میں آن ٹھہرے تھے اور آذر کمال کا دل بل ایک بل کو چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ میں موجود اس تصویر کو انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے مسل ڈالے۔

”کیسی بیوی ہو مریا! اپنے ہینڈ س میاں کو چھو کر اپنی بڑی بہن کے ہونے والے سرتاج سے محبت کر رہی ہو اور وہ بھی بے تحاشا۔“ اندرونی بے جا اضطراب کو پا بے زنجیر کرنے میں اسے پل ہی لگا تھا اور اپنے دل میں اٹھنے والے اس بے نکلے ابال پردے دفعہ لغت بھیجتے ہوئے وہ سکر مختلف ٹون میں کشف سے مخاطب تھا اور اس کے اس انداز کو کشف ان چارہ میں بخوبی سمجھنے لگی تھی۔ تبھی بے حد اطمینان سے تصویر واپس الیم میں لگا کر الماری کے نچلے حصے میں کسی مقدس صحیفے کی طرح رکھ آئی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے ٹھہر کر اپنے بالوں کو مینڈر کی زد سے آزاد کروانے لگی۔ آؤرنے بے اختیار کش اسے کھینچ مارا تھا۔

”تمہاری باتیں مجھے حسد میں مبتلا کر رہی ہیں۔“ انداز کچھ کچھ تنبیہی، کچھ کچھ شریر سا تھا۔ بازو سہلاتی کشف نے اسے قدرے غصے سے گھورا تھا۔

”تو میں کیا کروں؟“

یونہی پکارا کرتا تھا۔ باقی کا راستہ آذر نے محض اس کا دھیان بنانے کی غرض سے بہت سی باتیں کرتے ہوئے گزرا تھا۔

”میری ایک بات مانو گے آذر۔“ کاران کے اپارٹمنٹ کے سامنے رکی تھی۔ جب کشف نکلتے ہوئے بڑی آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ فرنٹ سائیڈ کا دروازہ لاک کرتے ہوئے اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔

”دس باتیں مان لوں گا۔ تم کہو تو۔“ اس کا ہاتھ تھام کر وہ اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

”آذر! میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اپنوں کے درمیان انسان زیادہ سکون محسوس کرتا ہے میں بھی شاید۔۔۔۔۔ پلیز تم سمجھو نا آذر۔۔۔۔۔ وہاں سب لوگ ہوں گے امی، ماہ نور، چچی، فاریہ بھابی وغیرہ زیادہ مطمئن رہوں گی پھر اگر ڈیوری کے دوران مجھے کچھ ہو بھی گیا تو۔۔۔۔۔“

”تمہیں اللہ سمجھے شفا۔۔۔۔۔ کبھی تو غلطی سے ہی کوئی ایسی بات کر لیا کرو جو میرا دل خوش کر دے۔“ جی۔ تم نے بھی قسم کھائی ہوئی ہے کہ ہر بری اور بے نکی بات میرے سامنے ہی کرنی ہے۔“ وہ اسے ڈنڈا لاک کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ کشف اس کے پیچھے تھی۔

”اب اپنی باتوں میں الجھا کر تم مجھے اصل بات بھلا دو گے۔“ وہ شاکی ہوئی۔

”تم اگر بھول بھی جاؤ تو میں یاد رکھوں گا نا کیونکہ چند روز پہلے میں بھی کچھ ایسی ہی بات سوچا۔“ جب اپنی آنکھیں کھولے گا تو اس کے بھی اپنے اس کے قریب ہوں گے پھر میں چاہ رہا تھا کہ بابا امی کے کان میں اذان دیں۔“ اپنی اس بر ملا خواہش کا اظہار کرنے میں اس نے بل بھر کا توقف نہیں کیا تو کی بنیادی وجہ شاید لاشعوری طور پر یہی تھی کہ کشف نے ”سب لوگوں“ میں یاور بن سہیل کا نام نہیں لیا تھا ایسا ہوا ہوتا تو یقیناً وہ چاہنے کے باوجود کشف کو پاکستان نہ لایا ہوتا۔

کشف نے تو صرف چند ہیمنوں کے لیے آنے کی بات کی تھی مگر وہ یہیں مستقل سیٹل ہو جانے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ تبھی آتے ہی نوکری کے لیے تنگ دو شروع کر دی تھی۔ کینیڈین فرم کے تین سالہ تجربہ شاندرا کیڈمک ریکارڈ کی بنا پر اسے جلد ہی ایک پرائیویٹ فرم میں جاب مل گئی تھی۔ جبکہ بابا امی کا مشورہ فیکٹری کا چارج اس کے حوالے کرنا چاہتے تھے جو کہ وہ اپنے بڑے بیٹے شجاعت کے ساتھ پانڈر شاپ بنیاد پر چلا رہے تھے۔ آذر کے ذہن میں کہیں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ پانڈر شاپ دو بھائیوں میں تقسیم ڈالنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے تبھی اس نے نوکری کو ترجیح دی۔ پھر اس نوکری کے حوالے سے ملے مراعات بھی قابل قدر تھیں۔

بچے کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے ان کی پہلی ویڈیو ایڈیٹنگ ایڈیٹر سے کسی بڑے پیمانے

مٹانے کا خیال آذر نے خود ہی ذہن سے نکال دیا تھا اور وہ اسے آداری میں ڈنکروانے لے گیا تھا۔ اس روز وہ بہت خوش تھا مگر محض ایک بات نے سارا مودعارت کر دیا تھا۔ آذر کو تو کشف یوں بھی خوب صورت لگتی تھی پھر آج تو وہ بہت تنگ سے تیار ہوئی تھی۔ وہ دونوں کافی دیر تک اس گزرے سال کو یاد کرتے رہے اور پھر یونہی باتوں باتوں میں آذر نے اس کی تعریف کی تھی۔

”تم بہت اچھی لگ رہی ہو! سوشلی یہ بلیو کمر تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ کشف سر جھکا کر مسکرا دی تھی ویسے بھی آج وہ ناقص تھا شریلی ہی مکان اس کے کیوں کا احاطہ کر رہی تھی۔

”تمہیں پتا ہے آذر! یاد رہانی کا فورٹ کلر ہے بلیو۔“ کشف نے خوشی خوشی اسے بتایا تھا اور اس کا حلق اندر تک کڑواہٹ سے تر ہو گیا تھا۔ یعنی اس کی زندگی کے اتنے اہم مواقع پر اس کی بیوی یاور بن سہیل کی پسند کا رنگ پسینگی۔ اس کی طبیعت کدھر ہو گئی مگر چونکہ آج کا خوب صورت دن وہ کسی بد مزگی کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا تبھی ایک بار پھر سر جھٹک دیا تھا اور واپسی میں وہ اسے دھڑکھانے لے گیا تھا جو اس نے حال ہی میں خرید لیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس گھر میں شفٹ ہو جائیں کیوں کہ آذر کا آفس یہاں سے قریب تھا۔

اس کے بعد کار عرصہ جیسے چٹکیوں کی زد پر گزرا تھا۔ آذر اس دوران اپنے آفس کے کاموں میں مصروف رہا اور کشف نے گھر کی آرائش و زیبائش میں دقت گزارا۔

کشف کو پا کر وہ خوش تھا اور سحر کو پا کر سید مطمئن۔ تبھی اس کی ملاقات ایک بار پھر یاور بن سہیل سے ہوئی۔ وہ تانی جان اور ماہ نور کو لے کر ہسپتال آئے تھے۔ آذر کی یاور سے یہ محض دوسری ملاقات تھی اور آذر کو جوان دنوں اپنا آپ ایک مشینیز کے مترادف لگنے لگا تھا جس میں یاور بن سہیل کے لیے ناپسندیدگی قطرہ قطرہ اکٹھی ہو رہی تھی اب سخت شرمندگی ہوئی۔ اتنے شائستہ اطوار والے شخص سے بلاوجہ کا حسد پال لینا نری حماقت ہی تھی۔ پھر اسے یاور اور ماہ نور کی شادی سے متعلق کچھ سن گن بھی ملی تھی۔ مگر چونکہ اس وقت سبھی لوگ موجود تھے اس لیے اسے خود سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہ لگا۔

مگر یہ سب محض ایک دن یا چوبیس سے چھپیس گھنٹے کے لیے تھا۔ یاور کے لیے پیدا ہونے والی کدورت جو اس دن کی ملاقات کے بعد ختم ہونے کو تھی یکدم خون بن کر رگوں میں دوڑنے لگی۔ وہ مشینیز جس میں ناپسندیدگی رفتہ رفتہ تھم رہی تھی ایک آن میں منبک بھر گیا۔

وہ آفس سے قصد اجلدی آ گیا تھا کیونکہ آج کشف کو ڈسچارج کر دیا جاتا تھا۔ حالانکہ امی نے کہا بھی تھا کہ وہ کشف اور سحر کو گھر لے آئیں گی مگر آذر نے اپنا موقف نہیں بدلا تھا۔ وہ کشف اور سحر کو اپنے نئے گھر میں ہی لے جانا چاہتا تھا۔ ہسپتال کے پارکنگ لائن میں کار پارک کرنے کے بعد وہ بڑے مطمئن انداز میں لفٹ کی جانب گیا تھا۔ سیکنڈ فلور کے کمرہ نمبر سات کے بند دروازے کے آگے بس چند منٹ ٹھہر کر اس

نے کچھ سوچا تھا پھر دلکشی سے مسکرا کر ہوئے سے دروازہ دھکیلا تھا اور بائیں ہاتھ میں پکڑا گلاب پیچھے چھپا لیا تھا۔ دروازے نے بہت خفیف سی آواز پیدا کی تھی وہ اندر داخل ہو گیا ملکجے سے اندر میر اس نے وہ دیکھا جسے دیکھ لینے کے بعد خون رگوں میں آگ بن کر پھجڑیں مارنے لگا تھا۔ منہ اختیار پہنچ گئی تھیں۔

یاد رہے سہیل..... کشف آذر کمال پر جھکا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ کشف کی پیشانی کو چھو رہے اور کشف..... وہ مسکرا رہی تھی۔ جبکہ آذر کے دل و دماغ میں اتھل پھٹل شدید ہونے کے باوجود دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا تھا۔ بھی یاد رسید ہوا اور کشف کی نگاہ آذر پر پڑی۔ ”آذر.....“ اس نے نعرہ لگایا اور آذر جان نہیں سکا ان دونوں کے تاثرات..... وہ مسکرا رہی تھی۔ ”اچھا ہوا تم آگے میں ابھی یاد رہی تھی کہ آذر بھی.....“

’چلو..... ڈاکٹر نے تمہیں ڈسپانچ کر دیا ہے۔‘ بہت سرد مہری سے کہتے ہوئے اس نے آگے سر کو گود میں اٹھالیا تھا اور بنان دونوں کی جانب دھیان دیے باہر نکل گیا تھا۔

اسی ایک خیال نے ایک بار پھر اس کے ذہن سے لے کر ریزہ کی بڑی تک پھیری سی دوڑا اور وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ انداز نشست رتی بھر بھی نہ بدلا تھا۔ ویسے ہی کہیں کو گھنٹوں کا سہارا ہتھیلیاں آپس میں بیوست کرنے کی الاشوری سی کوشش کرتے ہوئے اس نے پچھلے تیرہ ماہ حرف بہر سوچ ڈالے تھے۔ اس نے سراٹھا کر دیکھا آسمان پر چھائی سرخی بدلیاں ارتعاش کے زیر اثر تھیں ہوا خمار سازندہ ہو چکا تھا اور کچھ دیر قبل والا سکوت اور جس کہیں نہ تھا۔

اور جب طویل اور بے معنی سکوت ٹوٹتے ہیں تو طوفان آتا ہے جس میں بارش برستی ہے جو اندر بھڑکنے والا کو بجھا دیتی ہے اور آگ بجھ جائے تو دھواں اٹھتا ہے۔ ایسا دھواں جو سانسوں کو آلودہ کرنے باعث بنتا ہے۔

آذر کمال نے بالا خرنگی میزہیوں کو بخش دیا تھا۔ پیٹ میں دھمال ڈالتے چوہوں کو تیلیاں دے ہوئے اور دماغ میں کلبلائے کیزے کو ڈپٹ کر سلاتے ہوئے اس نے اندر کا رخ کیا تھا۔ لاؤنچ سے۔ کر لوگ روم تک مہیب سناٹا اپنے پنجے گاڑھے بیٹھا تھا۔ وہ کچن میں آیا جہاں کچن ٹیبل پر پچھلے پانچ روزہ طرح کھانا چٹا ہوا تھا ٹرانسپیرنٹ جگ میں ٹھنڈا ٹھار پانی موجود تھا باؤل میں دو طرح کا سائمن موجود تھا کمر میں سے دھواں اٹھ اٹھ کر مہین سے بادل بنا تھا اور جو ہو جاتا تھا سب کچھ تھا اور پچھلے پانچ روزے سے یہی نما ہورہا تھا۔

وہ صبح اٹھا تو ناشتا یونہی موجود ہوتا اور آفس سے واپسی پر بھی ٹیبل جی سجاویں ملتی تھیں۔ لیکن اگر اسے ناشتا بیٹھ کر ہی پیٹ بھرنا ہوتا تو گھر کی بجائے کوئی بھی ریسٹورنٹ نہایت مناسب جگہ ہو سکتی تھی۔ اس نے گردن

موز کر دیکھا۔ کچن کے دروازے کے عین مقابل اس بیڈ روم کا دروازہ تھا جہاں پچھلے پانچ روز سے کشف موز کر دیکھا۔ کچن کے دروازے کے عین مقابل اس بیڈ روم کا دروازہ تھا جہاں پچھلے پانچ روز سے کشف نے مع سحر کے سیرا کیا ہوا تھا آج بھی وہ دروازہ بند تھا۔ آذر نے سرے سے جل کچن کا کسٹر ہوا۔ پیٹ میں خود حال چوہے سمجھے تو ذہن کا کیزہ از سر نو بیدار ہوا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا اپنے بیڈ روم میں گھس گیا بڑی مشکل سے خود پر بند کیا تھا دروازہ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ کچن سے لے کر بیڈ روم تک ہر چیز کا شربٹا ڈرے۔

ازدواجی زندگی کی یہ چھٹی بد صورت رات تھی جو ایک بد صورت دن کے اختتام پر اس کی منتظر تھی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا کشف سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو۔ محروم ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس نے شرٹ اتار کر ہوا میں اچھالی اسے سی آن کیا اور دھپ سے بیڈ پر گر گیا۔ بند کھڑکی سے باہر چھاجوں چھاج برستا ہوا اور ہم چارہا تھا اور اندر وہ کرشمیں بدل بدل کر خوب صورت سے بیڈ کے جوڑ ہلا رہا تھا۔ نیند ذہنی خلفشار کے ہوتے ہوئے بھی کافی رات گئے اس پر مہربان ہوئی تھی۔ اس نے ناگواری سے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کیا پھر چند لمبے یونہی بیڈ پر اوڑھنا لیا رہا۔ آج تو آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا پھر دوسرا سے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ طوہا کر ہاٹھا اچھی طرح خبر تھی کہ جب وہ چائے بنانے کچن میں جائے گا تو ٹیبل پر ڈرنے کو لازماً کی بجائے ناشتا ہوگا۔ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوا اور بغیر منہ دھوئے ہی کمرے سے باہر آ گیا۔

کچن میں مصروف عمل کشف کو دیکھ کر اس نے خاموشی سے ایک طویل سانس ہوا کے سپرد کر ڈالا پھر وہیں دروازے کی چوٹھ سے شانہ لگا کر اسے دیکھنے لگا، ابھی جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس نے کشف کی مہک کو کمرے کی ہر شے میں محسوس کیا تھا اور اب وہ اس کے عین سامنے تھی۔ اتنے دنوں بعد نظر بھر کر دیکھنے کا موقع ملا تھا وہ کشف نے تو اس سے ایسے تمام تر مواقع چھین لیے تھے یقیناً آج وہ خود بھی دیر سے بیدار ہوئی تھی تو کچن میں تھی ورنہ اس کا معمول تو یہ ہو گیا تھا کہ ناشتا لگا کر الارم اس کے سر ہانے رکھ دیتی تھی اور اس کے بیدار ہونے سے قبل ہی واپس بیڈ روم میں روپوش ہو جاتی تھی۔

آذر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا جھگڑا تھا اور وہ بھی اس قدر طویل ترین رات تک جو یہ سوچ رہا تھا کہ پیش قدمی نہیں کرے گا اسے دیکھتے ہی ہار گیا۔

”یاد رہے سہیل..... میں اس کے لیے اپنی بیوی کو خفا کیوں کروں۔“ حقیقتاً وہ جھگڑا تھا اور اب دل تو ہائیاں دے رہا تھا۔ کشف جو سامنے تھی آذر نے سر کی پشت پر ہاتھ میرے ہوئے فقط چند لمبے سوچا پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے بے حد قریب پہنچ گیا۔

ان کے بے حد قریب دھیرے سے سر گھٹی کی۔ وہ شاید آلیٹ کے لیے آمیزہ تیار کر رہی تھی۔ پل بھر کو وہی لکڑی بھر کو ہاتھ رکے اور آذر نے ایک بار پھر اسے اس کے کام میں مگن ہوتے دیکھا۔

”اچھا چلو..... اب صبح ہی صبح کوئی اچھی سی بات کرو جو میرا دل خوش کر دے۔“ فرمائش کی مگر جواب

ندارد۔ وہ اپنے اس روز کے نامناسب رویے کو یاد کر کے شرمندہ بھی ہو رہا تھا تبھی کشف کو اتنی اجیز سر دمہری اپنائے رکھنے پر حق بجانب سمجھتا تھا۔

”شفاء! مجھ سے بات کرو یا راتنے دنوں سے میں نے تمہاری آواز نہیں سنی۔ کیا ابھی تک خفا ہو؟ آذر نے اپنے ہمیشہ والے انداز میں اس کے شانے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے دریافت کیا اور اب کشف خاموش نہیں رہی تھی۔ وہ چپخ کراس کی جانب ہلٹی تھی۔

”تمہیں میری فحشگی کی پروا ہے آذر!“ بڑے کٹیلے انداز میں پوچھا مگر آذر مسکراہٹ ببا کر بولا۔

”تمہاری ہی تو فحشگی کی پروا ہے ورنہ سارا جہان جائے بھاڑ میں۔“ شوخی سے کہتے ہوئے اس کے گرد ہاتھ باندھ دیے اور حیرت انگیز طور پر کشف نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔

”تمہیں یاد ہے آذر! تم کہا کرتے تھے کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔“

”جیسے سے کیا مراد ہے؟..... میں تو ابھی بھی یہی کہتا ہوں۔“ وہ اس کی بکھری زلفیں سیننے لگا۔

”کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے نا آذر؟“

”کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو شفاء! اگر کہہ رہا ہوں تو کبھی تو رہا ہوں۔ رینگلی یادار صرف ایک لڑکی سے محبت کی ہے میں نے اور وہ صرف تم ہو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”پھر محبت میں تو شک کی گنجائش نہیں ہوتی آذر!..... کیوں مجھ پر شک کر کے مجھے میری ہی سے گرا رہے ہو۔“ آذر نے اپنا کام ترک کر کے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ گہری بھوری آنکھوں قطرہ قطرہ سمندر سمٹ رہا تھا آذر نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تمام کر انگوٹھوں کی مدد سے با کے ساتھ اس کی آنکھیں صاف کیں۔

”میں تم پر شک نہیں کر رہا کشف..... میں تم پر شک کر ہی نہیں سکتا۔“

”تم یاد رہائی پر تو شک کر رہے ہو آذر!“

آذر کے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر پہلو میں گر گئے۔ سارے خوش کن جذبات بزرگی آٹھ پچھ اور اس کے اعصاب تن گئے۔

”پلیز کشف! میں یاد کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔“ فریق سے پانی کی بوتل نکال کر سے لگاتے ہوئے اس نے دونوں انداز میں کہا تھا۔

”تمہیں بات کرنی ہوگی آذر! کیونکہ..... کیونکہ میں یاد بھائی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ وہ سے بولی تھی اور آواز میں محسوس کی جانے والی غمی تھی۔ آذر بری طرح سلگ گیا اس نے جڑے منہ سے بھینچ کر بوتل فریق میں رکھی۔ کشف کی آنکھیں التجاؤں کا قلعہ بنی ہوئی تھیں۔

”تمہیں یاد کے بغیر رہنا پڑے گا کشف کیونکہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس نے غصے سے

اپنی بات واضح کی۔ کشف اپنا سر ہاتھوں میں مگر اگر کرسی پر ڈھکے گئی۔

”آذر! وہ میرے بھائی ہیں۔“ وہ روتے ہوئے بڑی بے بسی سے بولی آذر نے ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی۔

”نہیں کشف وہ تمہارا بھائی نہیں ہے..... کسی تم نے سوچا ہے کشف کہ جس شخص کو تم بھائی بھائی کہتے نہیں تھیں وہ تمہیں کیا سمجھتا ہے..... تم اس کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتی ہو..... نہیں سوچا تو اب سوچو اور اگر نہیں سوچ سکتیں تو مجھ سے سنو..... تم یاد بن سہیل کے لیے صرف ایک عورت ہو..... ایک حسین اور خوب صورت عورت..... سمجھیں تم..... صرف عورت۔“ نہایت نفرت سے اس شخص کی حقیقت بیان کر کے وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ کشف کے تاثرات دیکھ سکے وہ تو بس اپنے اندر مچلتے اس جوار بھائے کی چند موٹی موٹی چنگاریاں کشف پر اڑا کر آیا تھا۔

+

کشف..... وہیں کچن ٹیبل کی کرسی پر کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح بیٹھی تھی۔ بے بسی ہر انداز سے ہو رہی تھی کہ ہاتھ میں نہ زور اور نہ ہی منزل کا معتبر پتا۔

نجانے آذر کے دماغ میں یہ خیال کہاں سے بھر گیا تھا کہ وہ اس کے باپ جیسے بھائی کے لیے اس قسم کے خیالات کا اظہار کر گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ کشف سے بے حد محبت کرتا ہے تو کیا محبت یہی ہے؟ کسی بھی انسان کو محض خود تک محدود کر دینے کا نام۔

وہ آذر سے پوچھنا چاہتی تھی اور اسے بتانا بھی چاہتی تھی کہ ”کچھ لوگوں کی محبت ہمارے ضمیر کا حصہ ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یاد بھائی کی محبت میرے ضمیر میں گندھی گئی ہے پھر تم خود بتاؤ آذر! اگر میں ان سے محبت کرنا چھوڑ دوں تو زندہ کیسے رہوں۔“ مگر کیسے بتاتی کہ آذر تو یاد بھائی کا نام تک سننے کا روادار نہ تھا۔ اس روز ہاسٹل میں ہی وہ آذر کے رویے کو بھانپ گئی تھی مگر سمجھ نہ پائی تھی کہ اصل وجہ کیا ہے دوروز تک خود سے کوئی مداخلت کرنے کی کوشش کے بعد بلا خراس نے آذر سے پوچھ لیا۔ آذر فوراً بھڑک اٹھا تھا۔

”وہ شخص کون ہوتا ہے میری بیوی کی پیشانی چومنے والا؟“

”آذر۔“ وہ دنگ سی رہ گئی۔ ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ آذر اس بات کو اتنے غلط انداز میں لے گا۔ یاد بھائی نے تو اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اسے بیٹے کی مبارک باد دی تھی۔ تو کیا وہ شخص اتنا بھی حق نہیں رکھتا تھا کہ اس لڑکی کی پیشانی پر پیار کر سکے جس نے اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا اور جسے وہ بیٹی کہا کرتا تھا۔ وہ اتنی بری طرح سے دل برداشتہ ہوئی تھی کہ کچھ بول ہی نہ پائی تھی جبکہ آذر بول رہا تھا اسے کوئی دقت نہ تھی۔

”اپنے ہی گھر میں میں ابھی ہو گیا ہوں کشف! یہاں تو ہر طرف یاد بن سہیل ہے۔ پردے سے

لے کر بیڈ ٹیبل تک تم نے اس کی پسند و ناپسند کو مد نظر رکھا۔ گھر کے انٹیریئر تک میں وہ ہے۔ آئینہ لانا
فرنیچر تم نے اس لیے پسند کیا کیونکہ وہ یاد اور بھائی کو پسند تھا۔ ہمارے بیٹے کا نام تم نے دو رکھا جو اسے پسند
تھا۔ تم اس کی پسند کے کھانے پکاتی ہو اور یہاں تک اکتفا نہیں ہے تم یاد رسی کی پسند کے کلرز پہنتی ہو اور وہ
تم نے گلے میں میرا گفٹ کیا ہوا لاکٹ پہننے کی بجائے یاد کا دیا ہوا لاکٹ پہن رکھا ہے۔ کیوں کنو
..... آخر کیوں؟ کیا میرا اس گھر پر کوئی اختیار نہیں؟ کیا میری بیوی کا یہ فرض نہیں بنتا کہ وہ میری پسند و ناپسند
کو مقدم جانے؟“

اودہ تو گویا یہ ایک پل کی نہیں صدیوں کی کہانی ہے۔ کشف نے جھکا سر اٹھایا آذر متغیر چہرہ لیے اس
کے سامنے تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ یہ سب صرف یاد اور بھائی کی نہیں خود اس کی پسند بھی تھا۔ بس غلطی یہ پہلی
تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً اسے یاد اور بھائی سے منسوب کرتی رہی تھی۔ ہر بار آذر نے اسے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا
اور وہ کرتی بھی رہی تو پھر اب یہ کڑوا اعتراض کیوں؟

”اور اب میں اس شخص کو مزید تمہارے اور اپنے درمیان برواشت نہیں کر سکتا۔“ آذر نے رخ موڑ کر
قطعی ٹھوس لہجے میں کہا تھا۔

”فیصلہ تمہیں کرنا ہے کشف! کہ ہم دونوں میں سے تمہیں کون زیادہ عزیز ہے۔ مگر یاد رکھنا کہ
فیصلہ ہو تمہیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہوگا۔“

وہ اتنی اجنبیت سے کہہ رہا تھا اور یہ اس شخص کا ایک نیا ہی روپ تھا جس سے کشف متعارف ہوا
تھی۔ یہ شخص جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا اسے سمجھنے میں کتنی غلطی کر رہا تھا۔

”اگر میں تم سے کہوں کہ شجاعت بھائی کو چھوڑ دو..... تو کیا تم چھوڑ دو گے۔“ وہ ایک دم اس کے
سامنے آگئی۔ اپنے اندر کا دکھ چھپا کر قدرے تیزی سے پوچھا۔ اپنے تئیں اس نے آذر کو جواب کر دیا تو
مگر جواباً آذر کے لبوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

”شجاعت میرے بھائی ہیں کشف اور یہ رشتہ یوں معتبر ہے کہ ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون
ایک ماں باپ کا ہے۔“ آذر کہہ کر چلا گیا اور وہ تہوارہ گئی۔ اپنی سوچ اور احتجاج کرتی محبت کے ساتھ۔

رشتے صرف خون نہیں دل بھی جو بناتا ہے۔ جیسے یاد اور بھائی کا رشتہ ان لوگوں سے تھا۔ وہ صرف ان
کے بھائی ہی نہیں باپ بھی تھے۔ ان کے لہجے و انداز میں ہمیشہ پدرانہ شفقت ہوتی تھی اپنی اور مادہ ترکی
شادی میں دیر بھی وہ صرف اس غرض سے کر رہے تھے کہ پہلے کشف کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں پھر
آذر کہتا تھا کہ۔

”نہیں..... ناممکن۔“ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ وہیں کچھ
میں بیٹھی تھی۔ ادھ کئی پیاز جوں کی توں شیلٹ پر دھری تھی۔ چائے کا پانی کھول کھول کر سوکھ چکا تھا۔ ذوریل

چغری جی اور ساتھ ہی عمر بھی۔
اس نے تیزی سے چہرہ خشک کیا۔ برز آف کیا۔ بھاگ کر دروازہ کھولا باہر کام والی ماسی کھڑی تھی۔

پھر اسی تیز رفتاری سے جا کر سحر کو اٹھایا۔ بچپن سے اب تک یاد اور بھائی کی مضبوط شخصیت کو دیکھا تھا۔ وہ بری
طرح ان سے متاثر تھی شروع شروع میں ان کے انداز و اطوار، پسند و ناپسند وہ جان بوجھ کر اپناتی تھی مگر بعد
میں یہی سب اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا۔

وہ واقعی ان سے بے حد محبت کرتی تھی اور آذر یہ سمجھنے کو تیار نہ تھا کہ دلوں میں ہر شخص کی محبت کا ایک خانہ
ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی ایک کی محبت ہی اسے لبال بھر دے۔ اسے بہت پہلے آذر کی کئی باتیں یاد
آنے لگیں۔

”میرے سوا کسی کو مت چاہو شفا۔“ اسے آذر کے انداز میں معصوم بچوں کی سی ہٹ دھرمی محسوس ہوتی
تھی تبھی وہ نس دی تھی۔

”اچھی زبردستی ہے..... اب کیا تم جذبات پر بھی پہرے بٹھاؤ گے؟“

”بالکل بٹھاؤں گا بلکہ تمہیں ایسے پہرے لگانے ہی پڑیں گے۔ ورنہ میں قتل کر دوں گا۔“

”کسے؟“ کشف نے شرارت سے پوچھا تو وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”تمہیں..... تاکہ نہ رہے ہانس اور نہ بچے ہانسری۔“

اس کے خیالات کے تسلسل کو ٹیلی فون کی بیل نے توڑا۔ اس نے سحر کو پہلے کاٹ میں لٹایا پھر ٹیلی فون
اسٹینڈ تک آئی۔ مگر اسکرین پر نظر آتے نمبر نے اسے ریسور اٹھانے سے روک دیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر
کھڑکی میں جا کر، باہر کچلی رات کی بارش کے بتایات جات موجود تھے۔ اس نے متواتر بجتی ٹیلی فون بیل
سے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ آنکھیں لبال بھری تھیں بھنپنے سے بننے لگیں۔ تبھی ملازمہ نے
اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”باجی..... فون۔“ وہ تھیری باجی جی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ”تم جاؤ میں دیکھتی
ہوں۔“ کشف نے اسے جانے کے لیے کہا اور پھر بڑھ کر فون کا پلگ نکال دیا پھر وہیں چہرہ ہتھیلیوں میں
چھپا کر رو دی۔

+

پھر انہوں نے ریسور رکھ دیا مگر نظریں ابھی تک ٹیلی فون سیٹ پر تھیں ایک عجیب سی الجھن اور حیرانی
نے انہیں گمیر لیا تھا۔

”آخر آذر کیوں نہیں چاہتا کہ کشف مجھ سے ملے۔“ دل نے خود کلامی ہی کی تھی۔ ابھی ابھی وہ کشف
سے بات کر کے فارغ ہوئے تھے۔ مگر ہمیشہ کی طرح مطمئن ہونے کی بجائے الجھ گئے تھے۔ پہلے تو بات
کرنے کا موقع ہی اتنی دیر سے ملا جس سے نمبر زلا ملا کر تھک گئے تھے اور اب جب کشف کی طرف جانے کا

سوچ رہے تھے تو دوسرے فون ریسپونڈ کر لیا گیا تھا۔ آذر کو اس وقت آفس میں ہوتا تھا ظاہر ہے فون ریسپونڈ کرنے میں کشف نے تھا۔ حال احوال دریافت کرتے ہوئے اچانک یاد کو کشف کی آواز بوجھل گئی تھی۔

”تم رور ہی ہو کشف!“ انہوں نے استعجاب سے پوچھا۔

”نہن..... نہیں تو یاد رہی..... بس ہلکا سا زکام ہو رہا ہے۔“ انہوں نے فوراً ڈھٹ دیا۔

”جھوٹ مت بولو اور سچ بتاؤ کہ کیوں روٹی ہو۔“ وہ بخوبی آگاہ تھے کہ کشف کو جھوٹ بولنے سے قناعت نہیں آتا پھر کچھ ان میں بھی کبھی گئی بات کی حقیقت پر کھ لینے کی صلاحیت زیادہ تھی۔ دوسری طرف کشف کی سسکیاں انہیں مزید مضطرب کر گئی تھیں۔

”میں نہیں بتا سکتی یاد رہی..... پلیز..... پلیز مجھ سے مت پوچھیں۔“ یاد رکھی جی رانی دو چند ہوئی کہ زندگی میں پہلی بار ہوا اور نہ اس سے قبل تو یاد کو کبھی پوچھنے کی ضرورت بھی نہ پڑی تھی۔ وہ ہمیشہ خود ہی اپنا دل ان کے سامنے رکھ دیتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ تم نہیں بتانا چاہتی تو مت بتاؤ مگر میں ابھی تمہاری طرف آ رہا ہوں۔“

”نہیں یاد رہی! پلیز آپ مت آئیے گا۔“ کشف کا تیزی میں کہا گیا جملہ انہیں حد درجہ حیرا کر گیا تھا۔ دوسری طرف یقیناً کشف ایسا بے اختیار میں کہہ گئی تھی کیونکہ اس کے بعد طویل خاموشی مچی۔

”یاد رہی! آذر نہیں چاہتے کہ میں آپ سے طوں اور پلیز اب یہ مت پوچھیں کہ کیوں؟ کیونکہ اس کیوں کا جواب میرے پاس ہے ہی نہیں۔“ ہنسی ہوئی لڑکھرائی آواز میں کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور یہاں ریسپونڈ یاد رکھنے کے ہاتھ میں جھول گیا۔

”آخر ایسی کون سی بات ہے جس کی بنا پر آذر کشف کو مجھ سے نہیں ملنے دیتا چاہتا۔“ انہوں نے ہم سے سوال کیا تبھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہاسٹل کے روم کے دروازے کی دہلیز کے قریب مسلا ہوا پہلا آ گیا تھا۔ ان کا ذہن عجب سے خیالات سے بھرنے لگا مگر کچھ بھی سوچنے سے قطعی گریز کرتے ہوئے انہوں نے کار کی چابی ٹیبل سے اٹھائی۔ موبائل ہاتھ میں لیا۔ کمرے سے باہر نکل کر پہلے سیکڑی کوچہ ضروری ہدایات دیں پھر آفس سے باہر آ گئے۔

پچھلی رات برسنے والی بارش نے سارے شہر پر خاصے خوشگوار اثرات مرتب کئے تھے۔ آسمان سے زمین تک ہر چیز دھلی دھلائی لگ رہی تھی۔ درختوں کے پتے گھر گھر کچھ اور ہرے سے لگنے لگے تھے۔ ان وقت چار بجے تھے۔ شام میں معلوم ہوتی دوپہر تھی کتنا وقت بیت گیا تھا بارش کو تھمتے مگر غیلے آئے۔ ان پر پہلے بادل روٹی کے گالوں کی طرح یہاں سے وہاں ہوا کی زد پر اڑتے پھر رہے تھے اور یاد کو یہ موسم بہت بھلا تھا۔ انہیں بارش بہت پسند تھی کشف کو بھی بارش پسند تھی اور اگر ان کا ذہن کشف کے عجیب روپے اور آذر کی ادھوری باتوں میں نہ الجھا ہوتا تو ضرور اس موسم کی دلفریبی سے لطف اندوز ہوتے۔ کچھ دیر کے لیے ماؤنڈ

چھ اور خوش ہوتے۔ آج بھی کشف کو اپنی اور ماہ نور کی شادی کے متعلق بتانے کے لیے ہی فون کیا تھا۔

”آپ کی شادی پر تو میں ڈبل ٹیک وصول کروں گی سالی کی حیثیت سے بھی اور بہن کی حیثیت سے بھی۔“ اور وہ ہنس دیتے تھے کہ انہیں تو اس کی ہر حیثیت دل و جان سے قبول تھی۔ وہ اسے اپنی بہن نہیں بیٹی لے۔ اور وہ ہنس دیتے تھے کہ پہلا قدم اٹھایا تھا تو وہ ان کی انگلی تھامے ہوئے تھی۔ اس نے بولنا ان سے کہ جب کشف نے شروع کیا تھا۔ وہ اپنی ہر بات انہیں بتاتی تھی۔ وہ اپنی ہر فیلنگ ان کے قلم سے شکر کرتی تھی۔ اس گھر میں انہیں اتنی محبت ملی تھی کہ اکثر سوچتے شاید سب سے مایاں باپ اتنی محبت ان کی بولی میں نہ ڈال پاتے۔

حسام..... جنہیں وہ ماہ نور اور کشف کی طرح ابو ہی کہا کرتے تھے کی وفات کے بعد احسان مندی کے حساسات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر شائستہ، ماہ نور، کشف اور کاشف کا خیال رکھا تھا۔ جن دنوں کشف کی شادی ہوئی وہ وہاں جا پان میں تھے! جہاں اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکنے کا افسوس تھا وہیں اس فرض کے پورا ہوجانے کا اطمینان تھا۔ انہیں ان کی فرم کی طرف سے چھ ماہ کے لیے بھیجا گیا تھا مگر وہاں ان کے اچھے کام سے متاثر ہو کر کچھ مزید عرصہ روک لیا گیا اور اب ایک سال بعد واپس آئے تھے کاشف کا ایڈیشن پوائنٹ میں ہو چکا تھا۔ شائستہ اور ماہ نور کو اپنے ساتھ ہی لے جانے کا ارادہ تھا اور کاشف کی رہائش کا بندوبست ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں ہو گیا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد کشف سے ملے اور اسے دیکھتے ہی مسرور سے رہ گئے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی اور اپنی ننھی سی بیٹی کو گود میں لیے کتنی معتبری لگ رہی تھی۔ ماں بن گئی تھی مگر انہیں دیکھتے ہی کسی ننھی بیٹی کی طرح پر جوش ہو گئی تھی۔

”یہ ہیں میری بیٹی کے اصل ماموں۔“ کہتے ہوئے اس نے کاشف کو چڑایا تھا۔

”تو میں کیا نقل ہوں۔“ بجائے چلنے کے وہ بھی ہنستا رہا تھا اور اس وقت ہاسٹل کے کمرے میں موجود بھی لگ کتنے خوش اور مسرور تھے تبھی انہوں نے آذر کو دیکھا تھا جو مسلسل کٹ میں لیٹی اپنی بیٹی سے کھیل رہا تھا۔ وہ آج بھی انہیں اتنا ہی اچھا لگتا تھا جتنا کہ اول روز..... بے حد سلجھا ہوا، مدبر اور شائستہ اطوار کا حامل تھی تو وہ کشف کے لیے راضی ہوئے تھے۔ پہلے وہ آذر کی ظاہری خوبیوں سے متاثر ہوئے تھے مگر اسے اہم کشف کے حوالے لے لیا تھا..... وہ صرف ان کا بہنوئی ہی نہیں داماد بھی تھا۔ وہ ہمیشہ ان سے بہت تیز سے ملتا تھا۔ بہت عزت سے پیش آتا تھا۔

ان کی کار حنیفہ منظر کے سامنے رکھی تھی جس کی مخالف سمت میں آذر کا آفس تھا۔ اگرچہ وہ مگر جانے کے ارادے سے نکلے تھے مگر کچھ سوچ کر آذر کے آفس کی طرف آ گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ

یہ سب بے اختیاری میں ہوا اور ہوتا ہی چلا گیا۔

میں منت انتظار کرنے کے بعد سیکرٹری نے انہیں آذر کے آفس میں جانے کے لیے کہا لیکن میٹنگ سے فارغ ہو گیا تھا۔ انہوں نے آفس میں داخل ہوتے ہی آواز بلند سلام کیا تھا اور ان کے ذیل میں تو آذر کی جانب سے بھی ایسی ہی گرجوٹی کا اظہار ہونا چاہیے تھا مگر آذر نے کوئی خاص رسپانس ظاہر نہیں کیا تھا۔ مصافحے کے لیے بھی یاد رہے ہی ہاتھ بڑھایا تو اس نے جیسے طوا کر ہا اپنی چیز پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”پلیز شریف رکھیے۔ کہئے..... کیسے آتا ہوا۔“ بظاہر ہمیشہ کی طرح آج بھی تیز سے بول رہا تھا اور آواز انداز میں واضح محسوس کی جانے والی سرد مہری تھی۔ یاد رہے اسے اپنی غلط فہمی سمجھتے ہوئے اسے فر سے دیکھا۔ ادھر ادھر نجانے کس چیز کی تلاش میں ہاتھ مارتے ہوئے وہ ان کی جانب قطعاً متوجہ نہ تھا۔ شرٹ پر بلیک ٹائی لگائے وہ گزشتہ دنوں کے برعکس زیادہ چنڈم لگ رہا تھا۔

”میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کیوں نہ جاتے جاتے تم سے ملتا جاؤں۔“ انہوں نے حتی المقدور اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کی تھی۔

”کوئی کام تھا؟“ آذر نے اپنے سابقہ انداز میں پوچھتے ہوئے فائل کھول کر سامنے ٹیبل پر رکھی تھی۔ یاد رکھو یکدم بے حد سکی کا احساس ہوا۔

”نہیں کام تو نہیں تھا مگر.....“ انہیں آذر کا یہ نیا سا اور قدرے ترش رویہ حیران کر رہا تھا۔ ”میں شاید غلط وقت پر آ گیا..... تم تو مصروف ہو غالباً۔“ انہوں نے پھر کہا۔ آذر نے اب کی بار کبھی بھی کہنے کی زحمت نہ کی تھی، یاد رکھو کے اندر تعصیب کا احساس سرا بھارنے لگا یہاں معاملہ کشف کا نہ ہوتا تو کبھی وہ اتنی دیر تک نہ بیٹھتے بلکہ یہاں سے چلے جاتے اور کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتے۔ مگر یہاں انہیں معاملہ فہمی سے کام لینا تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات ہے جو آذر کو اس قدر ناگوار گزری ہے کہ وہ کشف کو ان سے ملنے سے روک رہا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اس وقت بھی ان سے اجنبیت سے پیش آ رہا ہے۔

”میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تمہیں یہاں سے لے کر گھر چلیں گے اور کشف کے ہاتھ کا کھانا لے کر کھائیں گے۔“ ماحول کو خوشگوار بنانے کی اختیاری کوشش کرتے وہ ذرا سامنے ہوئے اور تائید طلب نظروں سے اسے دیکھا اور آذر نے پہلی بار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”اچھا تو یہ سوچ کر آئے تھے تم۔“ آذر اپنی جگہ سے اٹھا اور فائل ریک کے پاس جا کر جبکہ با-

شدد سے رہ گئے۔

”تم۔“ ان کے لبوں نے نا محسوس سی حرکت کی۔ آذر کبھی بھی انہیں اس طرح سے مخاطب نہیں کرتا تھا۔

”ایک بات تو تاؤ مسٹر یاد رہی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کا اس قدر شوق کیوں ہے جس میں؟“ یاد رکھو ایک ہلکا سا کوشا گئے۔ کتنے عجیب سے انداز میں پوچھا تھا اس نے اور میری بیوی پر کس قدر زور دیا تھا۔

”کشف تمہاری بیوی ہی نہیں بہن بھی ہے میری اور اپنی بہن کے ہاتھوں سے پکا کھانا پسند ہے مجھے۔“ یاد رہے متانت سے وضاحت کی تھی۔ جواباً آذر کا طنز بھرا ہنکارا بھرا تھا۔

”کم آن یارا کم سے کم بہن بھائی کے پاکیزہ رشتے کی تذلیل تو مت کرو۔“ یاد رہے الجھ کر اسے دیکھا اس کی باتیں اور واقعات فہم سے باہر تھیں۔

”میں کب کسی رشتے کی تذلیل کر رہا ہوں آذر!“ وہ آذر کے ہر انداز میں ظاہر ہوتی نفرت سے خائف ہونے لگے۔ آذر سینے پر بازو باندھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتا ان کی طرف آیا۔

”کوئی دور پرے کی رشتے داری تو تم دونوں کے درمیان ہے نہیں۔ پھر نہ تو ماں ایک ہے اور نہ ہی باپ لہذا کوئی خونی رشتہ بھی نہیں تو پھر کیا تعلق ہے تمہارا اور کشف..... کم آن ٹیلی آخر کیا نام دینا چاہو گے اس تعلق کو۔“ آذر کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ اور جوش تھا۔

”کیا رشتے صرف خون سے مشروط ہوتے ہیں آذر!“ وہ بہت پست لہجے میں بولے تھے کس قدر دکھ ہوا تھا انہیں آذر کمال کے خیالات جان کر۔

”ہر تعلق خون کا محتاج تو نہیں ہوتا آذر! ضروری تو نہیں ہے کہ خون کا ایک ہونا ہی رشتے کو معتبر ثابت کرے۔“

”ہوتا ہے بالکل ضروری ہوتا ہے۔“ آذر نے سرعت سے بات کاٹی۔ ”ہر رشتہ ہر تعلق اپنے معتبر ہونے کے لیے ثبوت مانگتا ہے ایسا ثبوت جو پاکیزہ ہو۔“

”کوئی بھی تعلق یا رشتہ پاکیزہ یا غلیظ سمجھا جاتا ہے جب آپ اسے دیکھتے یا سمجھتے ہوں کسی بھی چیز کی پاکیزگی اور غلاظت کو واضح آپ کی نگاہ اور آپ کا فہم کرتا ہے۔“ یاد رہے سانسیت سے بولے۔

”میرا اور کشف کا نظارہ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے مگر بہت سے خونی رشتوں سے بڑھ کر پاکیزہ اور قابل اعتماد ہے۔ دلوں کے رشتے اتنے کھوکھلے نہیں ہوتے کہ.....“

”اتنے ہی دلوں کے رشتے جڑے ہوئے تھے تو اس کی شادی ہونے ہی کیوں دی اطمینان سے رکھتے مگر میں اور دلوں کے رشتے مضبوط کرتے۔ بتایا ہوتا اسے اپنی بیوی۔“

”آذر.....“ یاد رہے اس کی بات قطع کی۔ ایک آتش فشاں سا ابھرا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا اس نے اپنے مطلب کی صرف ایک ہی بات سنی ہے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ کیسی کمین باتیں کر جاتے ہیں۔ یہ چونکہ بے حد مہذب، مدبر اور معاشرے میں اونچا مقام رکھنے والا شخص جوان کے لیے بے حد قابل عزت ہو گیا تھا۔

یکدم بہت چمکنا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے مقابل کھڑے قہر بارنگا ہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ اتنی گھٹیا بات کو اس قدر آرام سے دانتوں تلے چباتے ہوئے یقیناً اسے پورا احساس تھا کہ بر چھیاں یاد رکھنے میں اتار گیا ہے۔

اور یاد کے اندر ایک لاوا ابل رہا تھا جو انہیں اندر باہر سے خاک کر رہا تھا۔ طیش کے شر احساس نے کپٹی کے قریب رگوں کو چمکنے پر مجبور کر دیا تھا اور پہلو میں اضطراب سے جلیں اٹھانے نے مضبوطی سے سمجھ لیں تھیں۔ مبادا بے اختیاری میں کچھ کر رہیں۔

”میں نے کہا تھا ناپائیز کی اور غلامت کی صاحت دیکھنے والی نگاہ اور سمجھنے والے فہم پر غصہ کر کے ضبط سے گویا ہوئے۔“

”ہمارے رشتے کو جس بھی نگاہ سے دیکھو گے۔ وہ تمہیں ویسا ہی دکھائی دے گا۔ ایک بار! طرح سے سوچ لو! ذرا! کہیں ایسا نہ ہو ہمارا پاک رشتہ تمہاری کج فہمی اور غلط فہمیوں کی بیخوشی میں کشف کا بجائی ہو۔“

”مجھے سبق رٹوانے سے بہتر یہ ہے کہ تم خود پردھیان دو۔“ آذر کے لہجے میں رعونت بکھرا۔
تمس۔

”تم ہو کیا؟ کیا شناخت ہے تمہاری۔ بھائی بھائی کی گردان مکمل کرنے سے پہلے یہ تو سوچو کہ بھوک پیاس سے بلکتے ”کئے“ کو گھر میں پناہ دینے سے وہ بھائی نہیں بن جاتا۔“

ممبر کی ایک حد ہوتی ہے۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے مگر یاد رہے سبیل جیسا صابر اور کرا کڑوی بات کو برداشت کر جانے والا بندہ اپنا سب کچھ اس ایک لمحے کے ہاتھوں ہار گیا تھا۔ پہلا کرتا مضبوط سبیل پر پہنچتی ہوئی انگلیوں کا آہنی مکاؤ رکارڈ پر اہلا گیا تھا۔

اس سے قبل میں نے تمہیں ایک آپشن دیا تھا۔ مجھے اور ماور بن سہیل میں سے کسی ایک کو کٹھن

اب میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم یاور بن سہیل سے ساری زندگی نہیں ملوگی..... سنا تم نے! سہیل سے نہیں ملوگی تم اور میرا حکم ہے تمہارے شوہر کا حکم ہے۔ اس نے آگ بھڑک کر سانس لے لیا۔

جسکے سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ کشف کئے ہوئے شہتیر کی طرح صوفے سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔

”اور یاد رکھنا کشف! اپنے شوہر کا حکم نہ ماننے والی لڑکیاں کبھی خوش نہیں رہ پاؤ گی! انہیں سزا ملے گی۔“

زندگی کی تلخ ترین رات شاید یہی تھی۔ بند کمرے میں گویا ہر چیز کی زبان نکل آئی تھی۔ اس نے

وہ بے باک کرنے کا عزم کیا مگر پھر شک مچا۔ سکون تو اب بھی نہ تھا۔
 حیات اللہ اب نفرت چکھا ڈر رہی تھی۔

پہلے وہ رقابت میں جھگڑا کر روپ ڈال دیا۔
اب کسی قدر آدرا ڈس ہے کاروپ دھا رے آگ اگل ری تھی۔

پہنا ہوا ہونٹ، ٹیپوں کی زد میں رہا۔ ٹوٹے ہوئے دانت

اس کے دائیں کال پر پیار سے ہاتھ رکھ کر فریڈا نے کہا: "میں نے تو ان کے ساتھ دو اٹھا۔ واش روم میں جا کر ہونٹ کا زخم روکی سے

جیسے کہیں غم ہو رہا تھا اس نے جھک کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔

یہ میرا وعدہ ہے تم سے، کشف کی شکل دیکھنے کو نہ ترس گئے تو میرا

رات اس پھیلے کے اعادے میں سر اڑوں۔

آؤ راہے بچاؤ سے بے کون کدم اٹھانا۔ یاد رہے ایک مین وار

ساتھ اس نے بغض سے مغلوب ہوتے ہوئے سپر ویٹ اٹھا کر

مرف ملک لیا۔ بیجا بیچر ویٹ ہلاس وال نوایہ پھماتے۔
 ہو گیا۔ آن کی آن سارے اسٹاف میں کھلیلی جھگڑی۔ ایم ڈی کا آ

کے لئے۔ چند سبب بعد پولیس بیواؤں کی۔ ظاہر ہے کہ ایم ڈی اے کا روباہری ساکھ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے لہذا یاد رکھو پولیس کے

دن تک مٹو کر دیا گیا۔ پولیس لے جانے کے فوراً بعد ایم ڈی دماغ پہلے ہی گھوما ہوا تھا ان کے ذرا سے استخسار پر اس

دیکھ رہے تھے۔ دوما جو ہوس میں آئے تو قصہ صاف تھا۔ ظاہر خاموشی سے سہتے اور ہنسم کر جاتے مگر آذر بھی اپنے نام کا ایک

یہ وہ لڑکی تھی جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اور شکل و

آن میں اسے اپنا حکم سنایا آگاہ کیا اور ترقی فرما کر اسے میں آ

واش روم سے فارغ ہو کر وہ واپس بیڈ پر آ گیا۔ میگزین اٹھا کر دیکھتا رہا۔ ٹیلی ویژن آن کر کے سکون کہیں نہ تھا۔ دماغ میں گیلی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ آگ کم دھواں زیادہ تھا۔ بجائے کیا وقت کا مہر فون کی کھنٹی چٹکاڑی کہ چوٹی تیل پر وہ اٹھا کر آدمی تیل پر ہی آواز بند ہو گئی۔ شاید کشف نے لڑائی کے فون اٹھالیا تھا شاید فون کٹ چکا تھا۔ اس نے چپک کرنے کے لیے ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز والی دوز خانہ آوازوں میں سے ایک کو وہ بخوبی پہچانتا تھا۔ ذرا غور کرنے پر دوسری آواز بھی پہچان آ گئی۔ وہ ماہ نور تھی۔ وہ دور رہی تھی اور جو کچھ کہہ رہی تھی اسے آذر غور سے سن رہا تھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ طویل ترین عرصے بعد کشف کی سپاٹ آواز ابھری تھی۔

”میں آ رہی ہوں..... ابھی آ رہی ہوں۔“ سلسلہ منقطع ہو گیا آذر نے ایک خواب کے عالم میں ریسور احتیاط سے کرڈل پر رکھا۔ اس کی نگاہیں دیوار پر کسی غیر مرئی نقطے کو کھن رہی تھیں۔ فرعونیت کے بچے کچھ اور بچہنگی سے اس کے وجود میں پیوست ہو رہے تھے۔

+

”اور یاد رکھنا کشف! اپنے شوہر کا حکم نہ ماننے والی لڑکیاں کبھی خوش نہیں رہ پاتیں۔ انہیں مالا زندگی سکنا پڑتا ہے۔ کر لانا پڑتا ہے یاد رکھنا۔“

آذر کی آنکھوں میں پڑے سرخ ڈورے، ہونٹ کے کنارے پر جھا ہوا خون، آگ برساتا دوڑی لہجہ اور شدت ضبط سے لرزتا وجود اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔ وہ ہم کر جہاں کی جہاں دیکھ رہی تھی۔ احساس تک نہ تھا کہ ابھی آذر کے نفرت سے جھکا دینے پر کتنی بری طرح سے گھٹنا میز کے کنارے سے لگرایا ہے۔ آذر کے رویے نے اس بری طرح خوفزدہ کیا تھا کہ آنکھوں میں موجود نمکین پانی وہیں ہلکے سے چپک کر رہ گیا تھا۔

”آذر کی نگاہوں سے ہی نہیں الفاظ سے بھی قہر برساتا تھا۔ لہجہ نے نفرت نکالی تھی۔ پھر وہ چلا گیا۔ کشف وہیں بیٹھی رہ گئی۔ یہ رات جشتوں نے تعبیر کی تھی۔ آخر ایسی کوئی بات ہو گئی تھی جو طوفان کا دروازہ لے رہی تھی اس نے تو یاد بھائی کو آدمی اور صوری بات بتائی تھی اور وہ بھی بے اختیاری میں..... تو کیا یہ بھائی..... نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ خود ہی لٹی کرنے لگی۔ یاد بھائی سے بات کر لینے کے بعد اس نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ آذر کو مٹا لے گی۔ فائل کر لے گی جو قوتی غلط فہمی کی دھند اس کے ذہن پر چھا گئی ہے۔ لپے لفظوں سے اسے چھٹ جانے پر مجبور کر دے گی مگر اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ اس کے سامنے آذر کے روپ میں فرعون کھڑا تھا۔

پہلے اس نے چناؤ کا حق کشف کو دیا تھا اور اب حکم دے کر چلا گیا تھا۔ جیسے بادشاہ اپنی رعایا کو مدمتا ہے۔ پتھروں پر لیکر کھینچتا ہے جسے مٹانے کی کوشش صرف زخم دیتی ہے۔

ساری رات وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اور گردایا سنا سنا تھا گویا غلطی سے قبرستان میں آ گئی ہو۔ پھر اس نے کو اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں نے توڑا کتنے آرام سے آذر نے کہہ دیا تھا کہ تم یاور سے ساری زندگی نہیں وگی۔ بھلا کیا یہ ممکن ہے جن کا ہونا آپ کے لیے آسجین کی طرح ہو۔ دید خون میں روانی لاتی ہو۔ دل میں تراوت و طمانیت بھرتی ہو۔ کیا ان سے قطع تعلق اتنی آسانی سے ممکن ہے۔ شوہر معظم کا حکم مان کر بھی سکنا پڑنا اور نہ مان کر بھی وہ ہری مشکل میں تھی۔

ذرا اس کے آنسو جیسے تو سحر نے داویلا کر دیا۔ پچھلی رات سے بھوک تھی ماں کی گود میں آتے ہی قرار پا مٹی۔ کشف نے اس کے نرم سے گال کو چومتے ہوئے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”آذر کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا میرے لیے نہ یہی تو سحر کے لیے۔“ تبھی فون کی تیل بج اٹھی۔ اس نے سحر کو کٹ میں لٹایا اور لڑائی میں آ کر ریسور اٹھالیا۔ دوسری طرف ماہ نور تھی۔ بے حد روہاںسی ورجنیر اس نے دی تھی وہ کشف کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لینے کے لیے کافی تھی۔

”یاد رکھ کر کارٹرک سے ٹکرا گئی بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ان کی حالت بہت نازک ہے اس وقت آئی سی یو میں ہیں.....“ اس کے بعد ماہ نور نے کیا کہا وہ سنی رہی البتہ سمجھ نہ سکی۔ اس کے کانوں میں مسلسل ایک آواز گونج رہی تھی۔

”اس سے قبل میں نے تمہیں آپشن دیا تھا کہ مجھ میں سے اور یاد میں سے کسی ایک کو چن لو۔“ دعوت بھرا لہجہ اس کے گرد دکڑی کے جالے جیسے تاروں کا جال بننے لگا۔

”اب میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم یاور بن سہیل سے ساری زندگی نہیں ملو گی۔“

”ساتم نے یاور بن سہیل سے نہیں ملو گی تم۔“ کوئی اس کے بہت قریب چٹکھاڑا تھا۔

”تم سن رہی ہونا کشف۔“ ماہ نور کی آنسوؤں میں بھیگی آواز ابھری۔

”یہ تمہارے شوہر کا حکم ہے اور یاد رکھنا کشف! اپنے شوہر کا حکم نہ ماننے والی لڑکیاں کبھی خوش نہیں رہ پاتیں۔ انہیں ساری زندگی سکنا پڑتا ہے کر لانا پڑتا ہے۔“

”تم آ رہی ہونا کشف۔“ ماہ نور نے پھر پوچھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ ”شوہر انسان ہوتا ہے خدا تو نہیں کہ اس کا حکم نالانہ جاسکے پھر آذر مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ابھی غصے میں ہے مگر میں اسے منالوں گی۔ وہ مان جائے گا۔“

”میں آ رہی ہوں..... ابھی آ رہی ہوں۔“ اس نے ریسور رکھ دیا اور کمرے سے معمول میں اوڑھنے والی چادر نے آئی۔ یاد بھائی نے مشکل ترین حالات میں ان کے سروں پر چھایا کی تھی تو کیا وہ ان کے مشکل وقت میں ان کا ساتھ نہ دیتی جبکہ وہ اس سے ملنے کی تمنا کر رہے تھے۔ ہاں کوئی ایسی ہی بات ماہ نور نے کی تو تھی۔

سحر کو اطمینان سے سوتا دیکھ کر اس نے احتیاط سے دروازہ بند کر دیا اور مڑنے پر یکدم اپنی آنکھیں کھلی گئی۔ وہ آذر تھا جس نے اسے گرنے سے بچالیا تھا۔ کشف کے لمحوں سے جیجی کی برآمد ہونے سے پہلے گھٹ گئی۔ دل الگ دھڑ دھڑانے لگا پھر اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر ڈالا اور ایک ایک بات بتائی۔

”تم نہیں جانتیں۔“ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ آذر کی آنکھوں کے تاثرات سفید برف کی طرح ہیں۔ لہجہ سپاٹ اور قطعی متزلزل نہ تھا۔ وہ اس کے پھیلے ہن پر رسک اٹھی۔

”یاد رہائی کو میری ضرورت ہے آذر! خدا کے واسطے مجھے جانے دو۔ میں..... میں تم سے بھرا ہوں کہ ایک نظر انہیں دیکھ کر واپس آ جاؤں گی اور پھر کبھی ان سے نہیں ملوں گی۔“ وہ بے اختیار ایک شخص کے سامنے جھولی پھیلا کر کھڑی ہو گئی جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا۔ بس عنایت کے چہرے تھے۔ جو کہ ہر حال اسے ملے تب وہ اپنی جگہ کن سی رہ گئی۔ آذر بنا کچھ کہے اس کے سامنے سے ہٹ گیا اب بیرونی دروازے اور اس کے درمیان کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ پہلے وہ کچھ دیر یونی کھڑی یہ سوچ رہی کہ حقیقت قابل یقین ہے بھی یا نہیں۔ آذر نے اس کے تفکرات کو جھٹلاتے ہوئے اسے جانے کی بات دے دی۔ پہلے وہ التجا کرتے ہوئے روئی تھی اب خوشی سے رونے لگی۔

”جھینک یو آذر..... جھینک یو سوچ۔“ اس نے تشکرانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ محبت لگتا ہوتی ہے۔ ہر دم مصالحت کی راہوں کی تلاشی۔ وہ چادر کے پلو سے چہرہ خشک کرتی دروازے کی باڑھی۔ مگر تیسرے چوتھے قدم پر ہی اس کے قدم ساکت رہ گئے۔ فضا میں زوردار آواز ابھری تھی اور ای لوہے کی گرم سلاخ اس کی ریزہ کی ہڈی کے بہت قریب وحشتی چلی گئی تھی۔

اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی تھی مگر لگتا تھا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ بے اختیار ہاتھ اس کی پشت ٹھہرا اور جب واپس لگا ہوں کے سامنے آیا تو سرخ رنگ کا سیال زندگی پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس کی کار لڑنے لگیں تب وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔

اس نے سمجھے میں غلطی کر دی تھی۔ محبت مصالحت کی راہیں تلاش کرتی ہے مگر ضروری نہیں کہ وہاں بھی ٹھہرے۔ کبھی کبھی تو یہی محبت بھی مصلحت نہیں اکرنے دیتی۔

اندازہ ہو جائے تو مجتبیٰ یونی رل جایا کرتی ہیں۔

اس کے کانوں میں سحر کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً شور نے اسے جگا دیا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں کھلی تھیں اور ہاں کی ہمتیں ایک ایک کر کے ہوائیں حلول ہو رہی تھیں۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ہر وہ پل مجسم ہونے لگا جس میں آذر نے اس کو اپنا عشق اور اپنی زندگی تھا۔ تو کیا زندگی کی ساتھ یوں کیا جاتا ہے؟

عشق کو یوں اذیت دی جاتی ہے۔ بے معنی سا قطرہ چادر کے پلو میں جذب ہوا تھا۔ سحر کے کشف کی چترائی ہوئی آنکھوں سے ایک بے معنی سا قطرہ چادر کے پلو میں جذب ہوا تھا۔ سحر کے رونے کی آواز تیز تر ہو چکی تھی کشف بے دم ہو کر بائیں طرف لڑھک گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندر اچھا رہا تھا۔ اس نے پڑی تھی ہونٹوں پر زبان پھیرنا چاہی تو حلق آنسوؤں کے ذائقے سے بھر گیا۔ اس کے کان مسلسل سحر کی آواز سن رہے تھے۔ بالاخر اس کی آنکھیں مکمل طور پر بند ہو گئیں اور معطل ہوئے حواس کے ساتھ اس کے کانوں نے ایک اور فائر کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد سکوت چھا گیا تھا۔ سحر کی آواز اب وہ نہیں سن رہی تھی۔

+

کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے ان کے بھاری جوتوں میں مقید پیر ٹھنک کر یوں رک گئے تھے گویا دھتے کا مقام یہ نہ ہو۔ کمرے میں گنگا سا جالا تھا اور اس اجالے میں دھیل جیڑ پر بیٹھا وہ ساکت وجود قدرے بیت ناک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئے جیسے وہ کوئی خواب ہو جس کا پلک جھپکنے پر کھوجانا شرط ہو۔ وہ کوئی خوب صورت خواب تو نہ تھا کہ کھوجانے کا خوف لاحق ہو مگر پھر بھی وہ اسے دیکھ رہے تھے مسلسل..... لگا تار..... بنا پلک جھپکنے۔ یہی ساکت فضا میں مدھم مدھم ہلچل ہوئی تھی جیسے کسی نے برہم پر زور دار ضرب لگائی ہو یا ٹھہرے ہوئے پانی میں پوری قوت سے پھر جھینک دیا ہو۔

”آپ کی شادی میں تو مجھے ذیل نیک وصول کرنا ہے۔ سالی کی حیثیت سے بھی اور بہن کی حیثیت سے بھی۔“

بہت سی مترنم آواز ان کے قریب بہت مان نے کھلکھلا رہی تھی۔ انہیں لگا ان کی آنکھیں پانی سے تر ہونے لگی ہیں۔ مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں اور سامنے دھیل جیڑ سے چپک کر بیٹھے رہنے پر بھروسہ وجود پر مرکوز تھیں۔ آج اس وجود کو دیکھ کر ان کے خون کی گردش تیز نہیں ہوئی تھی۔ غصے کی کوئی لہر نہیں اٹھی تھی۔ نفرت کا آتش فشاں نہیں چمکاڑا تھا۔ بلکہ دل یہاں سے وہاں صرف ترحم سے بھر گیا تھا..... تاسف تھا..... ہمدردی تھی۔

مردہ دماغ والے اس وجود سے نفرت کر کے، انہیں اب کچھ حاصل ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ وقت کی چال کچھ اتنی تیز اور غیر متوقع تھی کہ وہ مات کرنے کا کوئی سامان کر ہی نہ پائے تھے۔

”تم صرف ذیل نیک وصولنا چاہتی تھیں کشف! ایک بار مجھے موقع تو دیتیں میں اپنی زندگی تمہاری ہتھیلی پر رکھ دیتا۔“ مگر وہ صرف ایسا سوچ سکتے تھے کہ شاید کشف کی زندگی لے کر ہی خدا نے انہیں ازسرنو زندگی دی تھی۔

مگر تار ہونے کے محض دو گھنٹے بعد ہی ان کی ضمانت ہو گئی تھی اور اس دوران انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا

پوریج میں داخل ہونے سے قبل انہوں نے اپنی آنکھ کے کونے میں چلتا آنسو زری سے پونچھ دیا تھا۔
جیسی کے قریب مانو اور سران کی منتظر تھی۔

”اوسکے سر از زندگی رہی تو پھر ملیں گے! انشاء اللہ“ انہوں نے اپنا مضبوط آہنی ہاتھ مٹانے کی کمال حبیب کی جانب بڑھایا جسے انہوں نے تھاما تو پھر چھوڑ انہیں۔ اس نرم سی گرفت سے آزاد ہوا با آسانی حاصل کر سکتے تھے مگر کبھی کبھی انسان خود کو حالات کی زد پر چھوڑ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

چلوں مگر یہ میرے گھنٹوں کا درد۔“

”میں سب لے آیا ہوں ممانی! آپ چیک کر لیں۔ تین دوپٹے جو آپ نے رنگوانے کے لیے دیے تھے، تینوں کی پکیو بھی ہو گئی ہے اور یہ اینٹگر کی گھیاں بھی چیک کر لیں۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں ٹاپاؤ کی جانب بڑھا دیا۔ ماما کا شوق اس وقت قابل دید تھا۔ ایک ایک چیز انہوں نے بڑی عرق ریزی سے چیک کی۔

”باقی سب تو ٹھیک ہے مگر یہ مٹی دھاگے کیسے پھکے پھکے سے لائے ہو اور یہ پیلے دوپٹے پر توڑے پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھو ذرا..... ایک ذرا سا کام ہی تو تھا، تم نے کیا کھول کر چیک نہیں کئے تھے۔“ اس کی گردن شرمندگی سے خاصی جھک گئی۔ دل تو چاہا کہ کہے آپ کے اس ذرا سے کام نے میرا ڈھائی گھنٹے برا کر دیا ہے، مگر جب بولا تو بالکل مختلف۔

”آپ انہیں ایک طرف کر دیں ممانی! میں کل تبدیل کرواؤں گا۔“

ممانی برے برے منہ بناتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کھانا کھا لو اٹھ کر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہم سب نے کھایا ہے۔ گرم ہی ہے تب تک میں پڑا تبدیل کر لیتی ہوں۔ آج ذرا مجھے سعدی کی طرف ہی لے چلو۔ بڑے دن ہو گئے مجھے اپنی بہن سے لے تمہارے ماما سے جب بھی کہتی ہوں تو ٹال جاتے ہیں۔ عادل اور منصور کی مصروفیات سے تو تم واقف ہو..... رمضہ سے پوچھتی ہوں وہ بھی چلی چلے تو تم دو چکر لگا لیتا پہلے مجھے چھوڑ آنا پھر اسے۔ کیسی مٹی کا گڑا چاروں طرف۔ تم یوں کرو کھانا کھا کر پہلے ذرا باہر پانی لگا دو تاکہ گرد بیٹھ جائے۔“

”اور کچن میں دوپہر کے کھانے کے برتن رکھے ہیں..... انہیں تو آپ پھول ہی گئیں بڑی چٹا۔“ کی طنز بھری آواز سیزھیوں کی جانب سے آئی تھی۔ لاؤنج میں موجود دونوں نفوس کی گردنیں یک دھماکا طرف مڑ گئیں۔

ہادی کے تو مانو ہاتھ پیر ہی پھول گئے۔ صبا کی یہ جو ذرا مائی سی انٹری ہوئی تھی اس کا اختتام منظر صورتحال پر ہونا تھا۔

”اور پچھلے دو ہفتوں سے، آپ کی کام والی ماما بھی نہیں آ رہی۔ واشنگ مشین بھی منہ بند ہو گئی۔ ہادی! چچی کو ان کی بہن کے گھر چھوڑ کر آنے کے بعد تم واشنگ مشین لگا لیتا، ویسے بھی سارا دن یہ ہی تو ہوتے ہو کچھ کام ہی کر لیتا۔“

”ارے ارے۔ کیا بولے جا رہی ہو لڑکی! ہمارا کیا دماغ خراب ہے جو اس بے چارے سے با کروائیں گے۔“ ممانی کو اس کا انداز خاصا ناگوار لگا تھا، بھڑک کر بولیں۔

”باقی سارے کام بھی تو اسی سے کرواتی ہیں یہ دو بھی کروالیں گی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔“

وہ بڑے آرام سے بولی۔

”چھٹا بھڑک لڑکی کچھ زیادہ ہی زبان دراز ہو گئی تھی گو کہ، وہ ممانی کے تو قن بدن میں آگ لگ گئی۔ چھٹا بھڑک لڑکی کچھ زیادہ ہی زبان دراز ہو گئی تھی گو کہ، وہ انہیں جتاتی رہتی تھی مگر آج تو سیزھیوں پر اس کے عقب میں اس کی صبح سے آئی سیکلی بھی موجود تھی۔ انہیں یہ مستانی برداشت سے باہر تھی۔“

”ایسے کون سے کام کروا لیے ہم نے، مگر سے باہر کے کام تو مرد ہی کیا کرتے ہیں۔“

”تو پھر آپ عادل یا منصور سے کیوں نہیں کروا تیں یہ سب کام؟ کیا وہ مرد نہیں ہیں۔“

”میں کبھی ہوں صبا! زبان سنبھال کر بات کر دو۔ بڑا اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی ہو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ تم کیوں گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے ہو ہادی! کچھ بولتے کیوں نہیں۔ ذرا بتاؤ کیا ہم نے کبھی تم سے غیر کا سلوک کیا ہے، جیسے ہمارے لیے عادل اور منصور ویسے ہی تم، کیوں؟“ وہ بے چارہ کیا بولتا۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں چچی! صرف ہادی کو عادل اور منصور جیسا نہ سمجھیں، کبھی ان دونوں کو ہادی جیسا سمجھتے ہوئے کوئی کام ان سے بھی کروا لیا کریں۔ ویسے بھی دونوں اس قدر کام چور ہیں سارا دن لیٹے لیٹے پلنگ توڑتے رہتے ہیں۔“

”ہاں تو اپنے باپ کی کمائی سے خرید اپلنگ توڑتے ہیں تمہیں کس بات پر اعتراض ہے۔“

”میری بلا سے وہ کسی اور کے باپ کی کمائی سے خرید اپلنگ بھی توڑتے رہیں۔ مجھے اعتراض ان کی ہڈ حرامی پر نہیں بلکہ آپ کی زیادتی پر ہے جو آپ ہادی کے ساتھ کرتی ہیں۔“

”ہائے میرے اللہ۔“ ممانی نے دہل کر سینے پر ہاتھ مارا۔

”کمائی کون سی زیادتی کر دی، ہم نے ہادی کے ساتھ؟..... کیا تم اور تمہاری ماں بہن نے اس سے کبھی کوئی کام نہیں کروایا۔“

”کروایا ہے، کیوں نہیں کروا دیا مگر ہم انسانیت سے عاری نہیں ہو جاتے کہ سارا دن اسے بھگاتے رہیں۔“

”لو اور سنو، کون سا ہادی کو پیدل کہیں جانا پڑتا ہے۔ اتنی اچھی حالت کی تو موٹر سائیکل دی ہے تمہارے چچا نے اسے۔“

”کیوں مذاق کرتی ہیں چچی! اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ بائیک بک نہیں رہی تھی اس لیے چچا نے اسے عطا کر دی، حالانکہ حالت کے لحاظ سے تو اسے کچرے میں پھینک دینا چاہیے تھا۔“

”انکسی ہی کچرہ حالت لگتی ہے تو اپنے باپ سے کہہ کر نئی خرید دو۔“

”اللہ نے تو فیسی دی تو ضرور خریدیں گے مگر آپ کی طرح جتاتے نہیں پھریں گے۔“ وہ قانٹا کا ہاتھ تمام کر باہر دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

”ہونہہ..... خرید دیں گے، آنے دو آج ذرا شفیق بھائی صاحب کو، کہتی ہوں ان سے مذاقہ رکھیں لاڈلی کو۔ ایسی زبان دراز کیوں کو تو کوئی بیاہنے بھی نہیں آتا۔“

”میرے غم میں آپ اپنی جان ہلکان نہ کریں چچی! ویسے بھی جب سے آپ نے بیٹے کی کمر ہے میں خاصی پر امید ہو گئی ہوں۔ اگر ان کی شادی ہو سکتی ہے تو پھر میری بھی ہو جائے گی۔“ وہ لکڑی کا بازو دروازہ عبور کرتے ہوئے بھی جواب دینا نہ بھولی تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی ہنسنا شروع ہوئی تو پھر دیر تک ہنستی چلی گئی۔

”توبہ..... کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سلیبی ہوئی طبیعت کی مالک اور بہت نرم انداز گفتگو کی حامل اپنی چچی سے اس طرح جھگڑا کر سکتی ہے۔“

اس کی بات پر صبا کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ آگے پیچھے بھی چچی کو بلکہ گھر سے نکلتی رہتی تھی مگر آج تو واقعی حد ہو گئی تھی۔

”تمہیں پتا ہے قانتا! میں ایسی نہیں ہوں۔ مگر چچی، ہادی کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں تو برداشت نہیں ہوتا۔“

”تم نے کبھی تفصیل سے بتایا نہیں کہ اصل میں یہ ہادی ہے کون؟“

گیٹ کی طرف جاتے ہوئے قانتا نے سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا۔

”میری پھپھو کا بیٹا ہے۔ اس کی پیدائش سے دو ماہ قبل پھپھو جی کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چھو۔ پہلی آگئیں پھر ہادی سات سال کا ہوا تو پھپھو جی کی بھی ڈیڑھ تھہ ہو گئی۔ ہادی کو دادو نے پالا۔“ اوہ ویری سیڈ! لیکن صبا اس کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو اس کے خلاف ہادی کو چاہیے۔ تم کیوں اس کے حق میں بول کر خود کو برا بنارہی ہو، جیسے تمہاری چچی کے تاثرات تھے اٹھا لگتا ہے آج تمہاری شکایت ضرور ہوگی انکل سے۔“

ابھی صبا کوئی جواب بھی نہ دے سکی تھی کہ قانتا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے ابھی فون ڈرائیور کو بلوایا تھا۔

”اتنی جلدی سارا دن ختم ہو گیا۔ ابھی تو بہت ساری باتیں کرنی تھیں ہم نے۔“ قانتا نے لگاتے ہوئے اداسی سے کہا۔ صبا مسکرا دی۔

”تم تو ایسے اداس ہو رہی ہو جیسے بہت دور جا رہی ہو۔ سنن آباد سے گلبرگ تک فاصلہ تو چاہو تو کل پھر آ سکتی ہو۔“

”اب میں اتنی بھی بے شرم نہیں ہوں کہ ہر دوسرے روز منہ اٹھا کر تمہارے گھر آتی رہوں۔“ ہے اب تمہیں بھی میرے گھر آنا چاہیے۔“

وہ بہت خفگی بھرے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی کا ہارن ایک بار پھر سنائی دیا۔ قانتا

جھنجھلا گئی۔ ”مجھے لگتا ہے یہ ڈرائیور ہمارا ملازم نہیں بلکہ ہم اس کے ملازم ہیں۔ مجال ہے جو کچھ دیر انتظار کرے فوراً ہارن پر ہارن دینا شروع کر دیتا ہے جیسے اس کی ٹرین جھوٹ رہی ہو، اچھا میں چلتی ہوں۔ سنو صبا اب تم نے ضرور میری طرف آنا ہے جب پلان بن جائے تو مجھے کال کر دینا میں ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔“ وہ فائنٹ باہر نکل گئی پھر ایک شان بے نیازی سے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس نے شاید ڈرائیور کو کچھ جھڑ بھی پلائی تھی۔

مگر صبا کا دھیان صرف اور صرف ایٹش گرے ہنڈا کا ڈپر نکالتا تھا۔ توبہ ایسی شاندار گاڑی، ایش کر تی ہوئی۔

وہ گیٹ سے منسلک اس چھوٹے دروازے پر جب تک کھڑی رہی جب تک قانتا کی گاڑی گلی کا موڑ نہیں مڑ گئی تھی۔

دل منہ یک حسرت نے بھر گیا۔ کیا ٹھاٹھ تھے قانتا کے۔ عالی شان بیگلے میں رہتی تھی زبردست گاڑیوں میں سفر کرتی تھی اور ایک وہ تھی جیب عیاشی کی اجازت دیتی تو رکشہ نیکیسی میں سفر کر لیا جاتا۔ نہیں تو لوکل وٹمنس زنگہ باد۔

اس کا موڈ ایک دم سے آف ہو گیا۔ بے حد بو جمل قدموں سے اندر کی جانب چل دی۔ گرد بیٹھ چکی تھی اور ہوا بڑے سریلے انداز میں دھیمے قدموں سے چل رہی تھی۔ آسان بھی خوب گھرا ہوا لگ رہا تھا مگر اس سارے منظر میں اس کی دلچسپی کا ذرا سا بھی عنصر نہیں تھا۔

وہ لاؤنج میں داخل ہو کر سیدھی اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھی۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔ لاؤنج میں کھلنے والے سارے دروازے بند پڑے تھے بس کچن کا دروازہ کھلا تھا اور وہیں سے کچھ اٹھا بیچ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس نے ایک لمبے لمبے کوسوچا پھر ادھر چلی آئی۔ توقع کے عین مطابق ہادی وہیں تھا۔ تین کرسیوں والی چھوٹی سی ٹول ڈائننگ ٹیبل پر جھکا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ دروازے کے فریم سے شانہ نکلا اسے دیکھنے لگی۔ ہادی کے ہر انداز میں بہت غلٹ تھی۔ وہ چاولوں کے پیچھے بہت بھر بھر کر منہ میں رکھ رہا تھا۔

تجسسی صبا کی نگاہ میز پر رکھے سالن کے چھوٹے سے ڈسک پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر لمبے لمبے کودنگ رہ گئی کہ سالن کی سٹائپر کئی بہت موٹی تھ جسے کوئی بھی گویا وہ ٹھنڈا کھانا ہی کھا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا ہادی کے سر پر ایک زوردار چھڑر سید کرے۔ اگر اس گھر کا کوئی فرد اس کا خیال نہیں رکھتا تھا تو اس کا مطلب یہ تو بالکل نہیں تھا کہ وہ خود بھی اپنا خیال نہ رکھے۔

”خیریت؟“

”کیا کر رہی ہو؟“

”گرم کر دیتی ہوں۔“

لیں، اسے اسٹوری طور پر دھوکہ دے کر کہیں بھی بھیج دیا۔
 ”ابو گھر آ کر پورے چینٹا لیس منٹ تک نیچے رکے رہے ہیں..... میرا خیال ہے اتنا وقت خیریت نہ
 ہو سکتا۔“ اٹھ کر لڑکائی سے ”ٹھانے مخصوص دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

”کہاں رہے سارا دن؟“ چائے کا پانی رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”وہیں جہاں روز ہوتا ہوں۔ پہلے کیسپس پھر سوئی کیس اور بجلی کا بل جمع کروایا۔ وہاں سے اکیڑی روپے پرانا رکلی..... عالیہ ماما نے کچھ چیزیں منگووائی تھیں۔“

”بہت خوب.....“ اس نے طنز سے کہا۔

”یہ ساری روٹین چچی کے گوش گزار نہیں کر سکتے تھے، وہ تمہیں فارغ فارغ کہہ کر تمہاری دوا لگا دیتے تھے۔“

”اور میں چچی کے اس ضرب دس والے فارمولے کو فیملی کرنا بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لیے تم بے فکر رہو۔“ وہ لاہروائی سے کہتی ابو کے کمرے کی طرف چل دی۔

”ابو! میں آ جاؤں؟“ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس نے اندر جھانکا۔ امی بھی موجود تھیں۔

”ہوں۔“ بونے جواب میں بس اتنا ہی کافی سمجھا تھا اور صبا کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ ان کا موزڈو اتنی خراب ہے۔ چہرے کے تاثرات میں بھی خاصی سخت تھی۔

وہ دل کڑا کر کے اندر چلی آئی۔

”میں ابو! آپ نے مجھے بلوایا تھا؟“

”بیٹھو۔“ وہ بیٹھ گئی۔

”تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے..... تمہاری چچی نے مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے۔“

”جنگی کی باتوں کو تو آپ رہنے دیں ابو! حالانکہ آپ ان کی عادات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ معمولی سی بات کو بھی اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہیں کہ بس حد نہیں۔“

”چھوڑنا صبا! وہ اگر مجھ سے کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہیں تو اپنا سمجھ کر ہی کہتی ہیں نا۔ بھلا کلا
غیروں پر بھی اتنا حق جتنا ہے۔“

اس نے ایسی بات کوئی پہلی دفعہ نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسا نقطہ نگاہ رکھتا تھا اور اسی لیے جانا
احتمق اور جسے لگتا تھا۔

”ہادی!..... حد ہوتی ہے کسی بات کی، آخر تمہیں یہ بات کب سمجھ آئے گی کہ اپنا کہہ کر یہاں سے تمہیں بے خوف بنارے ہیں اور تم ایک دم کاٹھ کے الو لگے ہوئے ہو سب کی خدمتوں میں۔“

ہادی کے منہ میں نوالہ تھا۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے بند مٹھی ہونٹوں پر رکھ کر دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مدح جڑ گئی۔ کچھ کہنا چاہا پھر ملٹ کر چائے کب میں انڈیا ملی اور پینچنے کے انداز میں کپ اٹا کر

”جو حقوق اور احساسات سے عاری انسانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔“

اس کے ارد گرد رہنے والے سارے لوگ اس کی ذات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اسے

”بیٹا جی! پہاڑ بنانے کے لیے رائی بہر حال درکار ہوتی ہے۔ تم نے ضرور ان سے بدتمیزی کی ہوگی۔“

”وہ صرف تب نہیں بھڑکتیں جب تک دوسروں کو الفاظ کی مار مار رہی ہوتی ہیں لیکن جیسے ہی انہیں نوچر حملہ محسوس ہوتا ہے وہ فوراً بھڑک جاتی ہیں، میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی ابو! صرف ایک گنگناہٹ کی تھی اور انہیں ہر پچی بات ناپسند ہے۔“

”مجھ سے تو خیر اس بارے میں عالیہ نے کوئی بات نہیں کی مگر مجھے اندازہ ہے کہ بحث کس بات پہلے ہوگی۔ تمہیں دیے بھی ہادی کی بے جا حمایت کی عادت ہے۔“ امی نے کہا۔

”بے جا حمایت۔“ اس نے بے یقینی سے امی کو دیکھا۔

”میں ہادی کی بے جا حمایت نہیں کرتی امی! میں صرف اس گھر کے ہر فرد کو احساس دلانا چاہتی ہوں کہ ہادی کے ساتھ ملازموں کا سا برتاؤ نہ کیا جائے۔ بلکہ ایسا سلوک تو اب لوگ ملازموں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔ بے چارہ باہر کا ایک کام نشتا کرتا ہے تو دوسرے کے لیے بھگادیا جاتا ہے اور.....“

وہ ابھی اور بھی بہت کچھ گونانا چاہتی تھی جب امی نے نوک دیا۔

”اب اتنی غلط بیانی بھی نہ کرو تم۔ آدھے سے زیادہ دن تو وہ خود باہر گزار کرتا ہے۔“ بات مرز

عالیہ تک محدود رہتی تو ٹھیک تھا یہاں تو ان سمیت سب کو کھیت لیا تھا اس نے۔

”اور اس آدھے دن میں بھی وہ کئی کام اسی گھر کے نشتا رہا ہوتا ہے۔ کبھی بل جمع کروانا تو کبھی راشن

لانا..... آپ خود بتائیں ابو، کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ کسی کو اسے کھانا گرم کر کے دینے کی توفیق بھی نہیں

ہوتی۔“

”اب دودھ پیتا بچہ تو ہے نہیں وہ کہ ہر کام ہاتھ سے کر کے دیا جائے۔“ اسے عالیہ چچی اور امی میں بہ

خاص فرق دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”عباد بھائی کو آپ خود کھانا گرم کر کے دیتی ہیں نا عادل اور منصور کو بھی چچی، نہ صرف گرم کر کے دیتی

ہیں بلکہ بچوں کی طرح پلیٹ میں خود نکال کر دیتی ہیں جبکہ ثانی اماں تو جب تک اپنے بیٹوں کے پاس ہی بیٹھی

رہتی ہیں جب تک وہ کھانا کھانے لیتے..... ویسے اپنا نیت کا احساس دینے کے لیے ضروری نہیں کوئی بڑے

عمل کیے جائیں چھوٹی چھوٹی باتیں ہی انسان کا مان بڑھا دیتی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتی کہ آپ لوگ ہادی سے کوئی کام نہ لیں۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ اسے صرف منہ سے

بیٹا نہ کہیں سمجھیں بھی۔ کیا فرق پڑ جائے گا اگر آپ لوگ اپنے سگے بیٹوں کی طرح تھوڑا خیال اس کا بھی کر

لیں۔ کھانے پینے کا دھیان رکھ لیا۔ کپڑے وغیرہ استری کر دیے۔ وہ بے چارہ یونیورسٹی سے آتا ہے تو

پچاس کام اس کے لیے تیار رکھے ہوتے ہیں۔“

”لو سنو ذرا..... اب یہ ہمیں بتائیں گی کہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں۔ میں پوچھتی ہوں پال پوس کر اتنا بڑا۔“

لیا احساس کے بغیر ہی کر دیا ہے ہم نے۔

باقی لڑکے ملازمتوں سے لگے ہوئے ہیں۔ پورا دن دفتر میں دماغ کھپا کر آتے ہیں۔ وہ اگر فارغ

ہوتا ہے تو تھوڑا کام کر دیتا ہے میں پوچھتی ہوں آخر اس میں برائی ہی کیا ہے۔“

”منصور اور احمد بھی ابھی کالج جاتے ہیں۔ ان کا بھی تو آدھا دن فارغ ہی ہوتا ہے مگر ان سے تو کوئی

کام نہیں کروایا جاتا..... عباد بھائی کی جب ملازمت نہیں ہوئی تھی تو ابو نے انہیں فوٹو اسٹوڈیو کھول دیا تھا کیا

بدلی ہے اگر.....“

”مبا! ہادی ابھی زیر تعلیم ہے ادھر سے فارغ ہوگا تو ہم ضرور اس کے کاروبار کے متعلق سوچیں گے۔“

آخر کو ہمارا اپنا بچہ ہے۔ مگر ابھی اس میں بہت وقت ہے۔ ادھر ادھر کی بے کار سوچوں پر دماغ لگانے سے

بہتر ہے کہ تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔“

ابو کا انداز اس قدر سخت اور دو ٹوک تھا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔

”اور سنو آئندہ مجھے شکایت نہیں ملنی چاہیے۔“ وہ بہت آف موڈ کی ساتھ باہر نکل آئی۔

”ایک سے ایک خود غرض انسان موجود ہے اس گھر میں۔“

”تمہیں کیا ہوا ہے صبا..... رو رہی ہو کیا؟“ ہادی جانے کدھر سے آ نکلا تھا۔

صبا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور ترخ کر بولی۔

”میں کیوں روؤں، روئیں میرے دشمن۔ ایک اکیلے تم اپنا حق لینے کے قابل ہو جاؤ تو مجھے اتنا دماغ

ہی نہ خراب کرنا پڑے۔“ وہ تقریباً الٹ ہی پڑی تھی اس پر۔ ہادی نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا پھر مسکرا

دیا۔

”مگر میں نے تم سے کب کہا ہے کہ میرے حق کے لیے جھگڑتی پھر دو؟ اول تو میری کوئی حق تلفی نہیں ہو

رہی، دوم یہ کہ اگر کچھ ایسا ہے بھی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”اس کا مطلب میرا ہی دماغ خراب ہے۔ عموماً بے حوس کو فرق پڑا بھی نہیں کرتا۔“ اپنی عادت کے

تین مطابق وہ پھر توڑ لیجے میں کہتی آگے نکل گئی۔ ہادی مسکراتا ہوا وہیں کھڑا رہا۔

”تمہارا دماغ خراب نہیں ہے صبا! اصل میں تم بہت اچھی ہو سارے زمانے کا درد دل میں لیے

کھوئے والی۔“

کسی خیال سے چونک کر اس نے ماموں کے دروازے کی طرف دستک کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”ویسے صبا ایک بات مجھے اب تک سمجھ نہیں آ سکی..... تم جھگڑا کرتی ہو تو ہادی کی وجہ سے، تمہیں

ڈانٹ پڑتی ہے تو ہادی کی وجہ سے آخر..... یہ چکر کیا ہے؟“ قانتا کی معنی خیز آواز ایسے نہیں پرکھتی تھی کہ
نے گہری سانس بھرتے ہوئے ریسپور کو یوں دیکھا جیسے اس میں قانتا کی شکل دکھائی دے رہی ہو مگر
سے بولی۔

”بیزہ غرق اس وقت کا جب میں نے تمہیں ساری بات بتائی۔ مگر تم یہ بات سمجھنے کی کوشش میں اپنے
دماغ کی چولیس مت ہلاؤ۔ صرف یہ بتاؤ کہ فون کس لیے کیا ہے؟“ جواب میں قانتا کا بھرپور قبضہ کھاتا تھا
”گو کہ تمہارے اس سارے ڈائلاگ میں ساری بات ہی ایسی ہے جو مجھ جیسی شخصہ کے حراج کی لڑائی
کو بھی غصہ دلا سکتی ہے مگر چونکہ میں بہت خوش ہوں اس لیے تمہاری ہر خطا معاف۔“ اس کا انداز خند
شاہانہ تھا۔

”خوش، کس خوشی میں ہو؟“
”کوئی ایسی ویسی خوشی..... بھی بہت بڑی خوش خبری ہے۔“ پر جوش انداز میں قانتا نے تمسک
پھیلایا۔

”کیا تم فوت ہونے لگی ہو؟“ صبا نے بڑے مزے سے جملہ چست کیا۔ قانتا بل بھر کو خاموش رہی
پھر تڑخ کر بولی۔

”صبا! میں سچ کہہ رہی ہوں اب تم نے مزید کوئی فضول بات کی تو میں فون بند کر دوں گی اور پھر روزانہ
سے بات کروں گی نہ ہی خوش خبری سناؤں گی۔“

اب ہنسنے کی باری صبا کی تھی۔
”اچھا بابا! اب سنا بھی چکو خوش خبری۔“

”شمن کی بات طے ہو گئی ہے۔ اگلے مہینے کی سات کو شادی اور ٹھیک دو روز بعد عقدی ہے۔“ قانتا نے
اپنی بڑی بہن کا نام لیا۔

”ارے..... سب کچھ اتنا اچانک؟ خیر..... بہت مبارک ہو۔“ اس نے جی بھر کر خوشی کا اظہار کرنے
کی کوشش کی۔

”بس یار! تمہیں تو پتا ہے، شہباز ماموں کب سے وہاں بھائی کے لیے کہہ رہے تھے مگر پہلے ہم لوگوں
کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ شمن ابھی پڑھ رہی تھی مگر اب ایک تو اس کی پڑھائی بھی مکمل ہو گئی ہے دوسرا یہ کہ وہاں
بھائی ایف آر سی ایس کرنے امریکہ جا رہے ہیں اور ان کا ارادہ جاتے ہی شمن کو بلوا لینے کا ہے۔ بس ان
لیے سب کچھ جلدی جلدی کرنا پڑ رہا ہے۔“

”شمن تو خوش ہے نا..... اسے میری طرف سے مبارک دے دیتا۔“ اس نے کہا
”ہاں! بہت خوش ہے بالکل اتنا رہنی ہوئی ہے اور میں کیوں مبارک دوں؟ یہ کام تم خودی کرنا دور۔“

بعد معنی ہے اور تم نے ضرور آنا ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں وقت بتانے لگی۔
”ہیٹ فنکشن ہے یار! میرا خیال ہے مجھے گھر سے اجازت نہیں ملے گی۔“

”مگر اسے احساس تھا کہ اسے منع نہیں کیا جائے گا۔ آج تک امی ابو نے اپنی اس لاڈلی بیٹی پر کبھی کوئی
پابندی نہیں لگائی تھی مگر کہاں اس نے اپنا فرض سمجھا۔

”کیوں نہیں ملے گی اجازت..... بھی پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری میری ہوگی، تم اپنی مرضی بتاؤ،
آئی اٹکل کو میں خود ہی مناؤں گی۔“

”اچھا میں کل تمہیں فون پر بتا دوں گی۔“ اس نے ٹال مٹول کر کے فون بند کر دیا۔ حالانکہ راضی تو وہ
دل و جان سے تھی مگر چاہتی تھی قانتا اصرار کرے اور اسے یقین تھا کہ وہ اصرار کرے گی بھی ضرور۔

”مگر کہ ان دونوں کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس مختصر مدت میں ہی وہ دونوں ایک
دوسرے کے بے حد قریب آ گئی تھیں۔

صبا کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پارٹی ویئر، میچنگ جیولری، میک اپ اس کا ارادہ بہت
اہتمام سے تیار ہونے کا تھا۔ وہ اس فنکشن میں سب سے زیادہ خوب صورت دکھنا چاہتی تھی۔ شمن سے بھی

زیادہ اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنی کوششوں میں ضرور کامیاب ہوگی۔
اپنے کمرے سے نکل کر وہ امی کے کمرے کی طرف آئی تاکہ انہیں شمن کی منگنی کا بتا سکے مگر کسی سوچ

نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔
ثنا کی شادی کے سلسلے میں انہیں جتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا انہوں نے امی کو اس معاملے میں

کچھ زیادہ ہی حساس کر دیا تھا۔ کسی کی بھی شادی، منگنی کی خبر ملتی انہیں خلیان ہونے لگتا۔ اٹھتے بیٹھتے خدا سے
نالائقیں بھی قسمت سے شکایت ہوتی تو کبھی ثنا کی کم صورتی سے۔

وہ امی کے کمرے میں آئی تو صورت حال کچھ عجیب سی تھی۔ امی کے تاثرات سمجھ سے بالاتر جبکہ
شانستہ خالد کی صورت شرمندہ شرمندہ۔ وہ اسی شہر میں مقیم تھیں اور صبح سے آئی ہوئی تھیں۔

”میں مانتی ہوں کہ میری ثنا کی عمر کچھ زیادہ ہو گئی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کسی بھی لالو پنچو
کے ساتھ اسے رخصت کر دوں۔“ وہ بہت غصے میں لگ رہی تھیں۔

”لالو پنچو۔“ خالد نے تعجب اور کچھ کچھ ناگواری سے سر اٹھایا تھا۔
”آپ کی آنکھوں کے سامنے پلا پنچہ ہے۔ کوئی بری عادت بھی نہیں اس میں رگ رگ سے واقف

ہیں آپ اس کی جس تو کہتی ہوں اس سے زیادہ عقل مند نہ فیصلہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا آپ کے کہے کے
آگے وہ آج ایک لفظ نہیں بولتا کل کیا کہے گا۔“ خالد نے تصویر کا ایک رخ دکھانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے تو حیرت ہے یہ خیال پہلے آپ کے دماغ میں کیوں نہیں آیا؟“

”اللہ بچائے ایسے خیالوں سے۔“ امی تڑخ کر بولیں۔

”تم جو مجھے ایسا مشورہ دے رہی ہو تو اس مشورے سے پہلے ایک بار ہادی کو بھی غور سے دیکھو۔
سانولا رنگ..... بس ایک قد ہی ہے تو اس کا کیا اچار ڈالنا ہے۔ میری نازک سے ٹابھلا کیا جھڑا
دونوں کا۔“

”یہ بھی خوب کہی آپ نے، بھلا مردوں کی شکل کب دیکھی جاتی ہے۔“

”شکل وہاں نہیں دیکھی جاتی جہاں جیب بھری ہوئی نظر آ رہی ہو۔ یہاں تو ایسا بھی کوئی ذریعہ
الٹا بیک ہم ہی دے رہے ہیں۔“

”تو اسے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہی شروع کروادیں بھائی صاحب۔ ماشاء اللہ محنتی لڑکا ہے مگر
سے کہہ سکتی ہوں کہ انشاء اللہ چند ہی روز میں کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا۔“

”ارے رہنے دو بی بی! جنہیں پیٹھ کر ٹھونسنے کا مرض لگ جائے تا تو پھر آسانی سے یہ مرض چھوڑتا۔“

”اتنی سنگ دلی سے نہ سوچیں آپا! ابھی اس بچے کی عمر ہی کیا ہے۔ دوسروں کے در پر پڑا ہے
زیادہ کھٹک رہا ہے مگر یہاں تو ہادی سے چار چار برس بڑے بھی ماں باپ کی ذمہ داری بڑے ہیں۔“

”یہ تو خیر تم نے سچ کہا ہادی کی عمر واقعی کم ہے۔“ یکدم امی کی آنکھوں میں چمک سی اترا آئی۔
”میری ٹائے تو ڈیڑھ سال ضرور ہی چھوٹا ہوگا البتہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری نزہت
تین سال بڑا ہے۔ اگر تمہیں ایسا ہی ہادی پسند ہے تو نزہت کے لیے سوچ لو..... کہو تو میں آج ہی با
لتی ہوں تمہارے بھائی صاحب سے.....“

ان کی آنکھوں کی چمک اب صبا پر واضح ہوئی تھی۔ باقی سب باتوں سے ہٹ کر اس آنکھوں کا
اس کے لب مسکرا دیے۔ امی کو میٹھا میٹھا طعنے لگنے میں کمال حاصل تھا اور کس مزے سے انہوں نے
خالہ کا مشورہ انہی کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔

صبا کا دل چاہا وہ کچھ دیر مزید یہاں رک کر یہ گفتگو سنے مگر اس کا دماغ فی الحال کچھ اور سوچ رہا تھا
وہاں سے ہٹ گئی۔

+

فون جانے کب سے بج رہا تھا مگر کسی کو ریسو کرنے کی فرصت نہ تھی۔
امی بہت دیر سے عالیہ ممانی کے پورشن میں تھیں۔ جانے کون سے صلاح مشورے آج کی حالت
ہی ہونا ضروری تھے۔

ٹا جانے کب سے سرنٹ لینے پڑی تھی۔ مہانے دو تین بار اس کی طبیعت کے متعلق پوچھا تھا مگر ٹا
جواب دینے کے موذ میں نہیں تھی۔ یوں تو بڑی متحرک طبیعت کی لڑکی تھی سکون سے ذرا کم ہی بیٹھتی تھی۔ ایک
کام ختم ہوتا تو دوسرا شروع کر دیتی دوسرے سے بنتی تو تیسرا تیار کر لیتی۔

”ٹا..... ٹا پلیز فون ریسیو کرنا۔“ چوڑیاں پہنتے ہوئے اس نے پلٹ کر اسے مخاطب کیا۔ ٹانے اکتا
کر بچت پر رکھ لیا۔

”تم ہی دیکھو جا کر شاید قاتنا ہی ہوگی۔“
”قاتنا کا فون تو پہلے آچکا ہے اب تک تو وہ گھر بھی پہنچنے والی ہوگی۔“ وہ اسی کے یہاں جانے کے
لے تیار ہو رہی تھی۔

”پھر ہے ہادی گھر پر وہ خود ہی دیکھ لے گا۔“
”ایک ہادی ہے، آخر وہ بے چارہ کون سا کام کرے۔“

”صبا! مجھے تنگ مت کرو، ایسی ہی ہادی سے ہمدردی ہو رہی ہے تو خود جا کر فون ریسیو کر لو، میرا دماغ
مت کھاؤ۔“ اس کے لہجے میں اس قدر بے زاری تھی کہ صبا مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکی اور کان میں بندھ ڈالنے
ہوئے باہر آ گئی۔

”السلام علیکم! کیا ہادی گھر پر ہے۔“ بہت عجلت بھرے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔
صبا بھرپور طریقے سے چونکی۔ یہ آواز اس کے لیے انتہائی مانوس تھی۔ بچپانے میں تو خیر غلطی کر ہی
نہیں سکتی تھی۔

”سعد بات کر رہے ہوتا..... کیسے ہو؟ بہت دنوں سے چکر بھی نہیں لگایا خیریت؟“ اس کا خوشگوار موڈ
کچھ اور خوشگوار ہوا تھا سمجھی اس کے اجنبیت بھرے لہجے کو بھی مائل نہیں کیا۔

”ہاں ہوس کچھ مصروفیت رہی۔ ہے ہادی گھر پر؟“ ایک بار پھر اس نے اپنا سابقہ لہجہ برقرار رکھا۔
”یہ بھلا بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟“ وہ بہت اپنائیت بھرے انداز میں ڈپٹ کر بولی مگر
”میری جانب اس کی بات کا اثر کچھ الٹا ہی ہوا تھا جس کی توقع کم سے کم صبا کو تو نہیں تھی۔

”صبا! ہر بات کے لیے، ہر وقت مناسب نہیں ہوتا۔ بات کرنے کا کون سا طریقہ درست ہے اور کون
ماتے ہماری ہادی کو بلا دو۔“

صبا کی ساری گرجوئی سننے کے بل زمین پر گر گئی تھی۔ اتنا اسلٹنگ رو یہ لگا تھا سعد کا کہ وہ دنگ رہ گئی دل
تو چاہا کہ جواب میں وہ بھی کراری سی بات کہے مگر چونکہ جھکا بہت زور دار تھا اس لیے کراہے جواب کی

بجائے دماغ نے جس پہلے مشورے سے نواز اسی پر عمل کر ڈالا۔

”ہادی! تمہارا فون ہے۔“ وہ وہیں سے چلا کر بولی تھی اور کھٹاک سے ریسور ہو لڑھکا ہوا تھا۔
 ہادی کمرے سے نکل کر ادھر ہی آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نیند کا ادھورا پن لکھا تھا۔
 ”کس کا فون ہے؟“

”پتا نہیں۔“ وہ لڑھکا مار انداز میں کہتی آگے نکل گئی۔

موڈو بری طرح سے آف ہوا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اسی وقت قاتنا آگئی تو اسے خود پر قابو پانے کی کوشش کرنی پڑی۔ اگر گھر میں رہتی تو اتنا بھی نہ کرتی کہ وہ اپنے موڈ کو اپنی پسند ناپسند کے موڈ رکھتی تھی کسی دوسرے کی خاطر اس نے اپنے مزاج پر قابو پانے کی بہت کم کوششیں کی تھیں۔ بس ایک سنا جس کی خاطر وہ اپنا موڈ بدل لیا کرتی تھی۔

”غیر اہم لوگوں کو اہمیت دینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ساتویں آسان پر پہنچ جاتا ہے۔“
 بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے دماغ کو ایک اسی نقطے سے نہیں ہٹا پاری تھی۔

قاتنا کے یہاں ملنے والی غیر معمولی پذیرائی نے اس کے موڈ پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ یہی سب کے واسطی پر وہ بہت فریٹ دکھائی دے رہی تھی۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کسی غیر معمولی احساس ہو گیا تھا۔ سارے گھر کی لائٹس تقریباً آن تھیں اور دونوں طرف کے پورشنز کے درمیان لڑائی کھلنے والے ہادی کے کمرے میں ہنگامی جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔

اسے جی بھر کر حیرت ہوئی۔

”کیا پتا، ہادی کا کوئی پرائز بانڈ وغیرہ نکل آیا ہو۔ ورنہ اس کے بغیر تو ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔“
 سب کو اس کے کمرے میں جمع ہونے پر مجبور کر دے۔ ”تجسس میں ہادی کے کمرے کی طرف بڑھو۔ اس نے سوچ ڈالا تھا مگر اسے دروازے کی دہلیز عبور کرنے کی جگہ بھی نہ مل سکی اصل میں کمرہ چھوڑنا زیادہ، تبھی تو رمہ اور شاتر تقریباً کمرے سے باہر کھڑی تھیں۔“

”آخر ہوا کیا ہے؟“

”سعد کی اپنے روم میٹس سے لڑائی ہوگئی تھی انہوں نے اسے بہت بری طرح سے زدوکوب کیا۔“
 شاتر نے اس کے جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں استفسار کرنے پر کسی عام سی بات کی طرح بتایا تھا۔
 ”کیا۔“ بے تحاشا پریشان ہو کر وہ اچک اچک کر اندر جھانکنے لگی تبھی اسے بیڈ پر منھل سے اندازہ لپٹا سعد دکھائی دے گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ خجالت آمیز تاثرات تھے اور بے تحاشا زردی۔
 سو جا ہوا تھا۔ ماتھے بازو اور ہڈی پر پٹیاں باندھی تھیں۔

اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ فوراً کس طرح ری ایکٹ کرے تبھی شاپرالت پڑی۔

”تم کم سے کم مجھے فون ہی کر دیتیں۔“

”اس سے کیا ہو جاتا؟“

”میں جلدی آ جاتی۔“ اسے سخت تاسف کا سامنا تھا۔

”جلدی آ کر تم کیا کر لیتیں؟“ شاتر کے اس جیسے سوال نے اسے بل بھر کے لیے خاموش کر دیا۔
 ”جلدی آ کر تم اس کی حصار داری کی وجہ سے کہہ رہی ہو تو اس کے لیے یہاں پہلے سے ہی بہت لوگ

”اور اگر تم اس کی حصار داری کی وجہ سے کہہ رہی ہو تو اس کے لیے یہاں پہلے سے ہی بہت لوگ

”تمہارے لیے اب سب کے لیے ملتا تھا۔“

”مگر مجھ کو اس بات پر تھا؟“

”یہاں سب لوگ یہی سوال باری باری اس سے پوچھ چکے ہیں۔ تم بھی جا کر پوچھ لو۔ ورنہ کچھ صبر کر

اب تو سعد بہت دن تک یہیں رہے گا کسی نہ کسی تو پتا چل ہی جائے گا۔“

”بہت دن۔“ مبا کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھی تھیں۔

اندرا اس کی امی سعد سے کہہ رہی تھیں۔

”میں تو ان ہی نہیں سکتی کہ جھگڑے میں تم نے پہل کی ہوگی، تم تو اتنے ٹھنڈے مزاج کے بچے ہو۔“
 دی! یہ تم نے بہت اچھا کیا جو اسے ساتھ ہی لے آئے۔ ان نامرادوں کی کیا خبر؟ ہم نے تو پہلے بھی کئی بار کہا کہ یہیں آ کر رہو مگر بیٹے! تمہیں ہی ہم سے غیریت برتنے کا شوق ہے، حالانکہ ہم نے کبھی تم میں فرق نہیں کیا۔“

اس وقت یہاں کوئی انجینی بھی آ جاتا تو با آسانی اندازہ کر سکتا تھا کہ سعد احسان کو ملنے والی اہمیت اور پسندیدگی کا گراف اس گھر میں کتنا بلند ہے۔

”جی کمائی! آپ کا شکریہ۔“ اس کی آرام سے سو جانے کی خواہش دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی تھی مگر یہاں کی کو احساس ہی نہ تھا۔

”اے شکر یہ کیسا بیٹے۔۔۔۔۔ میں تو کہتی ہوں تم عباد کے کمرے میں چلے چلو۔ وہ کمرہ بڑا بھی ہے اور ٹھنڈا بھی، پچھل طرف جو کھڑکی ہے ادھر سے بڑی اچھی ہوا آتی ہے۔“ انہوں نے گویا لالچ دیا۔

عالیہ عیسیٰ نے کچھ تسخرانہ نگاہوں سے جیٹھانی کو دیکھا اور بولیں۔
 ”آئے تو عادل کا کمرہ کیا بڑا ہے۔ کشادہ بھی ہے پھر کھڑکی سے ہوا نہیں آتی خیر سے اے سی لگا ہوا ہے۔“

”اصل میں، میں ہادی کے ساتھ ہی ریلیکس رہ سکوں گا۔ ابھی دو تین روز تک تو مجھے اٹھنے بیٹھنے میں بھی مدد دے رہی اور عادل یا عباد ہر وقت تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتے جبکہ آپ لوگوں کے کہنے کے مطابق ہادی کو کوئی کام ہی نہیں ہوتا تو چلیں چند روز یہ بھی کوئی کام کر لے گا۔ یہ کمرہ بھی اچھا خاصا ٹھنڈا ہے، البتہ

منجائش کچھ کم ہے۔ یہ پٹیاں بکے اٹھا دیے جائیں تو اچھی خاصی منجائش پیدا ہو سکتی ہے۔“

”ارے ہاں کیوں نہیں..... یہ انھوں نے کرنا ہی نہیں دیکھا ہے۔ اسٹور میں رکھوا دیتے ہیں اور کافی منجائش ہے۔“
مصباح نے ایسے موقع پر گرفت کی تھی کہ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔ اگر جو سعد موجود نہ ہوتا تو خیر بہ طور حرح طبیعت صاف کرتیں۔ مگر خیر انہوں نے کون سا حساب رہنے دینا تھا۔ اب کا بدلہ کسی اور موقع بہا لیتیں۔

سعد نے اکتا کر پہلو بدلا اور مد طلب نظروں سے ہادی کو دیکھا، مگر بے کار کوشش تھی فی الحال کلام اٹھنے کو تیار نہ تھا۔

+

”آخ آپ یقین کر کیوں نہیں لیتیں کہ میں کافی بڑا ہو چکا ہوں۔ جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی بھی..... جی نہیں مگر غلط اور صحیح کے درمیان فرق کرنا آتا ہے مجھے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میں مجرم میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ البتہ کوئی خود پہل کر رہا ہو تو اسے بخشا بھی نہیں ہوں۔ بزدلوں کی طرح پیچھے ہٹتا۔“

اصل میں ارباز نے مجھ سے کچھ رقم ادھار لے رکھی تھی کل میں نے واپسی کا تھا ضا کیا وہ وہ مانا گیا۔ بس یہیں سے تھوڑی بحث ہو گئی۔ بات یہیں تک رہتی تو پھر بھی تھا مگر ارباز نے مغلطات شروع کر دیں تو میری برداشت بھی ختم ہو گئی۔ گردن سے اسے پکڑ کر منہ پر اتنے گھونے مارے کہ وہ مارا ہو گیا۔“

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھا سعد موبائل پر بات کر رہا تھا جبکہ اسائنمنٹ مکمل کرتے ہادی کے لیے مستقل ایک مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔

سعد کا انداز گفتگو تھا بھی تو اس قدر دلچسپ۔

”ہا ہا..... آپ بھی کمال کرتی ہیں امی! اپنے اتنے ٹیلنٹڈ بیٹے کے ٹیلنٹ پر تو آپ کو بھر دے گی ہے۔ سبھی تو اس طرح کہہ رہی ہیں۔“

”نہیں، نہیں..... اس وقت تو میں نے ارباز کو ٹھیک کر کے رکھ دیا تھا مگر شام کو وہ اپنے تین ننھیلا لے کر آ گیا اور ان کے پاس میری طرح صرف گھونے نہیں تھے بلکہ بڑے موٹے ڈنڈے تھے۔“
بھئی میں زندہ سلامت ہوں۔ یقین کریں ایک بھی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ میں اسی لیے آپ کو اطلاع نہیں رہا تھا کہ پھر آپ رونا شروع کر دیتی ہیں مگر یہ ہادی کا بچہ.....“

اس نے ہادی کی طرف دیکھ کر دانت کچکپکپائے۔
”اسی لیے کہتے ہیں، یہ یوقوف دوست سے دانا دشمن بھلا..... ذرا آپ رونا اور فون دونوں بند کرنا

پھر میں اس یوقوف دوست کی طبیعت صاف کرتا ہوں۔“

بس بھی کریں امی، اصل میں تو آپ جیسی چھوٹے دل کی مائیں ہی اپنے بیٹوں کو محبت کا واسطہ دے دے کہ بزدل بنائے رکھی ہیں۔ جی نہیں میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔ ارباز گروپ کو تو ضرور مزہ چکھانا ہے۔“
”ہادی کو..... اب اسے کون سی انٹرکشن دینی ہیں آپ نے؟..... اوکے، اوکے لیں کر لیں بات۔“
”لو میں کر داتی ہوں پچھی جان سے بات۔“ سعد نے فوراً ہی موبائل اس کی جانب اچھال دیا تھا جسے ہادی نے بے شکل کچ کر لیا۔

”جی چھو! السلام علیکم..... جی جی اللہ کا شکر ہے آپ سنائیے۔“ اب وہ بول رہا تھا اور سعد سن رہا تھا۔

”نہیں پچھو! سعد نے جھوٹ نہیں کہا۔ چونیس تو خیر آئی ہیں مگر اتنی شدید نہیں ہیں۔ انشاء اللہ ایک ہفتے میں دوڑنے لگا۔ ہا ہا! جی جی آپ اس کی فکر نہ کریں، یہ اب یہیں رہے گا ہائل کا تو اب بس نام ہی یاد رہتا ہے اسے۔ کہتا ہے تو کہنے دیں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اس پر بھروسہ نہیں ہے تو کم سے کم مجھ پر کریں۔ میں اسے کہیں جانے نہیں دوں گا..... کون وہ ارباز وغیرہ، کہا تا ٹینشن فری ہو جائیں۔ ان سے تو اب میں سعد کا سامنا ہی نہیں ہونے دوں گا۔“

”جی ہاں؟ سو تو چھوٹا سا بچہ ہے جس کی انگلی پکڑ کر یہ اسے چلائیں گے۔“
سعد ہڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے کہے بنانہ رہا۔ امی کی تشویش اپنی جگہ درست تھی مگر جس قسم کے بزدلانہ رویے اسے دے رہی تھیں وہ اس کے لیے قطعی ناقابل عمل تھے۔

تب ہی اس کی نگاہ صبا پر پڑی۔ وہ دروازے میں کھڑی غالباً تذبذب کا شکار تھی۔

”ارے صبا وہاں کیوں کھڑی ہو اب تک؟ اندر آ جاؤ۔“

صبا سکرانی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ ایک نظر موبائل پر مصروف ہادی پر ڈالی اور پھر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ صبح کی طرف بڑھا دی۔

”بیانی نے تمہارے لیے بھجوایا ہے۔“ سعد نے پلیٹ کو دیکھا پھر اسے۔

”کیا ہے؟“

”گاجر کا طلوہ۔“

”واقعی۔“ سعد نے ایک دم پر جوش ہو کر ہاتھ بڑھایا تھا مگر تازہ زخم تھا ایک کراہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی تھی۔

”اعتیاد سے بھئی..... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ صبانے پلیٹ اس کے قریب رکھ دی۔ چچہ بھی ساتھ لائی تھی۔ سعد نے کھانے میں بھی جلجت کا مظاہرہ کیا۔

”زبردست..... مگر اس موسم میں گاجریں کہاں سے مل گئیں اور تمہیں کیسے پتا کہ مجھے گاجر کا ملنا ہے؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”مجھے تو نہیں پتا تھا سب کچھ، امی نے کیا ہے صبح سے لگی ہوئی تھیں۔“

اس نے فوراً ہی بتا دیا۔ اپنی دلچسپی کے باوجود کوکومیش ہی برتر مقام پر دیکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ”اچھا۔“ جانے کیوں وہ چھپکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ان دونوں کے مابین خوشی کا مختصر سا وقفہ آواز میں ہادی کی آواز گونج رہی تھی تب ہی صبا نے پوچھا۔

”اب کسی طبیعت ہے تمہاری؟“

”بڑی جلدی خیال آ گیا۔“ اس کے لہجے میں بڑا واضح شکوہ تھا۔ صبا کے لیوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”میں تو کل بھی پوچھنا چاہ رہی تھی مگر ایک تو ادھر سب جمع تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔“ دوسرا میں نے سوچا کہ تم آرام کر لو تو یہی بہتر ہے۔ حال تو بعد میں بھی پوچھا جاسکتا تھا۔“ سعد نے نظریں اٹھا کر اسے لیوں دیکھا جیسے اس کی وضاحت کی سچائی کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ ”مجھے لگتا تم ناراض ہو؟“ کیا یہ خدشہ تھا؟ صبا نے یقین کرنے کی کوشش کی اور لا پرواہی سے بولا۔ ”وہ بھلا کیوں؟“

سعد کو شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی تب ہی خوش سا ہو گیا پھر جیسے بہت سوچ کر بولا۔

”میں نے تم سے مس بی ہو کیا تھا؟“

”مس بی ہو کی بھی کوئی وجہ تھی۔“ اس کے انداز میں اب بھی پہلے کی سی لا پرواہی تھی۔ تبھی ہادی ہوا آف کر چکا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی حالانکہ دل ابھی اٹھنے پر راضی نہ تھا۔

+

”ٹٹا کے لیے جو پر پوزل آیا ہوا تھا اس کا کیا بنا؟“

صبا کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے قاتنا نے پوچھا تھا۔ پلیٹ میں فرنج فراز اور نکلس کے ساتھ کاشن بھی تھا۔

”ہونا کیا تھا یا رادہ لوگ آئے، کھایا پیا اور چلے گئے۔“ صبا کے لہجے میں تنگی جھلک رہی تھی۔

”انہیں تو اتنی بھی توفیق نہ ہو سکی کہ ایک پانچ روپے کی کال کر کے معذرت ہی کر لیں۔“

ہوں تو۔ دوسروں کو امید و ناامیدی کے درمیان چھوڑتے ہوئے ان کے دلوں کو کچھ نہیں ہوتا؟ اصل بات ہے کہ لوگوں نے دوسروں کی اولاد کو اپنی مرضی کے مطابق فریٹ کرنا شروع کر دیا ہے، انسان کو خوشی دینا سمجھتے ہیں۔ آئے، دیکھا، پسند آیا تو ٹھیک در نہ چھوڑ کر آگے چل دیے۔ شو پیسز کے بھی کوئی احسان کرتے ہیں؟“

وہ گرل پر کبھی نکالے ڈرنک کا تلخ مھونٹ بھر رہی تھی۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ذرا دیر پہلے برسنے والی چند ہی بوندوں نے عجب سی تازگی ہر طرف بھری تھی۔ آسان کئی رنگوں میں بنا دکھائی دینے لگا تھا اور ہوا میں بے حد تراوٹ تھی۔

”نیکول ڈاؤن صبا! اس طرح اپنا خون جلاانے سے بھلا ہو بھی کیا سکتا ہے۔“ قاتنا ڈرنک کا مھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

”مسل میں، میں آج تمہاری طرف آئی ہی اس سلسلے میں ہوں۔ مہما تو مجھ سے کب سے کہہ رہی تھیں

کہ تم سے بات کروں بس آج دھیان آیا تو چلی آئی۔“

صبا کے دل کو جیسے کسی نے ٹھکی میں جکڑا تھا۔ اس کی ساری حیات چونک کر قاتنا کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔ ایک خیال ذرا مختلف انداز میں پورا ہونے جا رہا تھا۔

”چلو یہ بھی ٹھیک ہے، ٹٹا ہی تھی۔“

اس نے لمبے کے ہزارویں حصے میں ساری ہلکولیشنز مکمل کر کے گویا بڑے دل سے فیصلہ کر ڈالا تھا۔

قاتنا کا ایک آخری بھائی جو فی الحال غیر شادی شدہ تھا۔ شاید قاتنا اسی کے متعلق بات کرنے جا رہی تھی۔

”میری خالہ کا بیٹا ہے نعمان، ایم کام کر رکھا ہے اور بینک میں جاب کرتا ہے، گوکہ خالہ کا گھرانا بہت

امیر نہیں ہے مگر پھر بھی ان کی مالی حیثیت بہت اچھی ہے۔ نعمان کے علاوہ دو بہنیں ہیں بڑی والی میر ڈ ہے جبکہ چھوٹے کی لکھنٹ ہو چکی ہے، خالہ کا ارادہ نعمان اور افشاں کی شادی ایک ساتھ ہی کرنے کا ہے۔“

”خالہ کا بیٹا..... بینک میں ملازم اچھی مالی حیثیت، دھت تیرے کی۔“ اسے جیسے انتہائی مایوسی ہوئی۔

”یہاں تو ذات برادری کا جھنجھٹ بھی نہیں ہے کہ تم لوگ بھی شیخ ہو اور ہم بھی۔ تم آنٹی سے بات کرو

اور اگر مناسب لگے تو کسی روز ہمارے یہاں ہی ملاقات رکھ لیتے ہیں، نعمان بھائی کو بھی میں بلواؤں گی تم

ظاہر ہے کہ ٹٹا کے خیالات سے واقف تو ہوگی ہی۔ تو انہی خیالات کی روشنی میں نعمان کو پرکھ لیتا۔ میں یقین

سے کہہ سکتی ہوں صبا کہ تمہیں ان سے مل کر ذرا بھی مایوسی نہیں ہوگی۔ شکل بھی اچھی ہے اور عادات تو خیر

بہت ہی اچھی ہیں بس..... ایک ہی خالی ہے جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مالی حیثیت تمہوڑی کمزور

ہے۔“

”یہ کوئی معمولی خامی ہے، بلکہ یہی تو سب خامیوں کی جڑ ہے۔ دولت ہونے نہ ہونے سے کیا فرق

پڑتا ہے بس اچھے لوگ ہونے چاہئیں پڑھے لکھے اور عزت دار۔“ بظاہر اس نے بڑی لا پرواہی سے اپنا نقطہ

نظر واضح کر دیا تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے میرا خیال ہے نیکسٹ سنڈے رکھ لیتے ہیں۔“ قاتنا بہت پر جوش ہو کر بولی۔

”میں خود سے تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتی البتہ امی سے بات کرنے کے بعد تمہیں کال کر دوں گی۔“ اس

نے حقیقتاً جان چھڑائی تھی اور بات پلٹنے کی غرض سے نیچے لان میں جھانک کر بولی۔

”ان لڑکوں کو تو نجانے آج کیا ہو گیا ہے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔“

قانتا اس کی تقلید میں نیچے کی طرف دیکھنے لگی، وہ چونکہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی اس لیے تقریباً ہر بات سے واقف تھی۔ مگر وہ لڑکا، جس کے ماتھے اور بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور جو اس وقت گاہر سے بیٹ لینے کے لیے بحث کر رہا تھا۔

”یہ بلوشرٹ والا لڑکا کون ہے؟ تمہارا کزن تو نہیں لگتا۔“

”کیوں؟ میرا کزن کیوں نہیں لگتا؟..... جو میرے کزن ہیں، ان کے کیا ماتھے پر لکھا ہوا ہے؟ میرے کزن ہیں۔“ صبا نے تعجب سے کہا۔

”یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ تمہارا کوئی بھی کزن اتنا پیٹنڈم نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ شرمناک صبا نے بلا تکلف اس کے شانے پر چپٹ رسید کی۔

”خو! خواہ..... تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ ورنہ میرے سارے کزن ہی پیٹنڈم ہیں۔“ وہ خود بھی مکرانہ تھی۔

”اور ان میں سب سے زیادہ پیٹنڈم تو ہادی ہی ہوگا۔“ وہ اب دائیں طرف کے برآمدے نماں تھلگ بیٹھے ہادی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ صبا پھر حیران ہوئی۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟“ اس نے ہادی کی جانب بغور دیکھا۔

”تمہارے کزن میں صرف ایک ہادی ہے جس میں تمہیں دنیا جہاں کی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں اور ہے کہ پیٹنڈم بھی سب سے زیادہ وہی لگتا ہوگا۔“ قانتا نے اسے بڑی سنجیدگی سے چڑایا۔

”خیر میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا تھا اس میں دنیا جہاں کی خوبیاں ہیں اور نہ ہی میں نے کبھی اسے کہا ہے مگر وہ اچھا ہے آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟“ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ برآمدے کے فرش پر بیٹھ ہادی کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں خیر برائی تو کوئی بھی نہیں ہے بس قدر توڑا چھوٹا ہے۔ شکل سے توڑا گاؤ دی بھی لگتا ہے اور رنگ توڑی کالی ہے۔“ اس کے لہجے میں تسخیری تسخر تھا۔

”تو جو شکل سے گاؤ دی لگتے ہیں کیا وہ انسان نہیں ہوتے؟ قدر اس کا چھوٹا نہیں ہے بے حد ہلکا اور اگر چھوٹا ہے تو کوئی خاص فرق نہیں خیالات چھوٹے نہیں ہونے چاہئیں۔ رنگت کالی ہو پر دل کالے ہوں باقی تو سب خیر ہے۔“

”کم آن صبا! تم تو سیریس ہی ہو گئی ہو۔ بھی میں تو مذاق کر رہی تھی۔“

”یہ بھی خوب رہی، کسی کی پوری ذات زیر بحث آگئی اور آپ کا ظہر انداز۔“

”اچھا! سوری اب تمہارے اس ہادی کی شان میں میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکلے گا..... اب خوش، کم سے کم اب ہی بتا دو کہ اس نام کروڑ سے تمہاری کیا رشتہ داری ہے؟“

”بس رشتہ داری ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے۔“ بدلتے ہوئے موضوع پر اس کا موڈ کافی خوشگوار ہوا تھا۔

”رشتہ داری کبھی کبھی بس رشتہ داری نہیں ہوتی کوئی تو ہوتی ہے دور کی یا قریبی۔“

”اور اس رشتہ داری کو کیا کہتے ہیں جس کا تعلق براہ راست دل سے جڑا ہوتا ہے قریبی یا دور کی؟“ اس کا لہجہ مستی خیز تھا اور جسم بھی۔ قانتا چونکی۔

”یہ صرف قریبی رشتہ داریاں نہیں ہوتیں بے حد قریبی ہوتی ہیں..... ویسے اگر میں غلط نہیں سمجھ رہی تو یہ سدا ارسلان ہے۔ ہادی کا بھتیجا زاد بھائی۔“

صبا نے مسکراتے ہوئی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر جیسے ساری دنیا کی روشنیاں جھکناکھی تھیں۔

”ہوں۔“ قانتا نے پرسوج ہنکارا بھرا۔ اس کی نگاہوں میں سعد کے لیے بے حد ستائش دکھائی دے رہی تھی۔

”تو یہ ہیں وہ موصوف، جنہوں نے ہماری صبا کی راتوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔“ اچھی طرح سے سعد کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد قانتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ صبا ہنستے ہوئے کرسی پر جا بیٹھی۔

”جی نہیں..... اصل میں یہ ہیں وہ موصوف جن کی راتوں کی نیند میں نے اڑا رکھی ہے۔“

”اس نے جنہیں خود بتایا ہے۔“ قانتا تجسس سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”منہ سے تو نہیں بتایا مگر کوئی زبان آنکھوں کی بھی ہوتی ہے۔“ وہ ہنوز مسکراتی تھی۔

”دعوت تیرے کی۔“ قانتا نے ناگوار سے کہا۔

”یہ مرد بڑے چال باز ہوتے ہیں ان کی محبت پر تب تک یقین نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ یہ منہ سے نہ کہہ دیں۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں جب منہ سے کہہ دیں تب بھی یقین نہیں کرنا چاہیے انہیں تو زبان سے بھرتے بھی دیر نہیں لگتی۔“

اس کی بات پر صبا جو ہنسنا شروع ہوئی تو پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

”تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے بہت تجربے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہو۔“

”محترمہ! ہر ایک کو سبق حاصل کرنے کے لیے تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی کوئی چیز مشاہدہ بھی ہوتی ہے۔“ اسے اپنے موقف پر ڈٹنے دیکھ کر آخر کار صبا کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

”لیکن یہ سدا اپنے گھروالوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتا۔“

”اس کے گھر والے دعویٰ میں رہتے ہیں اور نہ خود بہت عرصے سے پڑھائی کے سلسلے میں پاکستان آیا

ہوا ہے۔ بہت شروع سے ہی یہ ہاسٹل میں رہ رہا ہے مگر اب اس کے ہاسٹل میں کوئی مسئلہ ہو گیا تھا اس لیے ہادی اور ابواسے یہاں لے آئے۔ اب سعد یہیں رہے گا۔“

”پھر تو یہ مسئلہ تمہارے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا ہے۔ سنا ہے، محبوب آنکھوں کے سامنے نہ بڑا اچھا ٹھیل ہوتا ہے۔ میرا تجربہ تو خیر اس معاملے میں تقریباً صفری ہے مگر تم مجھے اپنی فیلگو ضرور بتانا آگیا تو چلے اس میں کتنی سچائی ہے۔“

ویسے ایک بات ہے جب تک تم نے مجھے سعد کے بارے میں نہیں بتایا تھا تب تک میں سمجھتی تھی کہ ہادی میں انٹر سٹڈ ہو۔“

”صبا اس وقت پانی پی رہی تھی یکدم ہی اسے بری طرح اچھوٹک گیا۔“

”دماغ تو نہیں خراب تمہارا..... میں اور ہادی..... اومانی گاڈ..... یعنی کہ حد ہوگئی۔“

اس نے گویا بڑی انوکھی بات سنی تھی تب ہی عجیب لگنے کے ساتھ ساتھ اسے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ”سعد کو دیکھنے کے بعد مجھے تمہاری پسند کا صحیح انداز ہوا ہے اور اب واقعی اس بات پر ہنسی آ رہی ہے کہ میں کتنا غلط سوچ رہی تھی۔ مگر صبا! میری ایک بات کو تم غلط نہیں کہہ سکتیں کہ جتنی تم ہادی کے ساتھ لگن رکھتی ہو اور جتنا اسے فور کرتی ہو اس سے تو کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے۔ ممکن ہے خود ہادی بھی ایسا سوچتا ہو۔“

”ہادی معصوم ہے، بے وقوف نہیں..... وہ میرا دوست ہے اور یہ بات وہ خود بھی بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ کیونکہ اسے ہمدردی اور محبت میں فرق بہر حال کرنا آتا ہے۔“ اس نے بہت واضح انداز میں فائدہ کو رد کر دیا تھا۔

”ہادی تمہارا دوست ہے۔ وہ تمہاری سوچ سے واقف ہے اور بقول تمہارے اسے ہمدردی اور محبت میں فرق کرنا بھی آتا ہے۔ مگر میری پیاری سہیلی! یہ فرق ہر کسی کو کرنا نہیں آتا ہے۔ ہادی کو تم دوست سمجھتی ہو مگر ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کی سوچ تمہاری طرح صاف ستھری ہی ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں اسے لکھ کرنے میں اب تھوڑی احتیاط کرنی چاہیے خصوصاً اب جب کہ سعد بھی اسی گھر میں آ گیا ہے۔“

قائنات نے ایک اچھی سہیلی کی طرح اسے خبردار کیا تھا۔ صبا کچھ دیر اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی پھر اٹھ کر گرل تک آ گئی۔ لان میں ابھی بھی ہنگامہ تھا۔ بس پوزیشنز بدل گئی تھیں۔

سعد کے ہاتھ میں اب بیٹ آچکا تھا جبکہ ہادی کیوں کے درخت کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مہمان محض چند لمحوں میں ان دونوں کا مقابل کر لیا تھا۔

ان دونوں میں واقعی بہت فرق تھا۔ ایسا فرق جسے کوئی بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ صبا کے ذہن نے بہت تیزی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہادی اور سعد کے مابین سراٹھا کر کھڑے، اس فرق کو نہیں بدلنا چاہتی تھی

اسے اپنی قسمت کو بدلنا تھا اور قسمتیں کوششوں سے ہی بدلا کرتی ہیں۔

+

”کام کوئی چھوٹا ہوا بڑا۔ ایک بات تو طے ہے کہ اس کام کے پیچھے اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور کار فرما ہوتی ہے اور میں تو اس بات پر دل سے یقین رکھتا ہوں کہ مصلحت جلد یا بدیر دکھائی بھی ضرور دے جاتی ہے۔ اب دیکھو خدا نے مجھے کتنا خیر نہیں دیے تو اس کے پیچھے جو مصلحت ہے وہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ بھائی! اس کا اپنا ہی تو نقصان ہے۔ مگر یار! ایک بات مجھے اب تک سمجھ نہیں آئی۔ اللہ نے تمہیں گزارے لاکھ بھی محنت نہیں دی تو اس کے پیچھے کون سی مصلحت ہے۔ کیا تم اس ایک پوائنٹ پر روشنی ڈالنا پسند کرو گے۔“

”روشنی تو نہیں البتہ میں تمہیں اس کمرے سے باہر پھینکنا ضرور پسند کروں گا، پتا نہیں وہ کون سا منحوس لوج تھا جب میں نے تمہیں اپنے کمرے میں رہنے کی اجازت دی تھی۔“

”آہ..... بھلا کیا خوش فہمی اور غلط فہمی ہے۔ تم سے اجازت مانگی کس نے تھی۔“

سعد نے بڑے واضح الفاظ میں اس کا مذاق اڑایا تھا۔

”اور جناب محترم! یہ تو ہماری محبت تھی جو آپ کے اس کابک میں رہنے چلے آئے، ورنہ ہمیں تو گھر کے سب سے اچھے رومز آفر کیے گئے تھے۔ ایک میں اے سی تھا، دوسرے کی کھڑکی بہ ذات خود اے سی تھی۔“

”اور میرے بھائی! تجھے اللہ کا واسطہ ہے مجھ پر تو پہلے ہی کئی محبتوں کے بار ہیں ایک اور کا اضافہ نہ کر تیرا مرضی ہے جس کمرے میں جا۔ قسم خدا کی میرا سر در سے پھٹ رہا ہے۔“

”کب ہا..... میری ہی غلطی ہے یار! بندے کی شکل دیکھ کر بات کرنی چاہیے، اب میں ایسے شخص سے کیا امید کروں اور کیا اس کی سوچ میں تبدیلی لانے کی کوشش کروں جو محبتوں کو ”بار“ سمجھتا ہے سر بادوں تمہارا؟“

”نہیں۔“ وہ تشریح کر بولا۔ ایسے نازخوے کب اٹھائے تھے کسی نے اس کے۔ پیار بھی ہوتا تو کسی کو خبر تک نہ ہوتی اور پچھرا خود ہی بھلا چکا ہو جاتا اور پھر ایک وہ وقت بھی آیا جب اس کے نزدیک چھوٹی موٹی نیازیوں کی اہمیت بھی مٹ گئی۔

”اچھا پھر گلابادوں؟“ سعد ابھی تک پچھلے موڈ میں تھا۔

”ہاں مہربانی ہوگی۔“ وہ پھر جھنجھلا کر بولا۔

”اگر سے چھوڑو یار! ایسی بھی کیا مہربانی؟..... بھی ہم تو یاروں کے یار ہیں۔“ نہایت لاپرواہی کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ ہادی کی گردن کی جانب بڑھائے تھے۔

ہادی کو اب اس حد تک بھی سعادت مندی کی امید نہیں تھی، جھنجھلا کر اس کے ہاتھ جھٹکے اور اٹھ کر بیٹھ

”سعد! دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔“ ایک تو تیز بخار، پھر سعد کی زچ کر دینے والی گفتگو اور ترکہ شدہ ”سو فیصد..... البتہ تمہارا دماغ ذرا بھی ٹھیک نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔“ دہر پھر اکربات کو بالآخر وہیں لے آیا تھا، جس نقطے سے ہادی کتر اہا تھا۔

”میں بیمار ہوں۔“ اس نے جیسے اسے احساس دلانے کی کوشش کی مگر سعد، سعد تھا جس نقطے پر نہ جاتا پھر اس نقطے سے اسے ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا تھا۔

”بات ساری برداشت کی ہے، ورنہ ایک مدت سے میں خود بیمار ہوں مگر تمہاری طرح دانا تو نہیں چایا۔“

گو کہ جب سعد اس طرح کے موڈ میں ہوتا تھا تو اس سے سنجیدگی کی امید تقریباً عبث ہی تھی مگر اس وقت ہادی چونک سا گیا۔

”کیا بیماری ہے تمہیں؟“ اس نے کسی قدر تشویش سے سعد کی شکل دیکھی تھی۔ سنجیدگی سے جواب دیا۔

”دنیا کی سب سے جان لیوا بیماری..... یعنی کہ عشق۔“

”لعنت ہے سعد! آخر تم کبھی سنجیدہ کیوں نہیں ہوتے؟“

”تم سے کس نے کہا کہ میں سنجیدہ نہیں ہوں اور میرے بھائی! جب تک جذبے میں سنجیدگی نہ عشق، عشق نہیں بنتا..... لیکن خیر تمہیں ان باتوں کا کیا پتا، بندر کیا جانے اور ک کا حرہ۔“

”ٹھیک ہے پھر تم سنجیدگی سے عشق کرتے رہو مگر میرا چچا جھوڑ دو۔ مت خراب کرو میرا دماغ۔“ اس نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں لیٹ کر تکیہ منہ پر رکھا تھا۔

”جو چیز سرے سے ہے ہی نہیں اس کے خراب ہونے کا اتنا خدشہ کیوں رہتا ہے تمہیں؟ یقیناً ہادی! دماغ خراب ہونے کے لیے دماغ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تم نے خواہ مخواہ کی ٹینشن پال رکھی ہے اگر تمہارے پاس دماغ ہوتا اور اس دماغ میں تھوڑی بہت عقل ہوتی تو اب تک تم ایک صحیح فیصلہ نہ کر چکے ہوتے۔“

”سعد! پلیز.....“

”انف ہادی!“ سعد یکدم ہی بہت سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔

”رات امی کا فون آیا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کنوینس کروں اور یار! آخر اسامی برائی بھی کیا ہے؟ اچھا ہے تمہارا کاروبار سیٹ ہو جائے گا۔“

”یار! میرے تینوں ماموں، ان کے سارے بچے ملازمت پیشہ ہیں، صرف عباد نے کچھ عرصے کے لیے ایک فوٹو اسٹوڈیو کھولا تھا مگر پھر جاب مل جانے کے بعد وہ بھی بند کر دیا۔ سعد! تم سمجھتے کیوں نہیں

ہمارے خاندان میں دکان داری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“

”دکان داری۔“ سعد کو بڑے زور کا جھکا لگا۔

”ہاں پر بڑی کلاس کا شوروم سیٹ کرنے کا ارادہ ہے ہمارا، تم ٹھٹ سے میجر کی کرسی سنبھالنا۔“

ہادی مسکرا دیا۔

”اور دکان دار اور میجر میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

”نہیں کوئی فرق نہیں ہے، جب گدھے میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے تو پھر دکان دار اور میجر میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔“ سعد بہت غصے میں تھا۔

”میں کسی کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہتا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس گھر کے افراد کے خیالات نے جسب اتنی بری طرح سے جکڑا ہوا ہے کہ تم اپنے لیے بھی صحیح غلط کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہے، نہ ہی تمہیں قول و فعل کا فرق سمجھ آتا ہے، ورنہ سوچنے کو تو تم یہ بھی سوچ سکتے ہو کہ اشفاق ماموں نے بھی تو اسپئر پارس کی دکان کھول رکھی ہے۔“

”وہ ان کا پارٹ ٹائم کام ہے۔“

”ہے تو نا۔“

”پھر بھوکو میری طرف سے شکریہ کہہ دینا سعد اور ان سے یہ بھی کہنا کہ میں ان کی محبت کی، دل سے قدر کرتا ہوں مگر.....“

”رہنے دو یار! میں سمجھ چکا ہوں تمہیں اتنی عمر میں بھی محبت کی قدر کرنا نہ آئی اور نہ ہی اصل محبت کی پہچان ہوگی۔“

”بالکل صحیح..... وہ شکلیں کوئی اور ہی ہوتی ہیں جو محبتوں کو پہچان کر ان کی قدر کرتی ہیں۔“ صبا کی آواز پر دونوں چونک کر دروازے کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ پھولا ہوا چہرہ، خفا خفا سا انداز گفتگو۔

”دنگا ہوں نے اسے بڑے دل سے دیکھا تھا۔“

”اور سعد! تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“ وہ ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آگئی تھی۔

”آئیے طویل مدت سے میں اسے یہی سب سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے ”اصلی محبت“ کا چہرہ دکھانے کی خواہش میں، میں بوڑھی ہو جاؤں گی مگر یہ شخص اپنے خول سے باہر نہیں نکلے گا۔ کاش میں نے بھی اپنے دل کو سمجھ لیا ہوتا۔“

اس نے ٹرے پر بیٹھتی اور باہر نکل گئی۔

ہادی نے اٹھ کر ٹرے پلنگ پر اپنے اور اس کے درمیان رکھی اور ”بسم اللہ“ کہہ کر شروع ہو گیا۔

جب کہ سعد کی نگاہیں دروازے سے اور دل و دماغ صبا سے نہیں ہٹ پارتا تھا گو کہ، اس کے الفاظ جو

اس نے کہہ وہ بے حد سادہ تھے مگر اس کے مفہوم کی گہرائی کو صرف وہی پاس کا تھا۔
اس کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھرا آئی تھیں۔ ایسی لکیریں جو ناپسندیدگی اور تشکر سے مشروط ہوتی ہیں۔

+

موسم بے حد خوشگوار تھا۔

ذرا دیر پہلے برسنے والی بارش نے عجیب سی تازگی بھردی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے کئی رنگوں میں بنا
کھڑے، ہوا سے اڑتے پھرتے تھے۔

سفیدے کی نرم شاخوں میں جو فاختہ کا منسا گھونسلہ تھا، وہ تیز بو چھاڑ کے باعث لنگ چکا تھا۔ اگر
اسے بے لکیر ہونے کا کافی دن گزر چکے تھے مگر جب بھی اس کی نگاہ پڑتی تو اسے شاخوں میں انگار جانا پڑا
کب کون سا بھولا برسر اری سگری ٹکان اتارنے کو ظہر جائے۔

اس کے بعد اس نے جھاڑواٹھایا اور ڈھیلے ہاتھ سے سارے پتے ایک طرف کرنے لگا۔ آٹا کی
فراغت بھی تھی اور بے توجہی کا احساس بھی۔ تب ہی لان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اچھے دھڑکنے والے
تھا تب ہی اب تک ساتھ دیئے جا رہا تھا اور وہ بھی خاصے مناسب طریقے سے، ورنہ ماموں کے اہلکار
جھگڑوں نے تو کسی قابل نہ چھوڑنا تھا۔ ہر کسی نے اپنی پسند و ضرورت کے حساب سے کمرے بنوائے تھے
لہذا یہ گھر ناجی کے اس گھر سے بہت مختلف اور کم گنجائش والا لگنے لگا تھا جس میں وہ تیزی کا سایہ لا
داخل ہوا تھا۔

لان بھی اگر اچھی حالت میں بیچ گیا تھا تو یہ صرف ہادی کی ہی محنت و لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ گھر کے اہلکار
ہی افراد کو اس کی کچھ خاص ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یہ جو قطعہ مراضی لان کے نام پر بچا رہ گیا تھا اسے
متعلق ہر ایک کے ذہن میں تعمیری نقشہ موجود تھا مگر فی الحال یا تو حوصلے کی کمی تھی یا پیسے کی۔

”اس گھر کے کمرے، کمرے کم کا بک زیادہ لگتے ہیں۔“ اسے سعد کے الفاظ یاد آئے تو لپٹا
مسکراہٹ پھیل گئی وہ ابھی کچھ دیر پہلے کہیں جانے کا کہہ کر نکلا تھا۔

وہ اس وقت کیاریوں کی ٹلائی کر رہا تھا جب عقب سے اس نے صبا کی آواز سنی۔

”تم کتنی دیر میں فارغ ہو جاؤ گے ہادی؟“

”ابھی تو وقت لگے گا..... کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟“ وہ بچوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اسی طرح پلٹ کر
اسے دیکھا۔

”ہاں مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”کہو میں سن رہا ہوں۔“ وہ پوری تندی سے ٹلائی کر رہا تھا۔

”نہیں یوں نہیں۔“ صبا نے کہا۔ ”کیا تم وہاں برآمدے میں آ کر میری بات نہیں سن سکتے ہیں؟“

ضروری بات ہے اور مجھے ذرا تفصیل سے بات کرنی ہے۔“
اس کے انداز میں وہی ہمیشہ والی دھونس تھی۔

ہادی نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر کھرپک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ہاتھ دھوؤں۔“ اس نے صبا سے پوچھا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر دائیں طرف لگی
بازہ کے ساتھ نصب نلکے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ ہاتھ دھوتے ہوئے صبا کی اس بات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے
اپنے بچے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر لیا تھا اور صبا کے ساتھ برآمدے کی جانب چل دیا تھا۔ صبا اسے
برآمدے کے آخری سرے پر لے آئی تھی جو ذرا سی ترچھی شکل میں بچھلے حصے کی طرف جاتا تھا۔
”بیٹو! اس نے ہادی کو فرش پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔“

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہوں کہو۔“ صبا کا ہر انداز اسے تجسس میں ڈال رہا تھا۔

”ہادی! تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ بالکل ایسے کہہ رہی تھی، جیسے اپنی بنائی ہوئی
جائے یا کسی اور ڈش کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔
ہادی نے ناگہی سے اسے دیکھا۔
”یہ کیا سوال ہے؟“

”عجیب سوال ہے؟ اچھا یہ بتاؤ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر سنجیدگی کے ساتھ سوال
کیا تھا۔

”اچھی ہوتی اچھی ہی لگتی ہو۔“ چند لمحوں تک اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہنے کے بعد اس
نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”لیکن صبا! تمہیں ہوا کیا ہے؟ یہ کس قسم کے سوال پوچھ رہی ہو تم؟“

”ادوہ.....! پتا نہیں، میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ تمہیں ہر بات پوری وضاحت کے ساتھ جب تک
نہ بتائی جائے تمہیں سمجھ نہیں آتی۔ اب یہی دیکھ لو بڑی صاف سی بات ہے مگر تمہیں خود سے سمجھ نہیں آتی اور
مجھے یہ اپنے منہ سے اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“

”بلا غرضی تمہیں سے باہر آئی گئی۔ ہادی بہت بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”تم نے کیا کہا؟“ ذرا دوبارہ کہنا۔“

”صبا کے لپٹوں پر بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
”میرے منہ سے بار بار اعتراف سن کر تمہیں خوشی ہوگی ناں۔“

”صبا! تم مذاق کر رہی ہو نا میرے ساتھ؟“

اب کی بار صبا نے بڑی خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

”میں ایسا مذاق کیوں کروں گی ہادی؟ بلکہ مجھے لگتا ہے تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔“
کیا جہیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں تمہارے لیے کوئی خاص جذبہ رکھتی ہوں۔ میں نے بہت انتظار ہادی! کہ شاید تم خود اظہار میں پہل کر دو مگر..... وہ اپوی سے بولی۔

”وہ..... میں مجھے نہیں پتا کہ.....“ وہ انتہائی بے یقین تھا۔ اسی بل اندر سے فون کی گھنٹی بجی کہ سنا دی تھی۔ ہادی کو وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب لگا تو تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اس غیر متوقع صورت حال کی پریشانی اور غلت میں وہ برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ پر بازو باندھ کر کھڑے سعد کو نہیں دیکھ سکا تھا مگر صبا سے بہت پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس کے لبوں پر فاقہ مانہ مسکراہٹ تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سعد کو سامان پیک کرتے دیکھا تھا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ چند لمحوں اس کی حرکات کو بغور دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”سامان پیک کر رہا ہوں۔“ بہت مصروفیت بھرے انداز میں جواب ملا۔

”کہیں جا رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”کہاں؟“

”دہلی، شام چھ بجے کی فلائیٹ ہے۔“

”ایں.....“ وہ بری طرح چونکا۔

”اچانک، خیریت تو ہے نا سعد۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”ہاں خیریت ہے۔“ ہادی کو سعد مسلسل حیران کر رہا تھا۔ وہ کبھی بھی اس قدر مختصر جملوں میں بات نہیں کیا کرتا تھا۔

”پھر اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو؟“

”یار!“ سعد جیسے اکتا گیا تھا۔ ”میں سب گھر والوں کو بہت مس کر رہا ہوں، بس اسی لیے جا رہا ہوں۔“

کچھ روز پہلے پلان بنا تھا اور آج ہی کی سیٹ کنفرم ہوئی تھی۔

”کمال ہے اور تم مجھے آج بتا رہے ہو۔“ ہادی نے شکوہ کیا۔

”دس روز پہلے بتا دیتا تو تم نے کیا کر لینا تھا۔“ اس کا لہجہ بہت اجنبیت بھرا تھا۔ ہادی چند لمحوں نے

لیے کچھ بھی نہیں کہہ پایا۔

”آج تو گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تقریباً سب ہی لوگ کسی دعوت میں گئے ہوئے ہیں تم اس طرح بھرپور فریق نہیں پڑے گا ہادی! میں یہاں رہتا ہوں یا چلا جاتا ہوں گھر والوں کو اس سے کیا فرق پڑے گا؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی خفگی تھی۔

”تم! تم ہو یا! میں نہیں کہ کسی کو فرق ہی نہ پڑے۔“ ہادی نے سوچا تھا۔

”سعد! کیا جہیں یہاں کوئی پرابلم ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ کوئی بات بری لگی ہے کسی کی۔“

اس پر سعد نے خود کو مسکرانے پر مجبور محسوس کیا تھا اسے یکدم احساس ہوا تھا کہ وہ ہادی سے اس طرح

خاندان میں گفتگو کر کے اچھا نہیں کر رہا۔ بھلا اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا۔

”نہیں ہادی! مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کسی کی کوئی بات بری نہیں لگی۔ میں نے کہا نا گھر والوں کی

بہت یاد آ رہی ہے، آج کل پڑھائی بھی کوئی اتنی خاص نہیں ہو رہی اس لیے میں جا رہا ہوں مگر ظاہر ہے کہ

لوٹ کر تو میں نے یہیں آنا ہے۔ اگر کس کو میرے جانے پر اعتراض ہوگا تو میں آ کر اس سے ایکسپلیکٹ کر لوں گا۔“

”یار! آئی ایم سوری، تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو مگر میں بھی پیکنگ کر رہا ہوں پلیز، ہو سکے تو

ایک کپ اچھی سی چائے پیلا دو۔“ ہادی اس کی بات سن کر مطمئن ہوا تھا یا نہیں مگر وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد سعد نے اپنی ایک شرٹ بیگ میں رکھی پھر دوسری اٹھائی مگر اسے بیگ میں

رکھنے کی بجائے ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک عجیب طرح کی بے بسی محسوس کر رہا تھا اور اپنی یہ بے بسی اسے غصہ دلا رہی تھی گویا صبا کی ہادی

کے ساتھ ہمدردی بے سبب نہیں تھی۔ حقیقت وہی تھی جسے پورے طرح محسوس کرنے کے باوجود خود کو

جھٹلانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا مگر اس کی ساری کوششیں اس روز صبا کے منہ سے اعتراف سن لینے کے

بعد ہری کی دھری رہ گئی تھیں۔

گو کہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ ایسے کوئی عہد و پیمان تو نہیں ہو گئے تھے ان دونوں کے درمیان

کہ وہ ہم کوئل سے لگا کر بیٹھ جاتا مگر اسے لگ رہا تھا کہ وہ براہ راست ریجیکٹ کیا گیا ہے۔ وہ زندگی میں

پہلی بار ریجیکٹ کیا گیا تھا اور وہ بھی ہادی کے مقابلے میں۔

کوئی ایسا ہوتا جو کم سے کم اسے اپنے برابر کا لگتا تو پھر بھی برداشت کرنا آسان رہتا مگر ہادی۔

مگر ان میں انداز آ سکتی ہوں۔“ پہلے دھیرے سے دستک سنا دی پھر آواز آئی۔ اس نے بے ساختہ

دیکھ دی تھی۔ وہ دروازے کے پیچھے بیچ کھڑی اجازت طلب نظروں سے اسے

”ہوں۔“ اس نے اسی قدر جواب دینا مناسب سمجھا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

✦

”ہادی! ایک کام میں نے بھی تم سے کہا تھا۔“ اس نے وہیں سے پکارا تھا۔ ہادی نے بنا اس کی جانب

”کیا ہادی جانتا ہے یہ سب کچھ۔“ اس نے پوچھا تو صبا چند لمبے کچھ بولی نہیں کہی ہوئے انداز میں بولی۔

دیکھے ایک شاپر میں سے خاکی لفافے میں لپی کتاب نکال کر تپائی پر رکھ دی۔
”یہ رکھی ہے، لے لیتا۔“

”وہاں رکھنے کا مقصد؟ بھی میں ادھر بیٹھی ہوں یہیں پکڑا دو۔“ اس نے کہا تو ہادی ہلکے جھک سا گیا پھر اس نے کتاب اٹھائی اور صبا کی طرف بڑھا دی۔
صبا بخور اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور ہادی کے انداز میں موجود جوتہ بذب کی سی کیفیت سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

ویسے بھی وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ہادی اس سے کترانے لگا ہے وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرنا وہ موجود ہوتی تھی وہاں سے راستہ بدل دیتا تھا۔

”ہادی! تمہیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے کتاب پکڑنے کی بجائے سوال کیا تھا۔

”مجھے کچھ بھی نہیں۔“ وہ خفیف سا مسکرایا، اس کا انداز کم سے کم صبا کو ضرور تحیر میں ڈال رہا تھا۔
”انہوں نے کچھ تو ہے، میں کئی دن سے نوٹ کر رہی ہوں تم مجھ سے بات نہیں کر رہے ہو۔“
ہوں تو بس جواب دیتے ہو اور اگر میں کہیں موجود ہوتی ہوں تو یا تو وہاں آتے ہی نہیں ہوا یا ٹھکرا ہوا آخر چکر کیا ہے؟“

”کوئی بھی بات نہیں ہے صبا! تم یونہی محسوس کر رہی ہو۔“ ماتھے پر جھکتا پسینہ پونچھے ہوئے کتاب صوفے پر رکھ دی۔

تب ہی صبا کے ذہن میں کوئی جگنو سا چمکا اسے یاد آیا کہ یہ محسوس کن سی جھجک وہ ہادی کے اٹا اس روز سے دیکھ رہی ہے جس روز اس نے اظہار محبت کیا تھا۔

یہ خیال آتے ہی کہ ہادی اس سے اس وجہ سے کترار ہا ہے اسے بڑی زور سے گدگدی ہوئی تھی۔
”اچھا سنو ہادی!“ اس نے اپنی چمکتی آنکھوں اور کھلتے لہجے میں اس کو پکارا تھا پھر آواز رازداری سے بولی۔

”وہ میں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔“

”کون سی بات؟“ ہاتھیں کیوں وہ گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
”وہی محبت والی بات، میرا خیال ہے اب تمہیں بھی میرے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے۔“
محبت کرتے ہو۔“

اس نے جتنے آرام سے کہا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ بوکھلا کر سیدھا ہوا۔
”پپ، پلیز صبا! اس طرح کی باتیں مت کرو، اگر کسی نے سن لیا تو؟“ اس کی سرسبز صورت صبا کو بہت لطف دیا تھا۔

”مستابہ تو سن لینے دو۔ ویسے بھی وہ محبت ہی کیا جس میں غلام سماج کی اینٹری نہ ہو۔“ فقرہ کھل کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ہادی گدھے کے سر سے سینکوں کی مانند غائب ہو چکا تھا۔
وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹنا شروع ہوئی تو پھر ہنسی چلی گئی۔ یہ ساری صورت حال اس قدر دلچسپ ہو جانے لگی اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔

+

”عمو! ظلوں، ڈراموں یا ڈائجسٹ کی کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے کہ اظہار محبت میں پہل لڑکی کرتی ہے۔ مگر یہ اچھا تو نہیں لگتا اظہار کرتے ہوئے تو لڑکے ہی اچھے لگتے ہیں..... کیوں شہ؟“
بظاہر کھانا کھاتے ہوئے اس نے یونہی ایک سوال کیا تھا مگر رغبت سے کھانا کھاتے ہادی کے لیے لوار لگنا مشکل ہو گیا۔

جتنا وہ اس بات سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اتنا ہی صبا کھینچ کھانچ کر اسے اس موضوع کے سامنے لا کر لڑکی تھی۔

”ہاتھیں میں نے کبھی غور نہیں کیا۔“ شہ نے مصروفیت بھرا جواب دیا۔ وہ نوکری میں سے پیاز نکال رہی تھی اور اس وقت کچن میں وہی تینوں موجود تھے۔

”کمال ہے، اتنی اہم بات پر غور نہیں کیا..... چلو خیر میں بتا دیتی ہوں لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔
شرم دیا بھی کسی چیز کا نام ہے مگر یار! مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی اگر وہ لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں لیکن لڑکا ذرا سا بڑول ہو، میرا مطلب ہے اس میں اظہار کرنے کی ہمت نہ ہو تو ایسے میں لڑکی کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا خیال ہے، اچھا ہادی! تم ہی بتاؤ کچھ اس بارے میں۔“

اب تو پول کا رخ اس کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ اور بھی بوکھلا گیا۔
”مجھے نہیں پتا۔“ اس نے بہت جگت میں کھانا شروع کر دیا تھا۔

”تمہیں پتا بھی کیسے ہو سکتا ہے تمہیں پتا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔“ اس نے نہ صرف آواز بلکہ مسکراہٹ دبا کر بھی کہا تھا مگر ظاہر ہے کہ جس کو سنا مقصود تھا اس نے سن بھی لیا تھا اور اتنا شرمندہ ہوا تھا کہ بس حد نہیں۔

”کھانا کھا کر یہ برتن دھو دینا اب یہ نہ ہو کہ یہ چار برتن شام تک پڑے رہیں سک میں۔“ شہ صبا کو تاکہ کتنی بیاض بھری نوکری لے کر باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی ہادی نے غنا غٹ پانی کا گلاس چڑھایا اور لگے لگے تومبائے نوک دیا۔

”تم کدھر جا رہے ہو؟..... کھانا تو کھا لو۔“

”میں کھا چکا ہوں۔“ اس کے انداز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ بھاگ جانا چاہتا ہے۔

صبا سے مزید اپنی مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا اور یوں بھی اب تو ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔
”خدا کے لیے ہادی! اب بس کرو، جا کر آئیے میں اپنی شکل دیکھوں، یوں تو لڑکیاں بھی نہیں شرمنا
جیسے تم شرماتے ہو۔“ وہ چپٹے ہوئے بولی تھی۔

ہادی نے برتن سک میں رکھتے ہوئے خشکی بھری نظر اس پر ڈالی۔

”بات شرمانے کی نہیں ہے بس..... مجھے یہ باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں۔“

”اچھا..... پھر کیسی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ایک بار بتا دو پھر میں ویسی ہی باتیں کروں گی، یہ سب
دونوں بچپن سے ایک ساتھ ہیں مگر تم نے کبھی مجھے اپنی پسندنا پسند کے بارے میں نہیں بتایا، کم سے کم
دو آفٹر آل ہمیں آنے والی زندگی.....“

”صبا! تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم پہلے ایسی باتیں نہیں کرتی تھیں۔“ اس کے چہرے پر بڑبڑاہٹ
والی فکر مندی تھی۔

”اس لیے کہ پہلے میں تم سے محبت نہیں کرتی تھی۔“

ترت جواب آیا۔ ہادی نے ایک بے بس نظر اس پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

”بے وقوف۔“ وہ مسکراتے ہوئے برتن سینے لگی۔

+

”شکر ہے فون تم نے اٹھایا ہے، ورنہ تمہارے یہاں یہ بہت مسئلہ ہے۔ دس لوگ پہلے بھگتے رہا
ہیں پھر کہیں جا کر تم سے بات ہو پاتی ہے۔“

پھپھو اپنے مخصوص تیز انداز میں بول رہی تھیں۔ ہادی نے مسکراتے ہوئے پورے دھیان سے
کی بات سنی۔ پھپھو اس قدر تیز بولنے کی عادی تھیں کہ کبھی کبھار تو پورا کا پورا جملہ ہی اس کے سر پر
جا یا کرتا تھا۔

”اصل میں آج گھر پر کوئی بھی نہیں ہے سب لوگ ٹا کے لیے لڑکا دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔“ اس
جملہ جوں کا توں ان تک پہنچا دیا جس طرح عمو گھر میں بولا جاتا تھا۔

”اچھا..... چلو اللہ مبارک کرے، اچھے لڑکے ملنا کوئی آسان ہے آج کل، بھیلی باری تھاری
ممائی سے بات ہوئی تو وہ بڑی فکر مندی کا اظہار کر رہی تھیں، ٹا کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں پریشان ہوتے

کیا فائدہ؟ جب قسمت ہوگی تب اچھا برل ہی جائے گا۔ ویسے ج کبوں ہادی! سب کیا دھڑھکاریاں
ہی ہے، چار سال پہلے جب میں نے پاکستان کا چکر لگایا تھا تو ان دنوں ٹا کے لیے بڑے اچھے اچھے
آئے ہوئے تھے مگر ان ماں بیٹیوں کے خڑے، تو بہ تو بہ ایک لڑکے کو تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کا

ہے۔ بتاؤ لڑکے کا قد چھوٹا تھا تو ٹا کہاں کی حور پری تھی۔ مگر تمہاری ممائی نے یہ بھی نہیں سوچا۔ اب

انکار کر کے یہ دت لے آئی ہیں کہ ٹا کے لیے اچھے رشتے بھی آنا بند ہو گئے ہیں۔“
”دو فوہ ای! بس بھی کریں۔“ سدھ کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔

”سدھ بھی موجود ہے آپ کے پاس؟“ ہادی نے پوچھا تھا۔
”ہاں میں ہوں، نمبر تو اسی نے ملا کر دیا ہے مجھے، اور سنو ہادی! اس لڑکے نے تو مجھے پریشان ہی کر

چھوڑا ہے، اب نیا بھار چڑھا ہے۔“
”ای! آپ نے ہادی سے کچھ پوچھا تھا۔ یہ نہیں بتانا تھا کہ مجھے کون سی بیماری ہوئی ہے۔“ سدھ کی
آواز پھر آئی۔

”اے لڑکے! چھری تلے دم تو لو۔ ذرا بات سے بات نکلتی ہے۔ یونہی تو نہیں ہر بات ہو جاتی تا۔
ہاں ہادی بچے! پھر تم نے کیا سوچا ہے کاروبار کے بارے میں؟“
”پھپھو! وہ میں.....“

”اب میں انکار نہیں سنوں گی ہادی! کیوں اپنے ہی ہاتھوں اپنے حیر پر کلباڑی مار رہے ہو۔ بتاؤ
ماموں کو پسند نہیں ہے تو کاروبار نہیں شروع کرنا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو بھی سچی بات کہوں گی۔ اصل
میں تمہارے ماموں کے پاس کبھی اتنا سرمایہ ہی نہیں تھا کہ وہ ذاتی کاروبار کے متعلق سوچے۔ اسی لیے
اب تک انگو رکھتے ہیں۔“

”میری بیماری ماں! اتنی دور سے فون کیا آپ نے چغلیاں کرنے کے لیے کیا ہے؟ بابا کو پتا چل گیا
کہ آپ نے پاکستان اتنی لمبی کال کی ہے تو بس قیامت ہی آ جائے گی۔ اب میری باری ہے تھوڑی سی بات
مجھے بھی کرنے دیں۔“

اس نے ریہہ پورانے ہاتھ میں لے لیا۔

”ہاں ہادی! ٹھیک ٹھاک ہو؟“

ہادی نے بڑی سکون بھری سانس بھری تھی۔ ”شکر ہے تم نے فون لے لیا ورنہ پھپھو نے ایسوفٹل ہو
جاتا تھا۔“

”تمہارے معاملے میں تو خیر وہ ہمیشہ سے ہی بہت ایسوفٹل رہی ہیں۔ آفٹر آل ان کے مرحوم بھائی
کی اگلی نشانی ہو؟ خیر کل تم نے ایس ایم ایس کیا تھا کہ کوئی ضروری بات کرنا چاہا رہے ہو۔ کبھی سوری یار!
کل میں فون نہیں کر سکا کچھ مصروفیت رہی۔“

”تم ناہیں کب آ رہے ہو؟ کل میں تمہارے ڈپارٹمنٹ گیا تھا کلاسز تو ریگولر ہو رہی ہیں۔“

”آ جاؤں گے واہیں بھی یار! آج کل میں جس مشن پر کام کر رہا ہوں وہ ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔“
اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”ایسا کون سا مشن ہے بھی؟“ اس نے بھی دلچسپی سے پوچھا تو وہ بولا۔

”واپس آ کر بتاؤں گا۔ دعا کرنا کہ کامیاب لوٹوں، فی الحال تو تم اپنی کھوکھلی ضروری بات کرنا رہے تھے۔“

”سعد..... یار! اصل میں، میں بہت کنفیوز ہو رہا ہوں، سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کیا کہوں..... اصل میں یہ بات یہاں بھی کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔“

”ہادی! کھل کر بات کرو آخر مسئلہ کیا ہے؟“ اس نے تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ ہادی نے ایک بار پھر چند لمحوں کے لیے سوچا پھر آہستہ آہستہ اسے صبا کے متعلق بتانے لگا۔

”یار! بات تو واقعی سیریس ہے، لیکن یہ بتاؤ اس مذاق کو اور کتنے دن تک چلانے کا ارادہ ہے؟“ ہادی کے خاموش ہونے پر سعد نے بہت ہلکے ہلکے لہجے میں پوچھا تھا۔

”سعد! میں مذاق نہیں کر رہا۔ تم خود سوچو، میں اس طرح کا مذاق کیوں کروں گا؟“ اس نے ذہ دیتے ہوئے کہا۔

”مگر صبا نے تو مجھ سے کہا تھا کہ.....“ سعد کچھ کہتے کہتے رک گیا ہادی چونکا۔

”کیا کہا تھا صبا نے تم سے۔“

”وہ..... اچھا ہادی! میں تم سے پھر بات کروں گا۔“ اس نے غلت میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ہادی ریسیور ہاتھ میں لیے کچھ نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت کے زیر اثر ریسیور کو دیکھ رہا تھا۔

+

وہ ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جاری تھی مگر اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ہنسی میلوں دور بیٹھے ان شخص پر کیا اثر کر رہی ہے۔

”تم ہنس کیوں رہی ہو؟..... اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟“

اسے اگر ہادی پر ہنسنے سے فرمت ہوتی تو سعد کے لہجے میں نمایاں ہوتی سنجیدگی کو ضرور محسوس کر لیتا۔

”اس میں صرف ہنسنے کی ہی تو بات ہے، مجھے سمجھ نہیں آ رہی آخر تم اس بات کو لے کر اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ جب کہ میں نے تمہیں ساری بات پہلے ہی بتا دی تھی کہ میں اور ہادی تم سے مذاق کر رہے تھے۔“ اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔“ سعد نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”ہادی بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔“

”مذاق کو عجیب ثابت کرنے کے لیے سنجیدہ تو ہونا ہی پڑتا ہے۔“ صبا نے ہر ٹکڑے سے آزاد ہکتے لہجے میں کہا۔

”تم کیوں پریشان ہو رہے ہو سعد! اصل میں، میں نے ہادی کو ابھی تک نہیں بتایا کہ میں تمہیں نیت بتا چکی ہوں اور وہ بے چارہ اب تک یہی سمجھ رہا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس لیے تمہیں بے وقوف بنا کر حشر لے رہا ہوگا، بہر حال تم فکرت کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ وہ اب ایسی بات نہیں کرے گا۔“

”اچھی بات ہے مگر سنو صرف سمجھانا نہیں ہے، بلکہ بہت اچھی طرح سے سمجھا دینا ہے۔ میں مذاق میں ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا۔“

صبا بچہ لمبے کیلے، اس کے لہجے پر غور کرتی رہی۔

”مذاق کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت بھی کیا ہے، میں نے یونہی کہا تھا کہ میں ہادی کو پسند کرتی ہوں۔“

”تم نے یونہی کہا تھا مگر کیا ہادی نے اس بات کو یونہی نہ سمجھا ہو۔ میرا خیال ہے کوئی بھی سوچہ بوجھ رکھنے والا اور بچنے میں دل رکھنے والا انسان تمہیں ناپسند نہیں کر سکتا۔“ اس کا لہجہ بہت کچھ جتا ہوا تھا۔ صبا کا منہ کڑوا ہونے لگا۔

”پہلی بات تو یہ کہ تمہارے دوست میں کوئی سوچہ بوجھ سرے سے ہے ہی نہیں۔ اعلیٰ درجے کا بے حس انسان لگتا ہے وہ مجھے۔ دوسری بات دل سے تعلق رکھتی ہے جو کہ بے کاری ہے، ورنہ ہم دونوں بہت مرے سے ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس کے دل میں یکا یک میرے لیے کوئی جذبہ جاگ اٹھا ہو، بلکہ میرے لیے تو کیا میرا خیال ہے اس کے دل میں کبھی بھی کسی بھی لڑکی کے لیے کوئی جذبہ نہیں جاگ سکتا۔ ایسا ہی بے حس ہے وہ۔“ وہ بنا کسی گنجائش کے بولی تھی۔

”نور میرا خیال ہے، اس کی بے حس پر تمہیں بہت افسوس ہے۔“ ایک بار پھر بظاہر عام سے لہجے میں دوکانی کچھ جتا گیا تھا۔ صبا خاموش رہ گئی۔

”سعد! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ صرف.....“

”ہاں تم مجھے بتا چکی ہو کہ وہ صرف مذاق تھا اور ہادی تمہارے اس مذاق میں شامل تھا۔ میں صرف یہ کہہ ہاں کہ تم ساری صورت حال ہادی پر بھی اچھی طرح سے کلیئر کر دتا کہ وہ نہ تو مجھ سے دوبارہ اس قسم کی بات کرے اور نہ خود کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔“ سعد نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے یا نہیں، یہ میرا درد دسر نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ فیر ہوں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”صبا! مجھے کی کوشش کرو بھی۔“

”صبا! مجھے کی کوشش کرو بھی۔“

”صبا! مجھے کی کوشش کرو بھی۔“

”ہاں میں سمجھ گئی ہوں اور ہادی کو بھی سمجھا دوں گی..... بس یا کچھ اور؟“ اس نے بہت ہلکا سا پوچھا تھا اور اس ناگواری کو سعد نے محسوس بھی کیا۔

”نہیں اور کچھ نہیں۔“

”پھر میں فون بند کر دوں؟“

”کیا مطلب، اتنی جلدی۔ ہم نے صرف ہادی کے بارے میں بات کی ہے آج۔ کیا ہم دوسرے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی؟“

”یہ تو تمہیں پتا ہوگا کیونکہ فون تم نے کیا ہے۔“

”اب تم ناراض ہو گئی ہو۔“ صبا خاموش رہی، جو بھی تھا اسے اپنی اتنی تسکین تو بہر حال درکار تھی۔ ”کم آن صبا! آخر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے کہ تم ناراض ہی ہو گئیں..... اوکے کم ایم ریٹلی ویری سوری..... اب ہم اس بارے میں بات ہی نہیں کریں گے مگر تم ہادی کو بریف ضرور کرنا۔ گوکہ، بات اب بھی وہی تھی جس پر اسے اعتراض تھا مگر ہادی کا نام آتے ہی وہ اپنی مکرہات ہی نہیں سکتی تھی۔

”بالکل ہی احمق ہے، گدھا۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

اور پھر فیصلہ تو اس نے یہی کیا تھا کہ اب ہادی کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرے گی مگر سلا نہیں بلکہ ہادی کی شکل کا تھا۔ جب بھی دکھائی دیتی ضروری کوئی نہ کوئی ایسا جملہ دل میں چلنے لگا کہ سے ہادی کو بالکل ہی بوکھلا کر رکھ دیتا تھا۔

+

وہ دونوں غالباً ساتویں دکان سے خالی ہاتھ باہر نکلے تھے۔

”یہاں تو کچھ بھی اچھا نہیں ہے، کہیں اور دیکھتے ہیں۔“ ہادی نے سعد کے پیچھے بانٹک پڑنے کہا۔

”یار! آخر چکر کیا ہے؟ تم ہر دکان میں جاتے ہو، دس بارہ گفٹ آئٹم کھلا کر دیکھتے ہو، ہر ٹاپینڈ کر کے باہر آ جاتے ہو۔ آخر وہ کون سا نادر و نایاب تحفہ ہے جو تمہیں خریدنا ہے؟“ بانٹک کو لگتا ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

وہ دوروز پہلے پاکستان آیا تھا اور بے حد خوش تھا کیونکہ اس نے امی اور ابو کو راضی کر لیا تھا۔ بعد امی اور اس کی چھوٹی بہن نے بھی آ جانا تھا، وہ لوگ باقاعدہ طور پر صبا کا رشتہ لینے آ رہے تھے۔ سعد خوش تھا اور اس نے آتے ہی یہ خوشی کی خبر صبا کو بھی سنا دی تھی۔

”یار! نادر و نایاب تحفہ تو نہیں خریدنا چاہتا، البتہ ایسا تحفہ ضرور خریدنا چاہتا ہوں جو بہت اچھا ہو۔“

نے غصہ اور لہجے میں کہا۔ ”پہلے میرا ارادہ تھا کہ رنگ خرید لوں مگر، پھر سوچا کہ یہ کچھ مناسب نہیں لگتا، پہلے کوئی باقاعدہ بات

دفعہ ہو جائے تو پھر.....“

”ہوئے..... اب تک وہ کس کے لیے؟“ سعد نے شرارت سے پوچھا۔ ”میری غیر موجودگی میں، کہیں میری بھابی تو پسند نہیں کریں گی۔ کمال ہے ہادی تو شکل سے تو اتنا

بصاحت نہیں لگتا۔“

ہادی نے جواباً ایک ہاتھ اسے رسید کیا تھا پھر جھپٹنے لہجے میں بولا۔ ”سب سے پہلے تمہیں ہی بتا رہا ہوں، اب تم پچھو سے کہہ دیتا تا کہ وہ ماموں سے بات کر لیں۔ میں خود کہتا تو اچھا نہیں لگوں گا۔“

وہ بے چارہ اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا، مگر سعد چونک سا گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے بانٹک ایک طرف کر کے روک دی تھی۔

”کیا ہوا؟..... بانٹک کیوں روک دی؟“ ہادی حیران ہوا۔

”امی..... کیا بات کریں گی، میرا مطلب ہے کس بارے میں بات کریں گی ماموں سے؟“ گوکہ، اس کے شک پر تصدیق کی مہر نہیں لگی تھی اس کے باوجود اس کے لہجے میں ناگواری ہی درآئی۔

”مبا کے بارے میں یار! اور کس کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا۔“

سعد کی پیشانی پر چند لکیریں نمودار ہوئی تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ گھوم کر ایک زوردار گھونسا اسے رسید کرے اور شاید وہ ایسا کر بھی دیتا مگر ہادی کے چہرے پر ضرور کوئی ایسی بات تھی، جس نے اسے کچھ بھی کرنے سے باز رکھا۔

”ہادی!..... تم اب بھی مذاق کر رہے ہونا۔“ وہ گھوم کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کی بات پر ہادی کے چہرے پر کچھ انداز بھی کے تاثرات ابھرے تھے اور وہ بانٹک سے اتر کر اس کے سامنے آ گیا۔

”اس میں مذاق والی بات آخر ہے بھی کیا؟..... اور میں اس طرح کا مذاق کروں گا بھی کیوں؟“ اس نے ابھمن آئیز لہجے میں کہا۔

”تم سے صبا نے کچھ نہیں کہا؟“

”پہلے تو اسی نے کہا تھا تب ہی تو میں بھی سوچنے پر مجبور ہوا، ورنہ تم جانتے ہو سعد! میں تو.....“

”چنانچہ میں نے نہیں کچھ اور نہیں کہا اس نے تم سے؟“ سعد جھنجھلا کر پوچھ رہا تھا۔

”مخلک کس حوالے سے.....؟“ وہ بیچارہ جیج سمجھ نہیں پارہا تھا کہ سعد اس سے کیا اٹھوارہا ہے۔

”میرے اور اس کے حوالے سے؟“ ہادی نے بہت متعجب ہو کر اسے دیکھا۔ ”کیا اس نے تمہیں یہ

نہیں بتایا کہ اس نے جو کچھ بھی تم سے کہا وہ صرف ڈرائیو تھا تاکہ میں.....
سعد بہت جوش میں بولنے بولتے خاموش ہو گیا۔

ہادی کے چہرے پر جو بے یقینی لکھی تھی، اس نے اسے کافی کچھ سمجھا دیا تھا۔ مباحثہ اس کا نہیں تھا بلکہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ مگر ہادی اس کا بہترین دوست تھا۔ وہ مباحثہ کو اتنا نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے اس کے بارے میں کچھ بھی ڈھونڈنے سے کہہ سکتا، مگر وہ ہادی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس کے پاس سے بہت یقین سے کہہ سکتا تھا اور اسے حیرت تھی کہ اس نے مباحثہ کی بات پر یقین کیوں کیا جبکہ وہ صرف سادہ لوحی سے بخوبی واقف تھا۔

”بیٹھ جاؤ ہادی! مجھے لگتا ہے ابھی کچھ ایسا ہے جس کی وضاحت ہم دونوں کے لیے بہت مشکل اور یہ وضاحت صبا دے گی۔“
بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ہادی کو لگ لگا کر دیکھا تھا۔

+

”حقیقت مذاق محبت۔“

یہ وہ تین الفاظ تھے جو اس لمحے اسے اپنی زندگی کے سب سے ناگوار الفاظ محسوس ہو رہے تھے۔ وہ تین الفاظ تھے، جن کے درمیان اسے اپنا آپ ذرے کی مانند اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔
”تم نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟“

اسے غائب دماغی سے مسلسل اپنی جانب دیکھتا پا کر صبا نے چھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا اسے ہادی کی ڈھٹائی مزید سچ پا کر رہی تھی۔ ایک تو اس کا بنا بنا یا کھیل بگاڑ دیا تھا اور اب اتنا کچھ بننے باوجود احمقوں کی طرح کھڑا اس کی شکل تک رہا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے معذرت ہی کرے۔ کم سے کم طرح سعد کو اس کا یقین ہی آ جاتا۔

”اگر نہیں دیکھی تو اب ضرور دیکھ لیتا۔ تمہاری غلط فہمی ضرور دور ہو جائے گی کہ میرے بھی اس سے محبت کر سکتی ہے؟“

ہادی اب بھی خاموش تھا۔ اس کے پاس صبا کی باتوں کے جواب میں کہنے کے لیے ایک بھی بات نہ تھی۔ وہ تو بس ایک دم بخود کیفیت میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اتنا زور دار جذباتی جھٹکا اسے صبا کے اظہار محبت سن کر بھی نہیں لگا تھا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا صبا! تم نے خود کہا تھا..... ایک بار نہیں کئی بار۔“ اسے اپنی آواز میں کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

صبا دنگ رہ گئی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہادی اس سے باز پرس کر سکتا ہے۔

بھی اگر وہ کوئی وضاحت دے رہی تھی (بلکہ وضاحت کیا دے رہی تھی سراسر برسرِ رہی تھی اس سے اپنی بات کا جھٹلایا جا کر بدواست نہیں ہو رہا تھا) وہ بھی صرف سعد کی وجہ سے، جس نے آتے ہی اس سے جواب طلبی کی تھی۔

ہادی کی بات پر سعد نے ایک بہت طرز بھری کاٹ دار نظر صبا پر ڈالی اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔
صبا کا بس نہیں چلا کہ ہادی کا سر پھاڑ دے۔

”اسی لیے کہتے ہیں بیوقوف دوست سے دانا دشمن بھلا۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے اس دوستی کے پردے میں کوئی دشمنی ہی نکالی ہے تم نے مجھ سے۔“ بتاؤ! کسی چیز کی کوئی حد بھی ہوتی ہے یا نہیں..... یا شاید ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے مگر تمہاری بے وقوفیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے سارے احساسات مرچکے ہیں مگر محض ابھی باقی ہے مذاق اور ہمدردی کو سمجھ سکتے ہو۔ میں تم سے باقی گھروالوں کی نسبت ہنس کر بات کر لیتی ہوں۔ تمہاری طرف دازی کر دیتی ہوں تو اتنی سی باتوں کو تم نے ہمدردی کی بجائے محبت سمجھ لیا۔“
”تم ہی نے کہا تھا صبا.....“ اس نے کہنا چاہا مگر صبا نے اسے بات مکمل ہی نہیں کرنے دی۔

”مذاق میں کہا تھا اور دوستوں میں تو مذاق چلتا ہی رہتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں نے کب کوئی ایسی بات کہہ دی جسے تم نے اتنی سنجیدگی سے لے لیا، نہ صرف یہ بلکہ سعد سے بھی کہہ دیا، حالانکہ تم جانتے تھے کہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔“

”نہیں صبا! مجھے نہیں پتا تھا کیونکہ، کیونکہ تم نے کبھی مجھے بتایا ہی نہیں۔“

”کمال ہے اب کیا میں ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر اپنے منہ سے بتاتی پھروں۔ سب گھروالوں نے بھی تو یہ بات خود ہی محسوس کی ہے۔ میں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا۔“
ہادی کے لبوں پر ہنسکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے یہ بات دیگر تمام باتوں کی نسبت زیادہ مزاحیہ لگی تھی۔ اپنا سفر اڑاتی ہوئی۔

”اب جو بھی بات تمہی میں تمہیں بتا چکی ہوں، امید ہے تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ ویسے تو میں نے کوئی غلط بات نہیں کی لیکن اگر میری کسی بات سے تم ہرٹ ہوئے ہو تو ہادی آئی ایم سوری! مگر سچ یہ ہے کہ تمہاری اس بات سے میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔ ایک دوست جب دوسرے دوست کے کام ہی نہ آ سکے تو کیا تانہ ایسی دوستی کا۔“

بجائے اس کے کہ تم سعد کو کنوئیں کرتے۔ تم نے اپنی ہی مصیبت بیچ میں ڈال دی۔ قسم سے، مجھے تم سے ایسی امید روز بھی نہیں تھی شاید..... شاید میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی۔

سعد کو ہنسنے کا دوسرا بھی باقی ہے، مگر ایک گزارش ہے کہ کچھ روز میں سعد کی امی آنے والی ہیں، مائے سہرا! ان کے سامنے کوئی ایسی سیدھی بات نہ کہہ دینا۔ میں بڑی شکر گزار رہوں گی تمہاری۔ کچھ اور

نہیں تو اتنی پرانی دوستی کا ہی مان رکھ لیتا۔
وہ زہرا ٹیل کر چلتی بنی مگر ہادی وہیں کھڑا رہا۔ اپنی نہایت معمولی شکل و صورت، مکرر قوت لہجہ
بے جان شخصیت اور شکستہ سوچوں کے ساتھ۔

+

اسے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے بہت دیر گزر چکی تھی۔
وہ اس کی زندگی کی پہلی ایسی رات تھی جو اس نے انتہائی اضطراب کی کیفیت میں سڑکوں پر
ہوئے گزار دی تھی۔

اس رات، اس کے اندر سے احساس ذمہ داری ختم ہو گیا تھا اور اسے اپنا دماغ پھٹا محسوس ہوا
اسے پتا چل گیا تھا کہ ”دوسروں“ کی نظر میں اس کی ذات، کیا حیثیت رکھتی ہے اور یہ ادراک اس کے
نہایت اذیت کا باعث بنا تھا۔

کچھ باتیں ایسی تھیں جن کی وضاحت صبا نے نہیں دی تھی مگر وہ ساری باتیں اسے از خود پتا چلی
گئی تھیں۔ کمال تو یہ تھا کہ ہر بات کا ہر سرا جاکر سعد کی ذات سے مل رہا تھا۔

پچھلے دو چار سال میں جو اس کے ساتھ صبا کا رویہ تبدیل ہوا تھا۔ وہ جو وقتاً فوقتاً اس کی حمایت
تھی۔ وہ جو بار بار اس سے اپنا حق لینے کی بات کرتی تھی۔ تو اسے اب سمجھ آیا تھا کہ ایسا صرف سعد کی
سے ہوا تھا۔ ایسے تمام موقعوں پر صبا کے منہ میں سعد کی زبان ہوا کرتی تھی۔ وہ جو کہتی تھی یا جو کرتی تھی
صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا صرف اور صرف اس کا اپنا فائدہ۔

مگر کوئی یوں بھی کرتا ہے، اتنا برا دھوکہ ایسی بے حس۔۔۔ کسی کی ذات کا سارا فخر چین لو۔ ہنہ
کرے تو کسی کے مان کی دجیاں بکھیر دو اور پھر کہہ دو یہ تو صرف مذاق تھا۔

”تو ہادی ابراہیم! یہ ہے تمہاری حیثیت۔ جس کا دل چاہے، جیسے دل چاہے تمہیں استعمال کرے
پھر چھوڑ دے۔ صبا صحیح ہی تو کہتی ہے میں واقعی بے حس ہوں مجھ میں کچھ محسوس کرنے کی صلاحیت ہی
ہے۔ مجھے دوسروں کی زیادتیاں سننے کی عادت پڑ چکی ہے۔ مجھے مذاق بھی سمجھ نہیں آتا۔۔۔ مگر کوئی یہ تو نہ
کیا معصومیت میرا گناہ ہے؟ میرا سادہ مزاج ہونا میری غلطی ہے۔

اگر ہے تو کوئی مجھے اس غلطی، اس گناہ کی سزا کے طور پر مار کیوں نہیں دیتا۔ کوئی مجھے زہر دے۔
گوئی مار دے مگر میرے احساسات سے، میرے دل سے تو نہ کھیلے۔“ اس نے سختی سے اپنی آنکھیں
ڈالیں۔

مرد روتا ہوا اچھا نہیں لگتا مگر اس رات احساس بے بسی سے کئی بار اس کی آنکھیں میٹھی تھیں۔
اس کا دل چاہا تھا کہ وہ چھین مار مار کر اتار دے کہ سارا غبار بہہ جائے۔

مرد تھا تو کیا ہوا اپنے دل تو رکھتا تھا۔ احساسات تو اس کے بھی تھے جنہیں ٹھیس پہنچی تھی اور وہ بھی
اس کے ہاتھوں جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی اور اسی دوست
اس کی ذات کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

اس نے اس کی بات کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا
تھک و تھوڑا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا

”خمس تم میرے ساتھ چلو، پتا ہے گھر میں سب کتنے پریشان ہیں۔“ اس نے ہادی کے لیے نظر انداز کیا تھا۔

”کون سے گھر میں..... میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ دو ٹوک انداز تھا۔

سعد ایک بار پھر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہادی سے کیا کہے جس کے منہ بند حال سے بھی واقف تھا۔ گوکہ جو ہوا اس میں نہ تو اس کی کوئی غلطی تھی نہ اس سب میں اس کی رضامندی بھی وہ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ تھک کر اس کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

”ہادی! میں سمجھتا ہوں یا! جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا افسوس ہے.....“

بہت دیر تک سوچ بچار کے بعد اس نے کہا نہ شروع کیا تھا مگر ہادی نے بیچ میں ہی اسے روک دیا۔

”افسوس کے لیے شکریہ۔ لیکن مجھ سے ہمدردی مت کرو سعد! جتنا نقصان مجھے اس سے پہنچا ہے

”ہادی!..... صبا نے۔“ اس نے پھر کہنا چاہا۔

”صبا کی بات مت کرو سعد! میں اس کے بارے میں اب کبھی بھی بات نہیں کرنا چاہتا مگر احسان مند ہوں اس نے مجھے آئینہ دکھا دیا ہے۔ جو بات اس کی دوستی نہیں سمجھا سکتی تھی وہ اب! طرح سمجھ آ گئی ہے۔ چلو چلتے ہیں، شاید، واقعی سب پریشان ہوں گے، انہیں مفت کے ملازمے دھونا پڑ جائے۔“ ہادی اس کی بات کے پاس جا رہا تھا جبکہ سعد اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تھا جسے اب تک وہ جانتا تھا۔

+

پھر سب نے دیکھا کہ ہادی ابراہیم کی شخصیت میں تبدیلی آتی چلی گئی۔

گوکہ، یہ تبدیلی ظاہری شخصیت کے حوالے سے نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق مزاج سے تھا۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آتی اس لڑکے کو ہوا کیا ہے۔ مزاج ہی ٹھکانے پر نہیں ہے کوئی کام کھانا انکار کر دیتا ہے، موڈ ہوا تو کر دیا ورنہ نہیں۔ صبح کو بھی گھر سے جلدی نکل جاتا ہے اور رات کو بھی ہے۔ میں کہتی ہوں ذرا پتا کرو اس کے بارے میں۔ مجھے تو اس کی حرکتیں کچھ مشکوک سی لگتی ہیں۔

اللہ سیدھے کام میں پڑ گیا تو بدنامی تو ہماری ہی ہے۔“

صبا نے اپنی امی کو بھری مٹھل میں کہتے سنا تھا۔ جواباً اس کے ابو نے رات کو ہادی کی کلاس لے کر اظہار کیا تھا۔ یہ ساری باتیں سن کر وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔

کسی وجہ سے سعد کی امی پاکستان نہیں آ سکی تھیں، پچھلے ڈھائی ماہ سے یہ سلسلہ جاری ہے اسے سعد کے رویے میں بھی کچھ رکھائی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بائبل شفٹ ہو چکا تھا اور اس دوران

”میں تم باور ایلہ کیا تھا۔ گوکہ، اس کا انداز ناٹل تھا مگر صبا کو کوئی بات پن کی طرح چھری تھی۔“

صرف تین بار ایلہ یا احساس بہت شدت سے تھا کہ جب تک وہ ہادی کو نہیں منالیتی۔ سعد اپنی امی کو اسے اندر ہی اندر یہ احساس بہت شدت سے تھا کہ ہادی کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دے تب ہی اس نے ہادی سے نہیں بولنے کا۔ پھر اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ہادی کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دے تب ہی اس نے ہادی سے حضرت کرنے کی کوشش کی۔

مگر ہادی نے اس کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھا رکھی تھی شاید، بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اس روز وہ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ مگر ہادی نے فوراً اس سے وہاں سے جانے کے لیے کہا تھا۔

”خمس، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک تم مجھ سے بات نہیں کرو گے، میں نہیں جاؤں گی۔“

وہ دیکھ ہادی! میں تم سے ایسا کیوں نہ بھی کرنے کو تیار ہوں مگر تم خود بتاؤ کیا دوست ایک دوسرے سے مذاق نہیں کیا کرتے..... اوکے آئی ایم سوری! اتنی پرانی دوستی کو ایک ذرا سی بات پر ختم کر دینا تو ٹھیک بات نہیں ہے۔“

ہادی نے اس کی بات بہت خاموشی سے سنی تھی اور اس کی بات ختم ہوتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر نکال دیا تھا۔

”ہاں اتنی پرانی دوستی کو اتنی سی بات پر ختم نہیں کیا جاسکتا، مجھے امید ہے میری اس بات کو بھی تم مانسٹو نہیں کرو گی۔“

صبا کا پکا بند دروازہ کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کے تو وہ ہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہادی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔

”دفعہ دور نہیں تو نہ سہی، جناب کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے اور یہ میری ہی غلطی ہے۔ ذرا کی اہمیت کیادے دی یہ تو سری چڑھ گیا۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگا ہے..... حد ہوگئی۔ لوگ پتا نہیں خود کو کبھی شے میں کیوں نہیں دیکھتے۔“

ٹھیک ہے ایسا ہے تو ایسا ہی سہی..... اب اس کو منانے آتی ہے میری جوتی۔ سعد کو اور اس کی ماں کو مل خود ہی سنبھال لوں گی۔“

جس نے اس نے صبراً ارادہ کر لیا تھا۔

پھر اس رات تو نہیں مگر کچھ روز بعد ابونے واقعی ہادی کی کلاس لے ڈالی تھی۔

”ہاں بخود رہا ہوتے کہاں ہو؟ دن کی روشنی میں تو گھر پر دکھائی نہیں دیتے۔“ ان کے لہجے میں طنز کی وہ خصوصیت تھی جو اس گھر کے مکینوں کا وطیرہ تھی۔

”جی ہیکس ہوتا ہوں۔“ ہادی نے آہستگی سے کہا تھا، نجانے یہ بات کسی اور نے محسوس کی تھی یا نہیں مگر صبا کو احساس تھا کہ ہادی مؤدب تو تھا مگر اس روز اس کے لہجے میں وہ تابعداری کا عنصر مفقود تھا، جو ہمیشہ

سے اس کی ذات کا حصہ رہا تھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ماموں! میں آوارہ گردی کرتا ہوں، مگر کا کوئی کام نہیں کرتا۔ میں منصور، عباد اور احمر کی طرح گھر کی ذمہ داریوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ مگر ماموں! میں تو ہمیشہ سے یہی اگر آپ کو یاد ہے تو کچھ ایسی ہی شکایات مجھ سے پہلے بھی تھیں تو جب یہ شکایات اتنے عرصے تک ہو سکیں تو اب کوئی معجزہ تو ہو گا نہیں۔“

مجھے احساس ہے کہ میں شروع ہی سے آپ لوگوں کے لیے پریشانی کا سبب رہا ہوں مگر اب لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا کیونکہ میں ہاسٹل شفٹ ہو رہا ہوں۔ آپ لوگوں نے اتنا عرصہ ذمہ داری برداشت کی، میں اس کا احسان نہیں چکا سکتا مگر میں ساری زندگی آپ لوگوں کا احسان مند رہا۔“

انتا مضبوط اور بے پلک لہجہ، وہاں موجود ہر شخص کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

+

”صبا! ہم لوگ جا رہے ہیں اٹھ کر دروازہ بند کر لو..... اور ہاں سنو! میں نے ٹی وی پر کچھ سنا ہے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں ندرت کا چھوٹا بھائی آئے گا اسے دے دینا..... اور پلیز اب اٹھ جاؤ کچھ دیر میں اور امی جا بھی چکیں اور تم سوئی ہی رہ جاؤ۔“

ٹاکے آخری بار پکارنے پر، اس نے پوری آنکھیں کھول کر اور ہاتھ لہرا کر اسے چلے جانے کا دے دیا تھا مگر سارے گھر میں خاموشی چھا جانے کے باوجود وہ بہت دیر تک اسی خالی الذہن کیفیت میں رہی پھر، بہت دیر بعد خیال آیا تب کہیں جا کر دروازہ بند کیا اور لاؤنج میں چلی آئی۔

نیند کو آنکھوں سے جدا ہونے بہت دیر گزر چکی تھی مگر، سستی ابھی باقی تھی یا شاید اسے بوجھل بنا چاہیے جواب مستقل ہی طبیعت کا گھیراؤ کیے رہتا تھا۔ ایک بھر پور بے فکر نیند تو خیر بک کی خوب دیکھی چکی تھی۔ بے در پے زندگی نے ایسے جذباتی جھٹکے دیے تھے کہ ہر طرح کی فکر اور خیال سے آزاد ہو کر۔ کا خیال بھی مضحکہ اڑاتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ وہیں صوفے پر لیٹ کر زندگی کے اس رخ پر غور کرنے لگی۔ کتنا کچھ تبدیل ہو گیا تھا زندگی میں اس تبدیلی نے ذاتی ترجیحات کو کتنا بدل کر رکھا دیا تھا۔

پہلے گھر کا بڑا اہوا۔ دادا کے زمانے میں بنے گھر میں دیواریں کھڑی ہوئیں پھر ٹاک کی شادی کا انجام، کبھی کبھی تو صبا کو اس لڑکی کے ممبر پر رشک آنے لگتا تھا۔ ایک طویل عرصہ اس نے اپنے تلاش میں صرف اس لیے گزار دیا تھا کیونکہ اس کے والدین کے خیال میں بس لڑکی کی شادی ہی ہونا چاہیے۔ اسے چاہیے سنبھالنا ہوتا ہے اور بچے پالنے ہوتے ہیں کیریر پر یز کو تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

بہی بھی صبا کو لگتا تھا اخلاقیات کا وہ سبق جو اس کے ماں باپ نے ٹاک کو پڑھایا تھا وہ اس اخلاقی سبق سے بہت مختلف تھا جو انہوں نے اسے پڑھایا تھا۔ اسے کافی سارے معاملات میں جھوٹ دی گئی تھی اور اس سے بہت کچھ صرف وہی جھگڑ رہی تھی۔ معاشی ناہمواریوں، اچھے رشتوں کا بروقت نہ ملنا، بیٹی کا گھر بیٹھے جھوٹ کا نتیجہ صرف وہی جھگڑا ہے مسائل تھے جو بی زمانہ کم و بیش تمام والدین کو درپیش ہوتے ہیں۔ لہذا ٹاک اپنے بڑے ہو جانے کا خوف ایسے مسائل تھے جو بی زمانہ کم و بیش تمام والدین کو درپیش ہوتے ہیں۔ لہذا ٹاک کے معاملے میں امی ابو نے جتنی آنکھیں کھلی رکھی تھیں اتنا ہی اس کے معاملے میں پہلو تھی سے کام لیا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ اس کی شکل اور عقل کے ساتھ ساتھ قسمت پر بھی بے حد بھروسہ کرنے لگے تھے۔

مگر قسمت دوسروں کی مرضی سے ہی رخ بدلنے لگے تو کیا بات ہے۔ چہرہ معمولی وجوہات کی بنا پر ٹاک کی طلاق ہو گئی۔ ان دنوں ابو کو معاشی دقتوں نے پریشان کر رکھا تھا وہ بالکل ہی ڈھے گئے۔ ان دنوں پالیسی تبدیل ہو رہی تھی کئی افراد کو جبراً ریٹائر کر دیا گیا انہی میں ابو بھی شامل تھے۔

کئی دن تک گھر میں سوگ کا سماں رہا پھر امی کو اس کی فکر ستانے لگی۔

”اس ہادی احسان فراموش نے تو جا کر خبر ہی نہ لی۔ ایک اس کی پھپھی ہے جانے کب سے لا لار لگا رکھا ہے۔ میں کہتی ہوں صبا! ازراہد کو فون کر کے تو پوچھو آ کر خرب لا رہا ہے اپنی ماں کو؟“

صبا کا دل چاہا کہ تم آج تو بہت کر کے امی سے کہہ ہی دے کہ ہادی کو احسان فراموش نے نہیں ہوئے تو اس کی منت کر لیں کہ وہ ان کی بیٹی کو معاف کر دے۔ ایک معمولی سے مذاق کی سزا اتنی سخت تو نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ مذاق آج حرف بہ حرف حقیقت بن چکا ہے۔

مگر وہ انہیں نہیں بتا سکتی تھی۔ اس سے تو انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ سعد کی امی اب بھی اس گھر میں نہیں آئیں گی اور یہ کہ ”لارا“ سعد کی امی نے نہیں لگا یا تھا سعد کی امی نے نہیں آتا تھا۔

”جیسا لگتا ہے، میں تم سے شادی کروں گا نہیں کبھی نہیں۔“ ہادی کے چلے جانے کے عرصے بعد اس نے کہا تھا اور صبا کی شخصیت کا سارا کردار فرخاک ہو گیا تھا۔

آٹھ سے پہلے میرے ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ جب تم ہادی کے ساتھ مذاق کر سکتی ہو، اس کی فکروں سے کھیل سکتی ہو تو، یہی سب تم میرے ساتھ بھی تو کر سکتی ہو مگر، میرے دل میں ابھی گنجائش تھی تمہارے لیے تب ہی میں اپنے دماغ کو سطر ح کی تاویلوں سے بہلاتا رہا مگر آج کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، جا رہے کیوں؟ کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم کبھی بھی ہادی کے سحر سے نہیں نکل سکتیں، تم سر سے لے کر جملوں تک اس کے حصار میں ہو اور میں کبھی ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں داخل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا جس کے گرد کئی اور کے خیالات کی دیواریں کھڑی ہیں۔“

وہ سعد کو جھٹلا نا چاہتی تھی۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتی تھی مگر اس نے اپنے وقار کو بھاری لفظ نہیں کہا تھا کیونکہ کچھ حقیقتیں ہمیشہ سے تسلیم شدہ ہوتی ہیں اور یہ بھی ایک ایسی ہی حقیقت تھی جس کا وہ اس نے گزے سات سالوں میں کئی بار کیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ کس نامراد لمحے نے، اسے اس شخص کا اسیر بنا دیا جو جاتے ہوئے بس ایک لمحہ بھری نگاہ ہی اسے دے سکا تھا۔ وہ بس یہ جانتی تھی کہ وہ اب کبھی اس کے اثر سے لکنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر طرح کی بے چینی اور وحشیانہ اذیت کے باوجود۔

”اب پتا چلا اپنی تسکین کے لیے کسی کا دل توڑ دینا کتنا آسان ہے جبکہ اسے جوڑنا کتنا مشکل۔“ سعد کی شادی پر جب اس نے اسے مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا تب ہادی کے تعلق پہلے سعد نے کسی قدر طعنے کہا تھا۔

”تم اس طرح کہنے کا حق رکھتے ہو میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ بے شک مجھے دنیا کی ہری تر ہر سمجھتے ہوئے، جتنے چاہو طعنے دے لو مگر بس ایک بار ہادی کا کوئی ٹیکٹ نمبر دے دو پھر سعد! تم اعزاز نہیں سکتے میں کتنی اذیت میں ہوں۔“ وہ تقریباً رو دی تھی۔

”نہیں..... میں جانتا ہوں۔“ سعد نے بے اختیار کہا تھا اور پھر وہ دونوں ہی کچھ نہیں کہہ سکے مابا جانتی تھی کہ سعد نے سچ کچھ اس سے محبت کی تھی۔ خود اس کی محبت (جو کہ محبت نہیں تھی) کو تو وہی تھا رکھتی تھی۔ سعد کی طرف اس کا جھکاؤ صرف اس لیے تھا کیونکہ وہ جانتی تھی سعد کی زندگی میں شامل ہو کر وہ ہر سہولت و آسائش ملے گی، جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ مگر خواب، خواب ہی رہا۔

”کچھ روز پہلے، مجھے اپنے پاکستانی دوست سے پتا چلا ہے کہ ہادی انگلینڈ جا چکا ہے۔ مگر انگلینڈ وہ کہاں ہے اس بارے میں کوئی خبر نہیں ہے، البتہ مجھے جیسے ہی پتا چلے گا میں تمہیں ضرور بتا دوں گا۔“ اور پھر اس کرب میں رہتے ہوئے چھوٹا سا سال تھا جب سعد نے بذریعہ فون اسے اطلاع دی۔

”وہ یہاں آ گیا ہے۔ آج کل تو ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔ میں نے اسے تمہارا پیغام دیا تھا تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا! اور..... اور میں اسے فورس بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں یاد ہے مابا! اسے کرتی تھیں۔ وہ پہلے پتھر نہیں تھا۔ وہ اب پتھر ہو گیا ہے اور اسے پتھر بنانے والی تم ہو۔“ یہ سعد سے ہونے والا آخری ٹیلی فونک رابطہ تھا۔

”مابا! امی! امی کہہ رہی ہیں چائے بنانی ہے تھوڑی سی پی پی دے دیں۔“ پڑوس کی دیوار سے ارسلان کی آواز نے اس کے خیالات میں رخنہ ڈال دیا۔ اس نے کہا: چائے کی پی پی کا پورا جا رہا تھا یا اور ارسلان کو دے دیا۔ اسے پتا تھا اس بات پر اسے امی سے ڈانٹ پھینکا انسان عادت سے مجبور ہوتا ہے۔

زندگی کے ایک بہت اہم معاملے پر دھیان نہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اب وہ اکثر چھوٹے موٹے زلزلے میں لاپرواہی برت جاتی تھی۔

زلزلہ بعد اسے اپنے لیے چائے بنانے کا خیال آیا پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا اور اسکول کے بچوں ذرا دیر بعد اسے اپنے لیے چائے بنانے کا خیال آیا پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا اور اسکول کے بچوں

ہاکیاں چیک کرنے بیٹھ گئی، کچھ بھی تھا مگر ملازمت کر لینے سے وقت مثبت انداز میں گزرتا تھا۔ ابھی دو ہی کامیاں چیک کی تھیں کہ تھکنی بجنے لگی۔ اس نے ٹی وی پر رکھی کتابیں اٹھائیں اور باہر کی بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت بیل دی گئی، اس شخص سے لاؤنچ سے نکل کر گیت تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر قدرت

بشکل سر ہلا دیا۔

”کوئی اور گھر میں دکھائی نہیں دے رہا، باقی سب لوگ کہاں ہیں؟“ اپنے اور اس کے درمیان اس خاموشی کو ہادی نے ہی ختم کیا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے۔

”ابو اس وقت دکان پر ہوتے ہیں، امی اور ثامیلا درگاہی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔“

بھائی وہ اب ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔“

ہادی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا تھا۔ ہادی چونکا۔

”تمہارے ساتھ نہیں رہتا تو پھر کہاں رہتا ہے؟“ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”وہ اپنی بیوی کے گھر میں رہتے ہیں۔ ڈیفنس میں، تم فریش ہو جاؤ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔“

”میں ابھی زبردستی چائے پینا چاہتا ہوں۔ کھانا اب رات کو ہی کھاؤں گا۔“

صبا سر ہلا کر کچن میں آگئی۔ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کے باوجود وہ کچھ بھی سوچ نہ سکی تھی۔ اسے اپنا دماغ ایک دم سے خالی محسوس ہو رہا تھا۔ جس وقت وہ چائے مگ میں نکال رہی تھی اس میں چلا آیا۔

”تم باہر چل کر بیٹھو، میں چائے وہیں لارہیوں۔“ اس نے جھپکتے ہوئے کہا تھا۔

”چائے تو یہاں بیٹھ کر بھی پی جاسکتی ہے۔“ وہ چھوٹی سی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بکا

کھینٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

صبا نے خاموشی سے اس کے سامنے گھر میں ریفریجیٹ کے نام پر جو کچھ بھی موجود تھا نکال

دیا۔ جب وہ سب کچھ رکھ چکی تو ہادی نے چائے کا کپ اٹھالیا۔

”تم آج کل کیا کر رہی ہو؟“

”میں.....“ اسے جواب دینے میں کچھ دقت ہوئی، کیونکہ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

”تم اتنا چانک کیسے آگئے؟..... اطلاع دے دیتے تو کوئی تمہیں ریسیور کرنے ہی آجاتا۔“

”سوچا تھا، اچانک جا کر سر پرانز دلوں کا مگر شاید میں نے غلطی کی ہے۔“ جنہیں شاید برا

نہیں لگا۔ ”بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہادی نے کہا صبا گڑبڑ اسی گئی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو.....“

”کیا میں تو؟..... بات مکمل کرو صبا!“ پتا نہیں وہ واقعی انجان تھا یا صرف پوز کر رہا تھا مگر

لا تعلقی نے صبا کو حوصلہ فراہم کیا۔

”سعد نے جنہیں میرا بیج دیا تھا۔“ میز کی صاف سطح پر نگاہیں جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ صبا تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے مگر جب میرا پاس

پان میں گیا تھا اسی لیے میں نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔“

”اور اس سے پہلے کے میسج؟“

”ہاں وقتاً فوقتاً وہ میسج بھی مجھے ملتے رہے ہیں مگر تب میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ

کیونکہ جب میں تم سے خفا تھا۔“ ہادی نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ صبا متعجب اسے دیکھ گئی۔ جس انداز میں

وہ بات کر رہا تھا ایسا شرمندگی تو خود اس کے لہجے میں ہونی چاہیے تھی۔

”اور اب.....؟“ اس نے جھپکتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال پر ہادی ہنس دیا پھر جھپکتے ہوئے بولا۔

”اب میں اب میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ اب تو میں تم سے خفا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کبھی دیکھا

ہے کہ کوئی اپنے محسن سے خفا ہو جائے؟“

اس نے مسکراتے ہوئے صبا کی جانب دیکھا جو نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں سمجھیں؟..... ٹھیک ہے میں سمجھتا ہوں۔“

جب میں یہاں سے گیا تھا تو واقعی تم سے بہت خفا تھا۔ میں بہت زیادہ ہرٹ ہوا تھا۔ میں نے سوچا

قصاب! جب مجھے اپنا دوست کہنے والی لڑکی میرے احساسات کا مذاق اڑا سکتی ہے، مجھے اپنے مقصد کے لیے

استعمال کر سکتی ہے تو وہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے جو مجھے اپنا دوست نہیں مانتے۔

بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی جتنی بڑی مجھے لگی مگر، تمہارے اس معمولی مذاق نے مجھے میری زندگی کا

بہت بڑا پوائنٹ سمجھا دیا تھا اور وہ پوائنٹ تھا کہ، اس دنیا میں کوئی بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔

مگر جب غصہ اتر گیا تو میں نے اس نقطے کی تلاش شروع کی جس کی بنیاد پر تم نے سعد کو اہمیت دی تھی

تب ہی مجھے پتا چلا کہ، غلطی تمہاری نہیں بلکہ میری ہی تھی۔ سعد کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کسی کو بھی متوجہ کر

سکتا ہے۔ پراعتماد شخصیت، دولت و جاہات اور اس کے مقابلے میں میرے پاس کیا تھا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی

نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو یقیناً وہ سعد کو ہی ترجیح دیتی۔

تب..... ہاں تب میرے دل نے تمہارے حق میں گواہی دی اور میری جدوجہد کا آغاز ہوا۔ دیکھو

ایک اس لیے کی وجہ سے آج میں کہاں کھڑا ہوں۔ میرے پاس پراعتماد شخصیت ہے، دولت ہے البتہ بہت

نیا وہ جاہات نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے اب کوئی لڑکی مجھے ریجیکٹ نہیں کرے گی کیوں؟“

ہادی نے بہت شرارتی انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا، اگلے ہی پل مسکراہٹ اس کے لبوں سے

غائب ہو گئی۔

”تمہارے کیوں رہی ہو؟..... پلیز صبا کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟ اوہ میرے خدا..... آئی ایم

سوری صبا! میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”وہ بیٹھائی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔“

”اس طرح کی باتیں مت کرو ہادی! ہرٹ تو تمہیں میں نے کیا تھا۔“ وہ بری طرح رو رہی تھی۔
 ”ہرٹ کیا تھا، اور اب اس کا نتیجہ بھی دیکھ رہی ہو۔ تمہارے اس مذاق سے کیا کی آگئی ہے؟
 زندگی میں..... الٹا میں نے حاصل ہی کیا ہے۔ اس گھر میں رہ کر میں کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اس گھر سے نکلنے کا موقع مجھے تم نے فراہم کیا تھا۔ اس حساب سے تو تم نے مجھ پر احسان کیا اور میں بات بالکل برداشت نہیں کر سکتا کہ، میری محنت کی آنکھوں میں آنسو آئیں..... چلو شاہاش اپنی آنکھیں صاف کرو اور اپنے دل سے ہر وہ ہم کو نکال دو میں تم سے ناراض نہیں ہوں، بلکہ میں تم سے کبھی بھی ناراض ہی نہیں سکتا۔“

اس کا لہجہ بہت اپنائیت بھرا تھا۔ صبا نے اس اپنائیت پر بھروسہ کرتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔
 ”تمہاری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے، میں اور بنا دیتی ہوں۔“
 ”پہلے تم منہ دھو کر آؤ کیونکہ، آنکھیں پونچھ لینے کے باوجود تم فریش نہیں لگ رہیں اور مجھے نم مسکراتی فریش سی صبا ہی اچھی لگتی ہے۔“
 گو کہ بہت عام سی بات اس سے بھی عام لہجے میں کہی گئی تھی مگر بے اختیار ہی صبا نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا، چند پل وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے تھے اور دونوں ہی ہنس دیے۔

اور یہ وہ لمحہ تھا جسے ان دونوں نے ہی یادوں میں قید کیا تھا۔
 ”صبا! میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں، دوبارہ شاید موقع نہ مل سکے۔“
 جب وہ دروازے تک پہنچ چکی تو ہادی نے پکارا۔ صبا نے مڑ کر دیکھا تب وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔
 ”میں اس گھر سے تمہاری وجہ سے گیا تھا اور..... میں اس گھر میں واپس بھی صرف تمہاری وجہ سے ہوں، ورنہ میرے لیے اس گھر میں کوئی اٹریکشن نہیں تھی۔“
 اس لمحے صبا کو وہ، وہی ہادی ابراہیم لگا جو بہت سوچ سمجھ کر بولتا ہے کہ کہیں اس کی بات رد نہ کرنا جائے اور رد کرنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ تب ہی وہ کھل کر مسکرا دی۔
 محبت اپنے منطقی انجام تک پہنچنے کو تھی۔

+

”جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے سامنے ہی تو ہے بیٹا! جس قسم کے حالات ہمیں برداشت کرنے پڑے ہیں، وہ تو اچھے اچھوں کی مت مار دیں۔ تمہارے ماموں کی حالت تو اللہ کے کرم سے پھر بھی سنبھل چکی۔
 ورنہ کچھ عرصہ پہلے تم دیکھتے تو.....“
 ماما کی آواز بری طرح رندہ گئی تھی۔ ہادی ان کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ اس سے ایک بھی لفظ نہیں

”تمہارے دونوں ماموں نے تو خیر ہمارے ساتھ جو کیا، سو کیا اصل دعا تو ہمیں عباد نے دیا ہے۔
 میری سہ شادی کی، پھر بے غیرتوں کی طرح بیوی کا در پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تم خود بتاؤ ہادی! ایسے میں بھی نہارے لاما کی طبیعت صحیح رہتی تو کیسے، پھر شتا کے ساتھ جو بھی ہوا اس نے تو انہیں بالکل ہی بوکھلا کر رکھ دیا۔ زمانہ بھی تو بدل گیا ہے انسانوں کی حقیقت پتا چلے بھی تو کیسے؟ خدا گواہ ہے کہ ہم نے پوری چھان بین کی تھی مگر نجانے کہاں کی رو گئی۔ ایسے دھوکے باز لوگ نکلے کہ بس۔ بد بختوں کو اپنی پھول سی بچی سوپ دی مگر ان کی جان تو جہیز میں ہی آگئی تھی، مطالبات تھے کہ ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ سچ کہتی ہوں ہادی! میری شتا کا

واصول ہے جو سات ماہ اس جلا کے ساتھ رہی۔
 اب تو بس شفقت کی اتنی ہی خواہش ہے کہ دونوں بچیاں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں تمہاری بھینس نے بھی تو..... خیر چھوڑو اس بات کو۔ گزری باتوں کا کیا ذکر کرنا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ہادی! وہ جو کہتے ہیں کہ دنیا کا انسان کو کسی دنیا میں جھگڑتا پڑتا ہے تو مجھے سچ ہی لگتا ہے۔ جانے انجانے میں ہم تمہیں مصیبت سمجھتے رہے تھے تمہارے معاملے میں ضرور ہم سے کوتاہیاں ہوئی تھیں اسی کا نتیجہ.....“
 ”چھوڑو یہ بھی ماما! ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، گزری باتوں کا ذکر کرنے کا فائدہ؟ تو بھول جائیے جو گئی ہو آپ بس اللہ سے اچھی امید رکھیں اور دعا کیا کیجئے، دعاؤں نے تو بڑے بڑوں کی مشکلات حل کی ہیں ان کے مقدر بدلے ہیں۔“

بہت عمارد اپنائیت سے ماما کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے انہیں تسلی دی تھی۔ مگر باوجود ضبط کے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ہی گئے۔

ماں قریب سے گزرتی تھی انہیں روتا دیکھ کر چونک سی گئی۔
 ”کیا ہوا؟..... اسی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ ساتھ ہی اس نے استفہامی نظروں سے ہادی کو دیکھا۔

”کچھ نہیں ہوا تم بھگ کر جاؤ اور ماما کے لیے ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔“
 ہادی نے اپنائیت سے ماما کے کندھوں لگے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا تھا اور گو کہ، صبا کی تسلی نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی، ماما کی جانب بڑھ گئی۔

”آپ کیوں پریشان ہوئی ماما! آپ کے پاس عباد نہیں ہے تو کیا ہوا میں جو ہوں آپ کا بیٹا۔
 ماما آج سے آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ اس گھر کے سب ہی مسائل آج سے میری ذمہ داری ہیں۔“
 ”کیسے بے ساختہ اسے دیکھا پھر مگر جھکا لیا غالباً ماما کی کوئی یاد حافظے میں لہرائی تھی۔
 ”کیسے پریشان ہونا چھوڑ دوں ہادی! جب تک صبا اور شتا اپنے اپنے گھر کی نہیں ہو جاتیں پریشانی ختم

ہی نہیں ہو سکتی..... یہ مبانے بھی تو مجھے پریشان کر رکھا ہے، اتنے اچھے اچھے رشتے تھے پچھلے دنوں کا بھتیجا تو خیر ہم سب کو ہی پسند آیا تھا۔ اچھا بھلا کاروبار بھی تھا اس کا مگر یہ مبانے بھی تو..... رشتہ ہے کہ شادی نہیں کرنی۔ مجھے تو لگتا ہے سعد کا ہی خیال لے بیٹھا ہے اسے.....“

آخری بات مامی نے کچھ جھجکتے ہوئے کہی تھی ہادی نے غیر محسوس انداز میں اپنا بازو ان کے سے بٹالیا۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے مامی! سعد تو شادی کر چکا ہے.....“ مامی خاموش رہیں تو وہ بولا۔

”بہر حال ماما بہت حقیقت پسند لڑکی ہے۔ آپ اب اس سے بات کر کے دیکھیں مجھے بڑا انکار نہیں کرے گی۔“

اس کے اس قدر پراعتماد لہجے میں کہنے پر مامی نے کچھ الجھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

”مجھ پر بھروسہ کیجئے مامی! اب کی بار وہ آپ کی بات ضرور مان لے گی لیکن اس بار میں اسے گاہ۔“

تب ہی ماما پانی لے کر آگئی تو انہوں نے گلاس لے کر منہ سے لگالیا۔ انہیں غالباً ہادی کی حقیقتاً تسلی ہوئی تھی۔

”امی! تمہیں خالہ کا فون ہے۔“ اندر کمرے سے شاکی آواز سنائی دی تو وہ آٹا ٹاٹا اندر بھاگیں

”ہادی! امی رو کیوں رہی نہیں؟“ امی کے جانے کے بعد مبانے اس سے پوچھا۔ ہادی

پرسوج نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔

”مامی! شا کے لیے بہت فکر مند رہتی ہیں۔“

ماما باسٹ سے تخت پر بیٹھ گئی۔

”فکر مند نہ ہوں تو کیا کریں پھر تمہیں پتا ہے ہادی! جب ثنا یہاں آگئی تھی تو وہ دن تو بہت تھے۔ ابو بیمار، امی پریشان اور شا کی حالت تو بہت ہی خراب رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو بالکل ہی ہسٹربل تھی، ہم لوگ چاہ کر بھی ان دنوں کی تلخی نہیں بھلا سکتے۔ اب تو پھر بھی اس کی حالت بہت سنگین پہلے دیکھتے تو.....“

”بس بھی کرو ماما! آخر ان باتوں کو یاد رکھنے کا فائدہ ہے بھی کیا؟ پھر ثنا اب بہت بہتر ہے۔“

ہے ملازمت نے اسے سنبھلنے میں بہت مدد کی ہے۔“ ہادی نے کہا۔

”اور پلیز تم اپنی شکل درست کرو۔ یہ بات سن کر تم نے جیسی شکل بنائی ہے اس کے ساتھ ماما کی خاک تسلی دو گی۔“

اس کے ہلکے ہلکے انداز پر ماما آہستگی سے مسکرا دی۔ البتہ منہ سے کچھ نہیں کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے۔ پتا نہیں تم اس خبر کو سن کر خوش ہوگی یا نہیں مگر میں بہت خوش ہوں۔“ ممانے استغما یہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولا۔

”پرسوں پچھو آ رہی ہیں پاکستان۔ وہ دو دن یہاں رکیں گے۔ پھر ایٹ آباد اپنے سسرال چلی جائیں گی مگر، جانے سے پہلے وہ ماموں سے ایک خاص بات کرنے والی ہیں اور میرا خیال ہے وہ خاص بات سن کر تم خوش ہوگی۔“

اس نے مسکراتے ہوئے ماما کی جانب دیکھا وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔

وہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی اس بارے میں اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اطمینان تھا تو بس یہی کہ اچھے دن اب اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہیں۔

+

”میں نے ابھی اگلے مہینے ہی پاکستان آنا تھا۔ میرے چھوٹے دیور کی بیٹی کی شادی ہے۔ پندرہ تاریخ کو مگر ہادی نے تو فون پر جلدی جلدی کا شور ہی مچا دیا تھا..... ماما! میری چائے میں آدھا چھچھر ڈال دینا ڈاکر تو کہتے ہیں ٹیٹھے کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دو مگر مناس کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔“

پچھو کے جلتے جلتے انداز میں کہنے پر وہ مسکراتے ہوئے شکر حل کرنے لگی۔

پچھو کی پرسوج نظرس کچھ دیر کو ٹھہریں پھر انہوں نے ہادی کی جانب دیکھا۔ وہ ممکن انداز میں اپنے

اہوں سے ٹوکھام تھا۔

”ٹوکھامی نہیں دے رہی۔“ اچانک ابو نے کہا تھا۔

”وہ نماز پڑھ رہی ہے ابو۔“ صاحب خضر جواب دے کر سب کو چائے سرو کرنے کے بعد اپنا کپ لے کر

بہنہ لگی۔

”آپ کی دونوں بی بیٹیاں ماشاء اللہ بہت پیاری ہیں، بیٹیاں تو خیر ساری ہی پیاری ہوتی ہیں۔ ڈر تو بس ان کی قسمتوں سے لگتا ہے۔“ وہ چائے کاپس لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”شاکے بارے میں مجھے ہادی نے بتایا تھا، یقین کریں بہن! مجھے بے حد افسوس ہوا۔ آج کا دور تو ایسا ہے کہ انسان خود پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ وہ جو ایک کہات ہو کر تھی ہمارے ماں باپ کے زمانے میں لکھتا تھا کہ گامی تو چھاؤں میں ڈالے گا تو اب غلط ہی ہو چکی ہے۔ آج کل تو سب سے زیادہ نقصان بھی ایسے ہی پہنچاتے ہیں۔ اب ایسے میں بندہ غیروں سے کیا شکوہ کرے، بہر حال بات کہاں سے کہاں جاری ہے بڑا ہی مناسب وقت ہے، بھائی صاحب بھی موجود ہیں تو میں..... صاحبی! آپ ذرا ثنا کو تو بلا لیتے۔“

وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل آئی پھپھو نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی
”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ ثناء سنانے کے کمرے سے نکل کر اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔

”مجھے، کچھ بھی نہیں۔“ اپنے دل کی بے ہنگم دھڑکن کو سنبھالتے ہوئے وہ ہنس دی اور اس کی لپٹ
سبھ سے باہر تھی۔

”اچھا..... چلو پھر اندر چلتے ہیں کچھ دیر تو ہادی کی پھپھو کے پاس بیٹھنا چاہیے، مجھے بکری
کرنے ہیں۔“

دل میں آئے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ثناء نے اندر کی جانب قدم بڑھائے تو مہمان نے
ہی روک دیا۔

”ابھی نہیں ثناء..... تھوڑی دیر میں چلیں گے۔“

”کیوں؟“ ثناء نے الجھ کر اسے دیکھا تو وہ بے بسی سے ہنس دی اور بولی۔

”چلو اندر ہی چلتے ہیں تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔“ اس کا دل ایک انجانی لے پر دھڑکا
کمال بات یہ تھی کہ اسے یہ سب اچھا بھی لگ رہا تھا۔

”لو یہ بچیاں بھی آئیں۔“ ثناء کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے پھپھو کی طرف
اور بس ایک نظر ہی سب کے گرنگ چروں کی جانب دیکھا تھا۔ پھر تکلف سے صوفے پر گئی گئی
دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”ارے بیٹا! تم ادھر کیوں بیٹھ رہی ہو یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔“

اس نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور اصل میں چوکنے کا موقع تو یہی تھا۔ پھپھو
نہیں ثناء سے مخاطب تھیں۔

پھر اس نے ثناء کو تذبذب کی کیفیت میں ان کے قریب بیٹھنے دیکھا۔

پھپھو نے اس کے کندھوں کے گرد بازو پھیلا کر اسے قریب کر لیا تھا۔ ان کے دوسرے ہاتھ
نعیسی کی محلی ڈبیا تھی۔

صبا کو اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ وہ بہت بے یقینی سے پھپھو اور ثناء کو دیکھ رہی تھی۔
”بھائی صاحب آپ کی اجازت ہے؟“ پھپھو نے اجازت طلب نظروں سے ابھری جانب
اس محلی ڈبیا میں سے ایک انگوٹھی نکال کر ثناء کی انگلی میں پہنا دی۔

”بس آج سے آپ کی یہ بیٹی، میرے ہادی کی نشانی ہے، آپ کے پاس۔“ انشاء اللہ وہ
اپنی بیٹی کو رخصت کر دالیں گے۔“ پھپھو نے ثناء کی پیشانی کو چومنے کے بعد کہا۔

مہمان نے اب کی بار بے حد بے یقینی اور سرسراہٹ سے ہادی کی جانب دیکھا اور، اور بس پھر اس کا دل
سانس لینا بھول گیا۔

ہادی بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ کچھ جتنا ہی ہوئی، کچھ جتنا ہی ہوئی۔
ایک ایسی بات کا احساس دلاتی ہوئی مسکراہٹ جس کا شائبہ تک اس کے گمان کی سرحد کو چھو کر نہ گزرا تھا۔

”آج حساب برابر ہو گیا ہے۔ اب تمہارا کوئی قرض مجھ پر واجب الادا نہیں ہے۔“
اس کی مسکراہٹ میں بس یہی لکھا تھا اور اس تحریر کو صبا حرف بہ حرف پڑھ سکتی تھی۔

کچھ کہنے یا سننے کے لیے اب رہی کیا گیا تھا۔ اس نے سر جھکا یا اور شکستہ قدموں سے چلتی کمرے سے
باہر نکل گئی۔

ہادی ابراہیم نے اس کے قدموں کی ٹھٹھکی کو محسوس کیا اور چند لمحوں کے توقف سے صوفے کی بیک
سے سر نکال دیا۔ ابھی اس کمرے میں اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ اس کے ایما پر ہو چکا تھا اور وہ اپنے اندر

ایک سکون ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود دل کے کسی کونے میں کہیں دور دکھ کی ایک نعیمی سی
چنگاری روشن ہو گئی تھی۔

”بس آج سے میرے سکون کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ تم نے جو دکھ مجھے دیا تھا صبا شفیق! وہ میں
تمہیں مودیت لوٹا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ میں تمہارے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ بس ایک کام تھا میرے

ہاتھ میں اور وہ یہ کہ میں تمہارے سارے احساسات کو زندگی بھر کے لیے اپنی مٹھی میں قید کر لیتا اور تمہاری
بہن کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ کم سے کم اس معاملے میں تو تمہیں میرا

احسان مند ہونا ہی پڑے گا۔
جو سزا میں نے تمہارے لیے تجویز کی ہے گو کہ وہ بھی کچھ کم نہیں ہے تم کبھی مجھ سے جواب طلبی نہیں کر
سکو گی۔ تم اپنی بہن سے اپنا حال دل نہیں کہہ سکو گی حتیٰ کہ اپنی ماں کو بھی اپنا غم نہیں بتا سکو گی، لہذا سب گھر
والوں سمیت تمہیں ساری زندگی میرا احسان مند رہنا پڑے گا کہ میں نے تمہاری طلاق یافتہ بہن کو سہارا

دیا۔

”میں یاد ہو گا صبا! تم نے مجھ پر ایک احسان کیا تھا۔ میں اس احسان کا بدلہ تمہاری بہن کو اپنا کرتا رہا
ہوں مگر میں کبھی ثناء کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہونے دوں گا کہ وہ میری تسکین کے لیے مہربان ہے۔
تم واقعی میری عسہ ہو صبا! تمہارے اس ایک مذاق نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ میری ساری
جدوجہد کے پیچھے صرف اور صرف تمہارا وہی مذاق کارفرما تھا۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہارے اس
مذاق نے مجھ سے کیا چھوٹا ہے؟ میں بتاؤں تمہیں کہ تمہارے اس مذاق نے مجھ سے کیا چھینا؟
تمہارے اس مذاق نے ہادی ابراہیم کو مار ڈالا صبا! اس مذاق نے میرا ظرف مجھ سے چھین لیا صبا!

میں نے تم سے کیا چھوٹا ہے؟ میں بتاؤں تمہیں کہ تمہارے اس مذاق نے مجھ سے کیا چھینا؟
تمہارے اس مذاق نے ہادی ابراہیم کو مار ڈالا صبا! اس مذاق نے میرا ظرف مجھ سے چھین لیا صبا!

میں نے تم سے کیا چھوٹا ہے؟ میں بتاؤں تمہیں کہ تمہارے اس مذاق نے مجھ سے کیا چھینا؟
تمہارے اس مذاق نے ہادی ابراہیم کو مار ڈالا صبا! اس مذاق نے میرا ظرف مجھ سے چھین لیا صبا!

میں نے تم سے کیا چھوٹا ہے؟ میں بتاؤں تمہیں کہ تمہارے اس مذاق نے مجھ سے کیا چھینا؟
تمہارے اس مذاق نے ہادی ابراہیم کو مار ڈالا صبا! اس مذاق نے میرا ظرف مجھ سے چھین لیا صبا!

میری وسعت قلبی سے مجھے محروم کر دیا۔ اس مذاق نے مجھے پتھر بنا ڈالا ہے صبا اور۔۔۔

اور یہ کم ظرف انسان تمہیں معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اب تمہیں اجازت ہے صبا مجھ سے جس کو بیا جو مرضی کہو۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ حساب برابر ہو چکا ہے۔

دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے زور سے آنکھیں میچ کرئی کو بھکا ہوا خود کو اس محفل میں گم کر دینے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

اس نے کہیں پڑھا تھا ”محبت کی فکر نہیں کرنی چاہیے وہ تو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتی ہے لیکن اگر ادا ہو جائے تو پھر اسے سراٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔“

اور اس نے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچا کر زندگی بھر کے ملال سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ محبت کی خیر تھی کبھی نہ کبھی مل ہی جاتی تھی اور نہ بھی ملتی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مردہ دلوں کو ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

آرزو، انتہا، موت

کلوری بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے والے شخص نے ہاتھ میں پکڑا موبائل بیڈ پر اچھال دیا تھا۔ اس کے لمبوں پر مسلسل ایک مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی جبکہ نگاہوں اور وجود سے خاص طرح کی ”تراوٹ“ جھلک رہی تھی۔

”امیر! یاد رکھو! کافی تو لانا۔“

دروازہ بند کرنے سے قبل اس نے دروازے سے منہ نکال کر ملازم کو پکارا تھا اور اس کے بعد وہ کمرے کے اندر، پوار کے ساتھ رکھے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے آن رکھا تھا۔

ایٹل گرے کلر کے قمیضی بیس سوٹ نے اس کے کمرے کی جسم اور سر و قد کو کچھ اور نمایاں کر رکھا تھا مجموعی طور پر وہ بے تحاشا بیٹنڈم تھا۔ اس بات کی گواہی اس کا دل دے رہا تھا اور آئینہ بھی۔ پھر ابھی کچھ دیر قبل اس بات کا برملا اعتراف احسان منیر کی طرف سے اربن کی جانے والی گیدگ میں ملنے والی فریج حینہ نے بھی کیا تھا۔

”نہر آرد اموست بیٹنڈم من ان دس پارٹی۔“ ایٹلے بروکر کے کہے گئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ نتیجتاً کچھ مزید خوشگواریت اس کے اندر اتر گئی اپنی ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے اس نے اس ٹام کی گیدرنگ کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے ذہن میں زندہ ہوتے دیکھا۔

تین گھنٹے بعد ایٹلے جیسی حسین و نازک اندازم دو شیزہ کی قربت میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ ایٹل سے بال سنوارتے ہوئے وہ اپنی پسندیدہ مخصوص دھن گنگنا رہا تھا۔ اصغر کو کافی لانا دیکھ کر وہ واپس بیٹھتا بیٹھا تھا۔

”شٹاپ! بہت جلدی لے آئے۔“ ٹنگ لیتے ہوئے اس نے خوشگواریت سے کہا پھر پوچھا۔ ”میرا کوئی فون تو نہیں آیا۔“

”جی گاؤں سے فون آیا تھا۔“ اصغر نے مودبانہ انداز میں بتایا تو وہ سب لیتے ہوئے چونک کر اٹھا۔

”بابا صاحب کا فون آیا تھا؟“

”نہیں جی! فرزانہ بی بی کا فون تھا۔“

”اچھا۔“ اس نے ایک اور بڑا سب لیا۔

”کوئی پیسج چھوڑا ہے بی بی نے میرے لیے۔“

”وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ گھر آتے ہی ان سے بات کر لیں۔“ اس نے سر ہلایا پھر اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔۔۔۔۔ اچھا سنو! بی بی کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا کہ میں کہاں گیا، متوقع خدشے کے پیش نظر اس نے پوچھا۔

”یہی کہ آپ سائیٹ پر گئے ہوئے ہیں۔“ اصغر کا جواب تسلی بخش تھا۔

اس نے گم میں موجود باقی ماندہ کافی حلق میں انڈلی، پہلے کوٹ اتار کر بیڈ پر رکھا پھر اٹھا کر نمبر پر پس کرنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد کال ریسیو کر لی گئی تھی اور توقع کے عین مطابق دوسری ہی تھی۔ جس نے چھوٹے ہی کہا تھا۔

”کہاں تھے آپ، میں نے گھر پر بھی فون کیا اور آفس میں بھی مگر آپ۔۔۔“

”اصغر نے بتایا تو ہے تمہیں سائیٹ پر گیا ہوا تھا میں اور موبائل اتفاق سے گھر بول گیا تو سائیٹ پر بھی موبائل میں زیادہ تر آف ہی رکھتا ہوں۔ اب بندہ ایک وقت میں ایک کام ہی کام کی طرف دھیان دے یا بیوی کی طرف اور تم کب کال کر لو یہ بھی پتا نہیں ہوتا پھر تمہاری آواز میں کس کجنت کا دل لگتا ہے۔“

اس نے وہی زبان استعمال کرنی شروع کی تھی جو فرزانہ کو پسند تھی۔

”اس وقت آپ کیا کر رہے تھے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”پندرہ منٹ پہلے سائیٹ سے واپس آیا ہوں اور تم ہی کو یاد کر رہا تھا اور ریلی فرائیڈا میں مس کر رہا ہوں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔ بیوی اب تو آفس میں دل نہیں لگتا اس قسم کے جھوٹ بولنے کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ سوڈا ایلاگ ڈیوری پہلے کی نسبت نام جذبات سے لبریز تھی۔

”آپ بھی مجھے بہت یاد آ رہے ہیں سکندر! کچھ دنوں کے لیے گاؤں آ جائے۔“

”دل تو میرا بھی بہت چاہ رہا ہے مگر ابھی آن نہیں سکتا۔ کچھ آفیشل پر اہم ہیں۔ پھر آج کل فیکٹری کھولنے کے متعلق پروگرام بن رہا ہوں۔“

”مہاڑ میں جائے آپ کا پروگرام بس مجھے نہیں پتا کچھ دنوں کے لیے آ جائیں۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ سکندر کو حیرت نہیں ہوئی حالانکہ فرزانہ نے ایسا انداز پہلی بار اپنایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، نمبر پر بابا صاحب کی آواز گونجی تھی۔

”تو کیا فرزانہ اتنی روایت کی گفتگو بابا صاحب کے سامنے کر رہی تھی؟“

”السلام علیکم بابا صاحب! آپ کیسے ہیں۔“

”شکر الحمد للہ۔۔۔۔۔ سنو سکندر! جتنی جلدی ہو سکے گاؤں پہنچو، ہمیں تم سے ایک ضروری کام ہے۔“

”مگر بابا صاحب۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر بابا صاحب نے موقع نہیں دیا۔

”کل شام تک گاؤں پہنچ جاؤ۔“

”کیوں اب تو آ رہے ہیں۔“ فرزانہ کی آواز ایک بار پھر چبکی۔ اس نے مختصر بات کر کے فون بند کر دیا مگر وہ الجھ گیا تھا۔ بابا صاحب کا حکم آمیز رویہ اور فرزانہ کے چند معنی خیز جملے اسے حیران کر رہے تھے۔ گردن کے پیچھے ہاتھ رکھتے پر سوچ انداز میں اس کی نگاہ اپنی گرے شرٹ کی آستین تک گئی تھی۔ آج شام اٹھلے بروکر کے ہونٹوں پر لگی ریڈ لپ اسٹک اب اس کی آستین پر منتقل ہو چکی تھی۔ وہ مسکرا کر اوڈروپ کی طرف بڑھ گیا۔

ذہن میں صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ اور کچھ دیر میں وہ نازک انداز میں اٹھلے بروکر اس کے گھر میں ہوگی۔

آج کی رات۔۔۔۔۔ ایک اور حسین رات ہوگی۔

+

تھیرمین فطرت انسانی ہے لیکن جب کیا کیا جائے جب تحیر بھی آپ کو تحیر کر دینے پر بے بند ہو۔ سکندر مبین حیات کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ تحیر کی شدت سے بے بس کھڑا ایک تنگ انداز میں تھا جس کی موجودگی کو مان لینے پر نہ دل راضی تھا اور نہ دماغ۔

یک لخت اس کے دل نے شدت سے آرزو کی تھی کہ یہ محض خواب ہو۔ مگر وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ دل میں برچھیاں اتارنی اور اعصاب پر کوڑے برساتی حقیقت۔۔۔۔۔ جسے نہ وہ مان سکتا تھا اور نہ جھٹلا سکتا تھا۔

خواب تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ خواب میں تو اسے سکندر نے تب بھی نہیں دیکھا تھا جب اس کے قدم سے قدم ہٹا کر چلنے میں ایک لطف آتا تھا۔

قبول اور روکی ملی جلی کیفیت میں اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور دل پہنے دماں کی لہریں کے ساتھ ”قبول“ پر مہر لگادی۔

وہ ”دبی“ تھی جسے آج سے چار ماہ قبل اس نے آخری بار دیکھا تھا۔

بڑے سے پلنگ کے بچوں بیچ میروں رنگ کے نہایت شاندار سے عروسی جوڑے میں بیٹھا ہوا اور طہرات دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حسین تو خیر وہ تھی ہی مگر اس وقت نفاست سے کیے گئے ایک لہر اسے حسین تربیادیا تھا۔

اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ یہاں آکر اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ ہرگز نہ اسے یاد آیا کہ جب وہ بابا صاحب کی معیت میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس نے گھونٹ گھونٹ کر کھانا کھا کر چھڑ جائے گا تو کھٹ کیسے کھل گیا اور برق نے پنجے جھاڑ کر اس پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید غیر متوقع تھا کہ وہ جہاں کا تھاں ساکت رہ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ بابا صاحب اس کے قریب کھڑے بہت غور سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔

نجانے انہیں شادی جیسے معاملات میں اتنی بھلت دکھانے کا شوق کیوں تھا؟ پہلے اس کی اور فرزند شادی بھی کچھ اس تیز رفتاری سے کروائی تھی کہ وہ کچھ سوچ سمجھ بھی نہ سکا تھا اور اب یہ ایک اور ٹھٹھا..... اول تو اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا اور اگر سوچ بھی لیتا تو بھلا کیا کر پاتا وہ پہلے فرزند کی دفعہ ما کے سامنے احتجاج نہیں کر پایا تھا تو اب تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ بابا صاحب کی حیثیت کسی بھی لحاظ سے کم تھی۔ سکندر کے ایک حرف احتجاج کے نتیجے میں وہ عاق بھی کر سکتے تھے۔

سکندر بین حیات ابھی تک اپنی نگاہیں اس پر سے ہٹائیں نہ سکا تھا۔ وہ بابا صاحب سے کچھ کہنا چاہتا مگر قوت گویائی مکمل طور پر سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ بابا صاحب کا مرتبہ اور حیثیت نہیں بلکہ دھچکے تھا جو اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔

بنیادی طور پر وہ اشرف المخلوقات کی اس کینگری سے تعلق رکھتا تھا جہاں کے باشندے کسی بھی مسئلہ کو چنگیوں کی زد پر اڑا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت وہ خود کو اپنی تمام تر خوبیوں اور صلاحیتوں سے تہی پا رہا تھا۔ بھلا کہاں کی چنگیاں اور کہاں کی کینگری اس کے ذہن میں تو بس دھماکا ہوا تھا اور اسے اعصاب زلزلے کی زد میں آگئے تھے۔

اگر نکاح سے قبل ہی کچھ ضروری نوعیت کی معلومات حاصل کر لی ہوتیں تو یقیناً اس صورت حال سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ بابا صاحب کی اکلوتی اولاد ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا فیصلہ ماننے سے انکار کر سکتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے عاق کیسے جانے کا خیال بھی نہ کرتا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ حقیقت اسے اصل حقیقت اسے بابا صاحب کے گوش گزار کرنی پڑتی اور وہ حقیقت اسے پہلی بار شہر ہا کی

ذلت آہر گئی تھی۔ کچھ دیر قبل جب نکاح کی رسم ادا کی جا رہی تھی تو وہ بجائے قاضی کی آواز سننے کے محض بابا صاحب کے چہرے کی طرف دھیان لگائے بیٹھا تھا۔

ان کے سنجیدہ و مرد بار چہرے پر فقط اطمینان اور خوشی تھی۔

پھر اس نے فرزانہ کو منٹو لایا چاہا کہ اعتراض کا پہلا حق وہی رکھتی تھی مگر وہ بھی بے حد پرسکون بلکہ کسی حد تک خوش دکھائی دیتی تھی اور اب وہ بھی جو خواب گاہ میں نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے ہونٹوں کے کونوں میں بڑی واضح مسکان تھی۔

سکندر کو یاد آیا کبھی یہی مسکان دیکھ کر وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ مگر یہ کیا ہوا؟ اس نے تو کبھی ایسا نہ سوچا تھا اس کے لیے حریف وہاں رکنا محال ہو گیا۔ اس نے خود کو باہر کی سمت قدم بڑھاتے دیکھا تھا۔ ایک بوجھ تھا جو اس کے اعصاب کو چننے پر مجبور کر رہا تھا ایک خلش تھی جو پے در پے کچھ لگا رہی تھی۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟ حویلی میں کتنے بہت سے لوگ موجود ہیں اور بابا صاحب آپ کو مردانے میں بلارہے ہیں۔“

فرزانہ تھی۔ اس کی بیوی جس نے تیزی سے جاتا دیکھ کر روکنا چاہا تھا۔

”بابا صاحب سے کہہ دو میں شہر جا رہا ہوں بہت ضروری کام ہے۔“ اسے اپنی آواز اندھے کنویں کے کنارے سے مشابہ لگی تھی۔

”لیکن باقر زینہ برس رہا ہے طوفان آیا ہوا ہے۔ کیسے جائیں گے آپ، پھر ابھی تو.....“

اور کانٹا نہیں تھا۔ رک سکتا بھی نہیں تھا۔ فرزانہ کے ادھورے جملے سے وہ واقف تھا مگر وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ باہر کا طوفان اندر کے طوفان سے زیادہ زور آور نہیں ہے ہر طرف برسنے والی بارش اس الاؤ کو نہیں بچا سکتی جو اس کے اندر سلگ رہا تھا اور اس الاؤ کا نام تھا روشانی قمر، ہاں وہی روشانی جو بڑے طوفان سے اس بڑی حویلی کی خوب صورت خواب گاہ میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔

موسلا دھار بارش اور کڑا کے دار بجلی کو خاطر میں لائے بغیر اس کی لینڈ کرورز شہر کی طویل اور سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی اور کانٹوں میں ایک آواز کے فشارے گونج رہے تھے۔

”ہم سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے سکندر بین حیات! تم کو لوٹ کر بیہوش آنا ہے اور تم لوٹ کر بیہوش آؤ گے“ سبہ ساختہ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ دیے تھے۔ بہت زور سے بجلی کڑک کر خاموش ہو گئی تھی جب کہ بادل ہنوز گرج رہے تھے اور برس رہے تھے۔ اسٹیرنگ و ہیل چھوڑ دینے کی بنا پر کروڑ برس ہر گز گمنام کی طرح لپکتے گئے تھے اور اس سے پہلے کہ یہ تاکن کسی درخت سے سر پھوڑتی اس کا پاؤں بریک ہاتھ ہاتھ اسٹیرنگ کو قابو کر چکے تھے۔

”دیکھا ہم نہیں تو ہمارا احساس ہی تمہارے ساتھ ہے، کہو سکندر کیسے بچ پاد گئے اس احساس سے۔“

آواز اس کی سماعت سے ٹکرا کر گویا بندیشوں کے سچ بھگتی لگی تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر اپنے اہلکار پر سکون کرنا چاہا تبھی کرتے کی دہائی جیب میں رکھے موبائل نے بجنا شروع کر دیا۔

کئی سیکنڈ بعد اس نے اپنے ماتھے پر چمکتے پسینے کو صاف کرتے ہوئے موبائل جیب سے نکالا تھا۔ اسکرین پر آنے والے نمبر اور نام سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پچھلی رات گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ بنا کال ریسیو کیے اس نے موبائل آف کر دیا تھا اور ڈیش بورڈ پر اچھال دیا تھا۔ وہ اس وقت کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گاڑی اشارت کرنے کی بجائے اس نے سرسٹ کی پشت سے نکال دیا تھا۔ ماضی کے گڑھے میں کو دن آسان نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ کچھ آپ کے دامن کا اندیشہ ہوتا ہے جس سے آپ بڑی احتیاط سے بچ نکلے ہیں۔

پھر سکندر زمین حیات، حال کا مین تھا جو اس اصول پر کاربند تھا کہ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ بچے دیکھنے کا کیا فائدہ؟ مگر کبھی کبھی اصول بدلنے پڑتے ہیں اور وہ کام بھی انجام دینے ہوتے ہیں جو کہ ہاں ہوتے ہیں۔

سکندر زمین حیات بڑی بے بسی سے ماضی کی جانب گھسٹ رہا تھا کوئی انجانی طاقت اسے کچھ تھی۔

آسمان پر گرجے بادلوں نے بجلی کو کچھ اور پرٹیش کر دیا تھا۔ بارش ایک تسلسل سے برس رہی تھی۔

+

پرائیویٹ ہاسٹل کے مخصوص کمرے میں داخل ہوتے ہی جس قسم کے والہانہ استقبال کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ اس کی توقعات کے عین مطابق تھا۔

سکندر زمین حیات جیسے امیر زادے بچوں کی ایک فوج ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں۔ اب بھی وہ گاؤں کا تقریباً بارہ روز گزار کر آیا تھا اور سبھی بچوں یعنی دوستوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے اپنے اپنے دہان دوستانہ انداز اور چالپوسی بھری خشکی کا اظہار کیا تھا۔

”چار دن کا کہہ کر بارہ دن بعد واپس آنا کہاں کی شرافت ہے یا! میرا دل تو بالکل نہیں لگتا۔“

بغیر۔

”کیوں میں کیا تیری بیوی ہوں۔“ مکرّم کے محبوبانہ سے شکوے پر اس نے کہا تھا۔ جہاں سب تھے مکرّم نے بڑی عقیدت سے کہا تھا۔

”تو تو اپنا جگر ہے۔“

”شاباش اے بھئی۔“ (شاباش ہے بھئی) سہیل نے اپنے مخصوص انداز میں داد دی۔ سکندر کے ہاں

بہ فضل باتیں سننے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ کسی گرما گرم موضوع سے دل بہلانا چاہ رہا تھا۔ بارہ دن بابا احب بورجیوں نے اسے خاصا بور کر دیا تھا۔

”یار! پیچھے بند کر اور یہ بتاؤ کہ کس کس حسینہ نے تمہارے یار کی یاد میں درد بھرے نغمے گائے؟“

”یوں شاعر ہوئی کس نے بھوک ہڑتال کی۔۔۔۔۔“

”کون شاعر ہوئی کس نے بھوک ہڑتال کی ہیں۔“ عبید جل کر بولا تھا۔ ”مجھے تو لڑکیوں کی سمجھ ہی کسی نے کچھ نہیں کیا۔ سب کی سب ہٹی گئی ہیں۔“

”بل آئی۔ مثل سے کتنی بھولی بھالی لگتی ہیں اور فطرتیں۔ توبہ توبہ۔ استغفار۔۔۔۔۔ جہاں کوئی پہلے سے زور کا نظر آیا ہیں اس کے پیچھے چل پڑتی ہیں۔“

”جہیں تو شاید تازہ دھڑلی ہے۔“ جوتوں سمیت بیڈ پر گرتے ہوئے سکندر نے تائید طلب نظروں سے عبید سمیت سب کو دیکھا تھا اور سب کی ہنسی اس پر بہت کچھ عیاں کر گئی تھی۔

”توبہ کیا ہوا؟“ ”توبہ پر انکشاف میگزین اٹھاتے ہوئے اس نے پھر سے عبید کو دیکھا تھا۔

”عبید کو چھوڑو اس کی تو ہوتی رہتی ہے۔“ ”شہاب کے معنی خیز انداز پر وہ بھی ہنسا تھا۔

”رودادہ کیسی ہے؟“ اس نے شہاب ہی سے پوچھا تھا۔

”رودادہ کو دھن کر دھیرے پاس تمہارے لیے ایک اور اچھی خبر ہے۔“ اس نے سنسنی پھیلائی جا ہی

لڑکھڑکی توبہ میگزین کی طرف زیادہ تھی جس میں صنف نازک کی مختصر ترین لباس سے مزین تصاویر اس کے ذہن کو دل کا خاصی تراوت بخش رہی تھیں۔ پھر وہ ماس کیونٹیکشن کی رودادہ علوی کے بارے میں سننا چاہ

ہا تھا جس سے ملاقات ہونے کے محض دو روز بعد وہ گاؤں چلا گیا تھا اور یہی اصل میں افسردہ کرنے کی بات تھی۔

”پروفیسر ہاشمی انتقال فرما گئے کیا؟“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔ وہ اسے سخت ناپسند تھے۔

”اس سے بھی اچھی اور دلچسپ خبر ہے سنو کے تودنگ رہ جاؤ گے۔“

”توبہ تا بھی دو۔“ وہ چڑسا گیا۔

”خفا کیوں ہوتے ہو؟ تا تو رہا ہوں۔ اس اچھی خبر کا نام ہے روشانی۔“

”روشانی۔“ وہ زریب بڑبڑایا۔ ”یار! کچھ عجیب نام نہیں ہے روشانی جیسے روشانی یا پھر سوا چار اٹنے۔“ شہاب کے جوش کو خاطر میں لائے بغیر اس نے کہا تھا۔

”آئے چار ہوں یا چھ۔“ مکرّم بازوؤں کا تکیہ بنا کر چٹ لیٹ گیا تھا۔ ”ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ مکرّم نے آئے ہی آدھی یونیورسٹی کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور تمہارے دوستوں کا شمار اسی آدھی یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔“ مکرّم کے انداز کا مسرور کن عنصر بھی اسے متاثر نہ کر سکا تھا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ اس کے دوست ہائیڈرو کی کی تعریف کم و بیش اسی انداز میں کرتے ہیں۔

”یہ محترمہ کہاں سے ٹپک پڑیں؟“
 ”ننگی نہیں ہیں بلکہ مائیکرہٹ ہو کر آئی ہیں پنجاب یونیورسٹی سے۔“ سہیل نے اس کی مطمانہ اضافہ کیا۔

شہاب کے یاد دلانے پر سب کا مشترکہ بے ساختہ قبضہ بلند ہوا تھا اور اس میں عبید کی اپنی جھنجھی ہوئی لاشیماں تھی۔
 دراصل عبید کو قاضی ایڑی لڑکی سے زبردست قسم کا عشق ہوا تھا اور اظہار کے نتیجے میں پہلے پہل لڑکی نے خود اس کی عزت افزائی کی تھی اور پھر اس کو خاصی پر تشدد کارروائی سے گزرنا پڑا تھا جسے انجام دینے لاشیماں کے بھائی تھے۔
 اگلے آدھے گھنٹے تک اس کمرے میں عبید الطاف کی خوب سی ”ریڑھ“ لگائی گئی تھی۔

+

ایک بار پھر اسکا کراس نے ریٹ واچ دیکھی تھی اور پھر جیسے زچ ہو گیا تھا۔
 ”مغرب آئے گی وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی۔“ اس کے لہجہ و انداز میں اکتاہٹ کا عنصر بگڑا۔

میں ڈپارٹمنٹ آنے کے بعد سے وہ اپنے دوستوں کے بے حد اصرار پر پہلی دو کلاسز اینڈ کرچکا تھا۔
 یکرہ وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی تمام کلاسز باقاعدگی سے اینڈ کرتی تھی۔ جسے دیکھنے کا فطری سا حس تو خود اس کے اندر بھی جاگا تھا۔ تبھی تو اس نے یہ دو کلاسز اینڈ کی تھیں حالانکہ وہ کبھی بھی ایسی باقاعدگی نہیں دکھاتا تھا۔

اُنی کڑی مشقت کے بعد اس نے بڑے آرام سے سب کو کینٹین جانے کا عندیہ دیا تھا۔
 ”کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔“ سہیل نے کہا جاہا۔

”ٹھیک ہے تم بیٹھ کر انتظار کرو میں جا رہا ہوں۔“ وہ خاصی بے مروتی سے کہہ کر باہر آ گیا اور سکندر مٹن حیات کے نقش قدم کی پیروی اس کے دوستوں پر تقریباً فرض تھی۔

لوراب وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کینٹین میں اس کے منتظر تھے۔ سکندر کو اپنی کج فہمی پر بھی غصہ آ رہا تھا۔
 لڑکی نے کون سا کہیں غائب ہو جانا تھا۔ جب اسی ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتی تھی، پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس کی فطرت تھی تو آج یا کل نظر آ جاتی بھلا اس کے لیے پورا دن ضائع کر کے اپنی بہت اپورٹنٹ قسم کی ڈیٹس کینسل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

”کتنے چہرہ میں زخموں میں تو ایسا پہلی بار ہی ہوا ہے کہ وہ یونیورسٹی نہیں آئی یا بے چاری کسی مشکل میں پھنس چکی ہو۔“

شہاب کی فکر مندگی اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ لوگ کینٹین میں اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ مائل دروازے سے قریب ہونے کی بنا پر آنے جانے والوں پر نگاہ بھی رہتی تھی اور بیک وقت

شاہل اے بھی کیا خوب صورت لڑکی ہے۔“
 ان کی آنکھیں یہ ہم سے کہتی ہیں
 ہم یہ تصنیف اک کتاب کرو

احمر کی آواز پر وہ قدرے چونک گیا تھا مگر اظہار نہیں کیا تھا۔ احمر ان سب میں نسبتاً پڑھا کر اور قمر کے معاملے میں مستند رائے کا مالک تھا۔ اس کا تعریف و تنقید کا اپنا مخصوص شاعرانہ انداز تھا۔
 ”ہو سکتا ہے روشنائی قمر کی خوب صورتی شہزادہ سیف کی بدر جمال سے زیادہ ہو لیکن۔“ قمر کہا۔

”لیکن مجھے تو اس کی آواز نے زیادہ متاثر کیا ہے۔۔۔۔۔۔ واہ کیا آواز ہے۔ قسم سے دل چاہتا ہوں
 رہے اور ہم سنتے رہیں، سنتے رہیں، سنتے ہی رہیں۔“
 ”اور اس کے سیل ختم نہ ہوں۔ یار بیڑی سے چلتی ہے کیا؟“

کروٹ بدلتے ہوئے خاصے مصنوعی تجسس اور سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔ عبید نے اگلے چار اسے خفگی سے گھورنے میں صرف کیے تھے جو کروٹ کے بل سر کے نیچے پھیلی نگاہ سنجیدہ چہرے اور نرہ بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ تو جب اس سے گفتگو کرو گے تائب بتانا۔“ بڑے صبر کے بعد اس نے جل بھن کر کہا تھا۔
 ”ویسے دعائی کرو کہ محترمہ تمہیں شرف گفتگو بخش دیں۔ اللہ کے کرم سے خاصی تک چمکی ہیں۔“

”ہیں۔۔۔۔۔۔ ہیں۔“ اب کی بار وہ حقیقی دلچسپی سے اٹھ بیٹھا تھا۔
 ”جی ہاں! محترمہ کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کو بھی پڑھ جاتی ہیں۔“
 ”زبردست اب تو ملنا ہی پڑے گا۔ خاصی دلچسپ خصوصیات کی مالک لگتی ہیں تمہاری۔“
 نام بتایا؟“ اس کے انداز سے ابھی بھی مسخرہ پن جھلک رہا تھا۔

”روشنائی۔“ شہاب بولا تھا۔
 ”عبید کو تو تم رہنے ہی دو۔ اس کا تو یوں بھی بے عزتی سسر چل رہا ہے۔ یا نہیں جناب عزت
 عبید الطاف صاحب نے پچھلے مہینے ہی فائل کی باجی سے پھینک دیا ہے۔“

بیرونی معاملات بھی حدنگاہ میں رہے تھے۔
 ”اگر کسی مشکل میں پھنس بھی گئی تو کیا فرق پڑتا ہے آخر تم جیسے بھائی کس دن کام آئیں گے؟“
 سہیل نے جملہ مکمل کر کے داد طلب نظروں سے سب کو دیکھا تھا جبکہ شہاب کی تو کوئی غیرت نہ
 لگی تھی۔

”بہن ہو گی تیری۔“ وہ باقاعدہ لڑنے کو تیار تھا۔ باقی سب نے اپنی اپنی مسکراہٹ ایسے
 جذبات کے اظہار پر مشکل سے چھپاتے ہوئے اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ چند جملوں نے اس کے حوالہ کی
 قدر سے کم کر دیا تھا پھر سہیل نے بھی اپنی ”نہایت نامعقول“ بات کو واپس لے لیا تھا۔
 ”ویسے یار! اتنی اچھی لڑکی کو بہن بنانے میں آخر برائی ہی کیا ہے؟“ عبید کی رگ عرفان میں
 پھڑکی تھی۔ شہاب نے شعلہ بارنگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ اچھائی تم کیوں نہیں انجام دے لیتے؟“
 ”تو بے استغفار خدا یا اچھائی دشمنوں کو ہی نصیب کرے بھی میں تو اسے گناہ سمجھتا ہوں۔“
 ”آخر ایسی کیا خاص بات ہے اس روشنائے قمر میں جو تم لوگ لڑے مرے جا رہے ہو۔“
 سکندر کی جھنجھلاہٹ اس وقت تک اونچے اونچے لگی تھی۔ احمر، عبید، شہاب اور سہیل نے اسے
 دیکھا۔

”ایک بار اسے دیکھ لو سکندر! جنہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“ احمر نے اس سادہ سا
 پہلی بار حصہ لیا تھا۔

”اچھا یار! دیکھ لیں گے تمہاری اس توپ کو بھی۔ فی الحال تو مجھے وہ سامنے آنے والی بندر
 رہی ہے۔“ اس کی نگاہیں داخلی دروازے سے باہر تھیں۔ ان سب نے اس کی نگاہوں کی تھید میں
 وسطی راستے سے گزر کر زر قاسی جانب آ رہی تھی۔

”اچھا بھئی میں تو چلا اب شام کو ملاقات ہوگی۔“ دونوں ہتھیلیوں سے میر پر دباؤ ڈال کر اپنے
 اس نے کہا۔

”خدا جنہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ تمام تر لوازمات سے لیس ہو کر آئی ہیں زر قاسی باہر
 لگے ہوئے ہیں۔ جا میرے بچے تجھے خدا کی حفاظت میں سوچنا۔“ عبید کا انداز خاصا دارانہ اور
 مندی کا غماز تھا۔ اس کے یوں ہاتھ اٹھا کر دعا دینے پر سب مسکرائے ضرور تھے۔

”یار واقعی حسن کو چار چاند لگے ہوئے ہیں۔ ریڈ سوٹ میں تو کجنت بالکل پٹا نہ لگ رہی ہے۔“
 نے رائے دینا ضروری سمجھا۔ اب ان کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

”یار مجھے تو اس لڑکی کی ایک ہی بات پسند ہے۔ ایسے ہی خواہ مخواہ دوپٹے کی پروا میں نہ

بھی دیکھو سنے آرام سے ایک طرف ڈال رکھا ہے اور یار..... اس کی کاربوں کتنی خوب صورت لگ رہی
 ہے۔ یہ شہاب کا کہنا تھا۔

”شاہشائے بھی، کیا تیز نظر ہے۔“
 ”شرم کرو بہن ہے وہ تمہاری۔“ سکندر نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی زحمت نہ کی تھی البتہ اسے چھیڑا
 ضرور تھا اور یہ بات شہاب کو ناگوار بھی نہ گزری تھی۔

”تم اسے میری بہن کی بجائے بھائی بھی بنا سکتے ہو۔“ شرارتی سے انداز میں اس نے حساب چکاتا
 کیا۔

”ہائی فٹ۔“ اس نے نہایت نخوت سے کہا تھا۔
 ”یہ اس قسم کی لڑکیاں نہ کسی کی بہن ہوتی ہیں اور نہ بھابھیاں بلکہ یہ تو ہر ایک کی بہنیں ہوتی ہیں اور ہر
 ایک کی بھابھیاں۔“

وہ کہہ رہا ہر کل گیا تھا۔ جہاں زر قاسی نے اس کا اور اس نے زر قاسی کا بے حد خوش دلی سے استقبال کیا
 تھا۔

+

”روشنائے قمر“ اس کی توقعات سے بڑھ کر حسین تھی۔ بلکہ اس کے لیے حسین کا لفظ استعمال کرنا
 راہزما دیتی تھی۔ وہ حسین کی اصطلاح سے بڑھ کر تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اس نے اب تک حسن دیکھا نہیں تھا۔ وہ حسین گرل فرینڈ زمیئر اسٹائل کی طرح تبدیل
 کرنے کا عادی تھا۔ مگر روشنائے قمر کو مارکیٹ میں دیکھ کر وہ واقعی کچھ دیر کے لیے بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا
 تھا اس کے دوستوں کا روشنائے قمر کے لیے رطب اللسان ہونا کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔

مارکیٹ میں احمر نے ہی اس کی توجہ روشنائے قمر کی جانب دلوائی تھی۔
 ”تھانک۔“ روشنائے قمر کے لیے اسے یہی لفظ مل سکا تھا اور احمر نے اسے یوں دیکھا تھا گویا کہہ رہا
 ”تو دیکھنا ہم نہ کہتے تھے۔“

دورات اس نے بڑی مشکل سے گزاری تھی۔ روشنائے قمر کو اس نے کافی فاصلے سے دیکھا تھا اور اب
 قریب سے دیکھنے کی خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی۔ زر قاسی، ہمیدہ، عندلیب یا اسی قسم کے ناموں والی گرل
 فرینڈز قہقہہ پارینین گئی تھیں۔ وہ جلد از جلد روشنائے قمر سے متعارف ہونا چاہتا تھا۔

اپنی ڈریسنگ اور پرسنلٹی کے معاملے میں وہ ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔
 اس کی ڈریسنگ ہمیشہ لاجواب ہوتی تھی۔ اگلے روز ڈیپارٹمنٹ جاتے ہوئے اس نے تیاری میں

قدرے زیادہ وقت صرف کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے دوست ہمیشہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔
نے آئینے کی رائے کو مستند جانا۔

اس کی کامیابی میں وجاہت کے ساتھ ہی جاکیر دارانہ بیک گراؤنڈ بھی ہمیشہ معاون ثابت ہوا۔
پرفیوم کا ڈھیر سارا چھڑکاؤ کرنے کے بعد اس نے آج ڈپارٹمنٹ جانے کے لیے لینڈ کروڈز کی بجائے
ماڈل کی سیاہ کار کا انتخاب کیا تھا۔ سیاہ رنگ ایک دم سے کسی کی بھی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا
صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر نئی کار کے ٹولہ کارے بھی قابل دید تھے۔

اب وہ مکمل طور پر تیار تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اٹھنا
کیا تھا۔

پہلی کلاس پروفیسر عبداللہ انصاری کی تھی۔ کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اسے پہلی ہی روم
عرشہ اور مریم کے ساتھ ٹھنی نظر آگئی تھی۔ وہ کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ کسی بھی مصنوعی پرت سے باز
بے حد خوب صورت سے کٹاؤ دار ہونٹ، مکرم نے اسے اگر ٹھوکا نہ دیا ہوتا تو یقیناً وہ وہیں کھڑا اکیلا
دیکھتا رہتا۔

ان لوگوں نے جن کر ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں سے روشانی کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا
پروفیسر انصاری کے کلاس میں آ جانے تک وہ سب لوگ سرگوشیوں میں اس کے متعلق بات کرتے رہ
تھے۔ سوائے سکندر کے۔ اپنی انگلیوں کے درمیان بال پوائنٹ گھماتے ہوئے وہ بس اسے دیکھ رہا تھا۔
کب پروفیسر انصاری نے لیکچر کا آغاز کیا تھا، کب کس نے سب سے پہلے گفتگو میں شمولیت
کی، بات کہاں سے چلی اور کہاں تک پہنچی۔ وہ ان تمام باتوں سے بے خبر جس اسے دیکھے جا رہا تھا کوشش
کے وہ اپنی نگاہ دوھیان اس پر سے ہٹا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

دل میں پیدا ہونے والے لگداز میں کھلبلی جب بھی تھی جب اس نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔
”اصل میں مسئلہ شروع ہی تفریق سے ہوتا ہے۔ جب دو ایک جیسے انسانوں میں تفریق کر کے ایک
بڑا اور دوسرے کو چھوٹا کہا جائے گا۔ ایک کی مراعات چھین کر دوسرے کے حوالے کی جائیں گی۔ زمین
مکینوں کو چاند کی سواری کروائی جائے گی تو مسئلہ تو پیدا ہوں گے ہی۔“ عید نے صبح کہا تھا۔ دو باقی ہمارے
سماعت تھی اتنی خوب صورت آواز، ایسا نرم سالب ولجہ کم سے کم اس نے اب تک نہیں سنا تھا۔ مگر یہ کہا
غلط کہ وہ دید سے زیادہ قابل سماعت تھی۔

”مسائل تب تک حل نہیں ہو سکتے! جب تک ہمارا حاکم طبقہ خود کو عوام کی سطح تک نہ لے آئے
وزیر یا عظم یا صدر تب تک عوام کے مسائل درست طور پر حل نہیں کر سکتے جب تک وہ خود کو عام نہ سمجھ
لیں۔“

”آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ بھکاریوں کے مسائل سمجھنے کے لیے ہمیں خود کو بھکاری سمجھ لینا چاہیے۔“
سکندر نے ایک دم سے اس کی بات میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ اہم مقصد صرف اسے اپنی طرف متوجہ کرنا
تھا اور اس مقصد میں اسے کامیاب بھی ہوئی تھی۔ روشانی نے قمر نے گردن کو خفیف سا موڑ کر اسے دیکھا تھا اور
پھر اہم نکتے میں بولے تھی۔

”کچھ دیر کے لیے ایسا سمجھ لینے میں برائی نہیں ہے۔“
”لیکن اس کے لیے تو اپنی مال و متاع سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی عقل مند
”

”لیکن اس کے لیے تو اپنی مال و متاع سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی عقل مند
”

”سورہ! لیکن میں آپ کی بات ابھی بھی نہیں سمجھا۔“ سکندر نے پھر کہا۔ وہ اس کے انداز کا طنز یا گویا
”

”اس ٹاٹ مانی بیڑک۔“ وہ گردن گھما کر اب پوری طرح سے سر انصاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی
”

”اس ٹاٹ مانی بیڑک۔“ وہ گردن گھما کر اب پوری طرح سے سر انصاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی
”

”اس ٹاٹ مانی بیڑک۔“ وہ گردن گھما کر اب پوری طرح سے سر انصاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی
”

”اس ٹاٹ مانی بیڑک۔“ وہ گردن گھما کر اب پوری طرح سے سر انصاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی
”

”اس ٹاٹ مانی بیڑک۔“ وہ گردن گھما کر اب پوری طرح سے سر انصاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی
”

ایک ہفتے کے لکچرز کے نوٹس دے سکتی ہیں۔“

اگرچہ طریقہ خاصا گھسا پٹا تھا مگر وہ بخوبی واقف تھا کہ اکثر لڑکیوں سے تعلقات کا آغاز یہاں سے ہے۔

”آئی ایم سوری، میں اپنے نوٹس کسی کو نہیں دیتی۔“

سکندر بد مزاج نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ (کسی قدر استہزاء پر مبنی تھی۔

”کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ اس نے پھر کہا۔

”ضرور پوچھ سکتے ہیں۔“ اس نے روشنانے کو بیک ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرنے دیکھا تھا۔

”لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کو وجہ بتاؤں بھی۔“ وہ باہر نکل گئی تھی۔

”خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔“ اس کے پیچھے آتے ہوئے وہ منہ میں بدلاؤ لایا۔
”آپ شاید خفا ہو گئی ہیں؟“ اس نے خیال کا اظہار کیا جس پر روشنانے نے خاصی حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

”میں آپ سے کیوں خفا ہوں گی؟“

”میں نے آپ کی بات سے اختلاف کیا تھا..... شاید اس لیے.....“

جواباً روشنانے ہو لے سے ہنسی تھی۔ سکندر بے اختیار ہی اسے دیکھے گیا تھا۔

”میں ہر ایک سے خفا نہیں ہوتی جہاں تک اختلاف کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ میں عمل بھی ظاہر کروں۔ اپنی رائے کا اظہار ہر ایک کا حق ہے۔ ٹھیک اس طرح اختلاف کرنا بھی آپ کا ہے۔“ وہ رمان سے بولی تھی۔

”آپ کن لوگوں سے خفا ہوتی ہیں؟“ وہ دونوں کلاس روم کے باہر کھڑے تھے اور سکندر نے لہجہ تک اسے دیکھتے ہوئے دیگر باتوں کو نظر انداز کر کے پوچھا تھا۔

روشنانے قمر کی نگاہوں میں اب الجھن آئی تھی۔

”آپ یہ جان کر کیا کریں گے؟“ اس کے چہرے پر کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

”یونہی..... میری معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔“ اس کی خود ساختہ متانت سے وہ خاصا غصہ لایا تھا۔

”آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا میری ذمہ داری نہیں ہے۔“ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔
سکندر بھی ساتھ تھا۔

”واقعی یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔“ اب کی بار وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا اور یہ سنجیدگی سراسر معنی کی تھی۔

”لیکن جرات آپ نے ابھی کلاس روم میں کہی تھی۔ بلیوی میں واقعی سمجھ نہیں سکا۔“

”مگر آپ نے میری بات سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو یقیناً آپ کو سمجھ آ جاتی۔“ وہ طنز یہ بولی تھی۔

”میں اب کوشش کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”کیا آپ میری مدد کریں گی۔“

”جی نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ ڈھٹ ابن ڈھٹ بنا پوچھ رہا تھا۔ روشنانے قمر کے قدموں نے وقفہ کیا تھا۔

”مگر آپ کو کچھ سمجھنا ہے تو پروفیسر عبداللہ انصاری کی کلاس میں چلے جائیے۔ وہ بہت بہتر طریقے سے وضاحت کر دیں گے کیونکہ یہ ان کا فرض بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔“

”لفظوں کو بے حد چاچا کر ادا کرنے کے بعد وہ چلی گئی تھی۔ اب کی بار سکندر نے اس کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی کمر پر جھوٹی موٹی سی ریشمی چٹیا کو دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار ہی اس ریشم کو چھو کر لمس کرنے کی تمنا تھیلیوں میں سر اٹھانے لگی تھی۔ اس نے اضطراری انداز میں مٹھیاں بھیج کر کھولیں اور اپنا تو بکھی ہوا ہی نہیں کراس کے ہاتھ کوئی تمنا کریں اور وہ تمنا کو رد کر دے۔

”لڑکی حسین بھی ہے اور عقلمند اور غصیل بھی..... بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا سکندر سمین جات۔“ روشنانے سے ہونے والی گفتگو کو ذہن میں دوہراتے ہوئے اس نے خود کو باور کروایا۔ کارڈ رور سے زبردہ کینٹین کی طرف جا رہا تھا۔ مگر سامنے سے آتی زرقا کو دیکھ کر اس نے راستہ تبدیل کر لیا تھا اور لپارٹ کی پچھلی جانب سے ہوتا ہوا پارکنگ میں اپنی کار تک آ گیا تھا۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل سے احمر کے موبائل پر کال ٹیکٹ کیا تھا۔

”زرقا میرے بارے میں پوچھتے تو کہنا چندرہ دنوں کے لیے گاؤں گیا ہوں۔“

وہ اپنا سکر اسٹائل تبدیل کرنے کے موڈ میں تھا۔

+

چاندرا میرے آگن میں نہ تارہ چکا

تیری صورت نظر آئی نہ تیرا خط آیا

میں جو تیرے تن کی خوشبو

کوئی غم نہ جسم کی حکایت لایا

بستر لب درد کشاں

یوں تو کافی ہیں تیرے شہر میں کتنی راتیں
شوق لیک.....“

”کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔
سکندر نے کرسی محبت کراس کی کرسی کے قریب کی پھر نشست سنبھال لی۔ لائبریری میں اس وقت
اکاڑا ہلک سی تھی۔ چہلے ادھر ادھر دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جھک کر اس کی اسائنمنٹ دیکھنی شروع
کر دی تھی۔
اگلے گھنٹوں کی توقع کے برعکس نہیں تھا۔ روشا نے اپنی کتابیں سمیٹ کر پیچھے پڑا ایک کندھے پر
ڈھلا تھا اور باہر نکل گئی تھی ظاہر ہے کہ سکندر نے اس کی تقلید کرنی ہی تھی۔ اسے روشا نے کا یہ مغرور انداز مزہ
دے دیا تھا۔
”آپ باہر کیوں آ گئی ہیں مس روشا نے!“ قدم سے قدم ملاتے ہوئے اس نے دریافت کیا، خاصی
صمیمیت سے۔

”کیوں؟ کیا میں باہر نہیں آ سکتی۔“ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی ناگواری تھی۔

”آپ مجھ سے بچنے کی خاطر لائبریری سے اٹھ آئی ہیں نا؟“

”خاصے سمجھا رہی ہیں آپ۔“

”شکرا اللہ، اچھا کیا آپ نے۔ یوں بھی انسان لائبریری کے گھٹن زدہ ماحول میں کھل کر بات نہیں
کر سکتا۔“ روشا نے یقیناً اپنی رائے دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔

”ویسے آپ کو ایک بات بتاؤں اس یونیورسٹی میں رہتے ہوئے آپ سکندر زمین حیات سے نہیں بچ
سکتیں۔“

”کیوں؟ کیا یونیورسٹی آپ کے باپ کی ہے؟“ وہ جھج کر بولی تھی۔

”نہیں میرے بچوں کے باپ کی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ روشا نے ایک دم رک کر اس کی طرف
نظر ڈالی۔

”آپ کے بارے میں میرا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا ہے مسٹر سکندر زمین حیات۔ آپ انتہائی
ذہین اور بدتمیز ہونے کے ساتھ ہی ایک ایسی مصیبت بھی ہیں جو بلاوجہ گلے پڑ جاتی ہے۔“ تنفر سے کہہ کر
”اگرچہ میں جس بے گناہ کے بیڑہ میں تھی اس کی تملابٹ نے سکندر کو خاصا لطف دیا تھا۔

”مصیبت گلے پڑنے کا محض محاورہ ہی سنا ہے آپ نے، کبھی ایسی مصیبت دیکھی ہوتی تو یقیناً مجھے یہ
تہہ دے کر نہ جانتیں۔“ اس کا انداز خاصا استہزاء سیہ تھا۔

”اچھا نیٹے لوگ کہتے ہیں میں بہت اچھا انسان ہوں۔“

”کیا کہنے والے بھی یقیناً آپ جیسے ہی ہوں گے۔“

”کئی نہیں..... کچھ آپ جیسے ہی ہوتے ہیں..... بے حد نرم گو، مترنم اور..... اور خوب صورت۔“

وہ احمر کو بہت دھیان سے سن رہا تھا، جب اس نے روشا نے کولاہیری کی طرف جانے لگے
پچھلے کئی دنوں کی طرح آج بھی وہ لڑکی اس کی تمام تر توجہ کھینچنے لگی تھی۔ اپیل کر کے سادہ سے سہم
وہ خاصی منفرد دی دکھائی دی تھی۔ سکندر نے ایک بار پھر خود کو بے بس محسوس کیا۔
ان پانچ چھ دنوں میں اس نے ہر وہ ممکن کوشش کر ڈالی تھی جو روشا نے کو توجہ کر سکتی اور وہ ہاتھ
متوجہ تو وہ ہو ہی چکی ہے۔ سکندر زمین حیات کے سحر سے بچ نکلنا اب ایسا آسان نہ تھا۔ مگر یہ لڑکی الہ
ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

صرف اس لڑکی کی وجہ سے وہ ان پانچ دنوں میں اپنے سابقہ ریکارڈ توڑتے ہوئے باقاعدگی
ساری کلاسز اسٹینڈ کرتا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریں سارا وقت اس کو اپنے حصار میں لیے رہتی تھیں
اسے مسکراتا دیکھ کر دل اس کا طواف کرنے لگتا۔ جب وہ بولتی تو سماعت اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر
دیکھنے جاتی۔ لمبے گھنے بال تھیلیوں میں اضطراب بھر دیتے اور وہ مزید شدت سے اس لڑکی کے چمکنے لگے
ہو جاتا۔

وہ روشا نے کے بارے میں ایک اندازہ لگا پایا تھا۔ وہ بے حد پڑھا کر اور ذہین تھی۔ اس کی اساتذہ
کی پروفیسرز تعریف کرتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کے دوران بہت زیادہ نہ کسی مگر کسی حد تک اس
رائے اس کے پوائنٹ آف ویو کو اہمیت ضروری جاتی تھی۔ سکندر زمین حیات کو ایسی لڑکیوں سے بچ
کرتی تھی۔ مگر روشا نے قمر سے اسے چڑ نہیں تھی۔ فی الحال وہ بھی نہیں سکتی تھی۔ محض اس کی وجہ سے وہ
دیگر گرل فرینڈز کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

اس نے روشا نے کولاہیری میں جا تا دیکھا تھا وہ تنہا تھی۔ حسب معمول فہمیدہ، مریم میں سے کوئی
اس کے ساتھ نہ تھی۔ اس سے پیشتر وہ ہمیشہ دو تین لڑکیوں کی ہمراہی میں نظر آتی تھی۔ وہ لائبریری کی لڑ
آ گیا۔ دروازے میں رک کر سارے میں نگاہ ڈالی کو نے والی قطار کے اختتام پر وہ کسی کتاب میں مہر
بیٹھی تھی۔

”میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“

اس نے قریب جا کر دریافت کیا۔ اسے یہاں بھی الگ تھلک دیکھ کر خاصی مسرت ہوئی تھی۔
”ایکسیکو زی مس! کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“ اب کی بار قدرے بلند آواز میں پوچھتے ہوئے وہ
نے لائبریری رولڈرائیڈ ریگولیشنز کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

روشا نے نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور بے حد بے تاثر سے انداز

اس کی گہری نگاہ روشنانے کی غصہ بھری نگاہوں سے نگرانی تھی۔
”دوستی کریں گی مجھ سے۔“
”نہیں۔“

”کیوں؟“ انداز بے حد دوستانہ تھا۔
”میری مرضی۔“ وہ لفظوں پر زور دے کر بولی۔

”او کے ایز یوش۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”لیکن غصہ کرنے کا بے حد شکر یہ مس روشنانے! آپ ہیں جب کوئی کسی پر غصہ کرتا ہے تو دراصل شائستگی کی طرف پہلا قدم بڑھاتا ہے۔ یقیناً اس کا مزہ آئے گا۔“ بڑی گہری مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر وہ رک نہیں تھا۔ بلکہ ڈپارٹمنٹ کے لان بیٹھے دوستوں کی طرف آ گیا تھا۔ جو یقیناً شدت سے اس کے منتظر تھے کیونکہ وہ ان دونوں کے بائیں والی گفتگو کی بابت جاننا چاہتے تھے۔ وہ اب دونوں کو لاہوری سے نکل کر ساتھ ساتھ جاتا دیکھ کر بے ”کیا خاص بات ہوتی ہے یارو! کچھ بھی تو نہیں..... بس لڑکی ذرا میز می ہے اور سکندر بین چار ٹیرے راستوں پر چلنے میں مزہ آتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب ہی تک گیا تھا۔
”یارو ذرا پتا تو کرو۔ محترمہ کہاں سے آئی ہیں۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور کس بات اکڑتی ہیں۔“ اس نے پرسوج انداز میں شہاب سے کہا۔ وہ ملتان ہی کا رہائشی تھا اور لڑکیوں کے معاملے اس کی سی آئی ڈی ہمیشہ ہی سے خاصی تیز رہی تھی۔
”جو حکم میرے آقا! مگر پہلے کچھ کھا پاؤ ذیاب نہ ہو جائے۔“ وہ سمجھ گیا اشارہ کس جانب ہے سکندر حیات جیسا لینڈ لارڈ دوست ہو تو کس کافر کا دل کینٹین بار بار، بے شمار بار جانے کو نہیں چاہے گا۔

+

روشن تیری آنکھوں میں

وفا کے جو دیے ہیں

سب تیرے لیے ہیں

سب میرے لیے ہیں

روشن تیری آنکھوں.....

اس نے بڑی مستی بھرے انداز میں تان لگا کر ان سب کی جانب دیکھا تھا جو وسط میاں کے ہوئے پڑا کے ڈوبوں اور پتیلی کے ٹن سے بے نیاز اسے دیکھ رہے تھے۔
وہ بہت اہم قسم کی معلومات ان کے گوش گزرا کر چکنے کے بعد اب داد کا متقاضی تھا۔

”شہاب تم نے صبح طرح سے تو معلوم کیا ہے نا۔“ سکندر نے پوچھا تھا۔
”شہاب تم نے کبھی کسی لڑکی کے بارے میں غلط معلومات دی ہیں تمہیں۔“ وہ گویا براہی مان
”ہاں۔“

”میری معلومات اس دفعہ بھی ایک سو ایک فیصد درست ہیں بہت ہی بارسوخ ذرائع سے پتا کیا ہے

تمہارے۔“
”وہ لوگ سکندر کے اپارٹمنٹ میں جمع ہوئے تھے۔ بابا صاحب نے یہ اپارٹمنٹ، یونیورسٹی میں ایڈمشن کے وقت اس کی رہائشی ضروریات کے پیش نظر لے کر دیا تھا مگر اس نے ہاسٹل میں قیام کو ترجیح دی تھی۔ مگر اکثر بدختر وہاں آتا رہتا تھا۔

ان میں سے کوئی بھی شہاب کی فراہم کردہ معلومات پر یقین نہیں کر پاتا تھا۔ بلکہ ”روشنانے قمر“ کو بڑھ کر کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اصل میں وہ جس علاقے سے تعلق رکھتی ہے وہ ناگوار ہونے کے باوجود ہمارے ”مہذب معاشرے“ کا حصہ ہے اور مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کبھی وہ ”بہاؤزار“ ہے تو کبھی ”ریڈ لائیٹ ایریا“ تو کبھی ”ہیرامنڈی۔“

”نام روشن بائی تعلق لاہور کی ہیرامنڈی سے، ماں اور نانی بہت اچھی رقا صائیں تھیں۔ بہن بالی وڈ کی فلموں میں ”رہا“ کے نام سے ایکسٹرا کارول کرتی ہے۔ جبکہ ایک بہن کسی سیاستدان کے عشق میں ناکام ہو کر خودکشی کر چکی ہے۔ محترمہ روشنانے قمر صاحبہ پہلے P.U میں زیر تعلیم تھیں پھر مائیگرٹ ہو کر یہاں لہڈائی میں آ گئیں کیونکہ بائی شہر میں ان کی نیک نامی کو برے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔“
شہاب کا معلوماتی پیرا گراف تھا۔

”یاد ہے خبر ہے تو حرسے دار۔“ کافی دیر بعد کرم نے کہا تھا اور اصرار نے اس کی نفی کی تھی۔
”کیا خاک حرسے دار ہے..... پچھاری روشنانے اتنی حسین صورت اور کتنی گندی جگہ سے تعلق۔ بس یہ قسمت بھی کیا کیسے تماشے لگاتی ہے۔ کیسے اچھے لوگوں کو کہاں لاپختی ہے۔“ اسے یونہی ہمدردی کے ابال۔
”اگر تھے۔“

”تب تم کیا کرو گے سکندر؟“

سکندر نے سر کی بجائے محض نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ حقیقتاً یہ خبر اس کے لیے بھی تحیر آمیز ہونے لگی تھی۔ یہ سوچ کر کہ روشنانے قمر کا تعلق اصل میں کس قدر معزز گھرانے سے ہے اس کی ”نڈن“ آجوں آپ احساس تھا قمر سے تن ہوئی تھی۔
”نہیں کیا ہے اب ہم سیدھے اس اکثر دھندلے کے پاس جائیں گے اور سارا کچا چھان ان کے سامنے

نڈن کے۔ پھر جب ان کا چہرہ ٹھیک ٹھیک کی طرح سرخ، زرد اور بنرنگ بدلے گا تو صورت حال کوئی

بھر کے انجوائے کریں گے۔“ عبید ابھی سے پر جوش ہو گیا تھا۔

”نہیں۔“ سکندر نے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی ایسا کچھ نہیں کرے گا۔“

عبید کے جوش کو سکندر کے دو ٹوک انداز نے جھاگ کی طرح بٹھا دیا تھا، ظاہر ہے جب تک دیا تھا تو گویا ان سب کو مذہبی احکام کی طرح اس کی پیروی کرنی تھی۔

”لیکن کیوں؟“ عبید کی بجائے سہیل نے پوچھا تھا۔ ”آخر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو سکندر؟“

”یہی تو بات ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہ رہا۔“

اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم سب اس کا بھانڈا بیچ چور ہے میں پھوڑنا چاہتے ہو لیکن فی الحال یہی کہ تم لوگ اس بات کو لیک آؤٹ کرنے کی بجائے ہضم کر جاؤ۔ ایسے بھانڈے بیچ چور ہے مگر گھروں کے اندر پھوڑے جاتے ہیں۔ موقع دیکھ کر وار کیا جاتا ہے۔“

ان سب کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے وہ گویا کسی ملک گیر مسئلے کی وضاحت کر رہا تھا۔ ”ہم لوگ روشانے کے Origin سے واقف ہیں اس بات کو لیک آؤٹ کرنے سے فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔“ اس نے ایک بار پھر کہا تھا۔

”اور ویسے بھی میرے خاندان کا ایک نام ہے۔ میرا باپ اس ملک کے معززین میں روشانے چاہے جتنی بھی خوب صورت ہو مگر ایک ایسی لڑکی کے ساتھ خلی خولی دوستی میں رہا کر سکتا جسے معاشرہ طوائف کہتا ہے۔ طوائف کو لائف میں لانا ہی حماقت ہے پھر چاہے اس کا روزہ ہو یا چار صدیوں کا۔“

اپنے گھٹنوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس نے بے حد نخوت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ اس کے لہجے میں ہی حماقت تھی۔

خود کو معززین میں شمار کرتے ہوئے اور خود کو باکداروں کی صف میں شامل کرنا وہ اپنا پتہ رہا تھا۔

بڑی سی کھڑکی میں رک کر سگریٹ سلگا کر اس نے مین روڈ پر بھاگتی ہوئی ٹریفک کو دیکھ کر قریبی لڑکی کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہر حال اسے افسوس تھا۔

+

یاد رکھو، یہی ملے کیا جاسکتا تھا۔
ڈپارٹمنٹ کی بیڑیوں میں تنہا بیٹھا شہاب وغیرہ کا خطر تھا جب اس نے کھٹکتی ہوئی ہنسی کی آواز سنی تھی۔ مگر دیکھا۔ ٹک درست تھا بھلا ایسی مترنم ہنسی تو سارے ڈپارٹمنٹ میں اور کسی کی نہیں تھی۔ کچھ فٹلے پافل ایئر کی چھ لڑکیوں کے ساتھ کھڑی وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ بہت شدت سے ہنسنے کی بنا پر

چہرے پر ہاتھ اور آنکھوں میں بھرنے والا پانی وہ یہاں سے بھی دیکھ رہا تھا۔
چہرے پر ہاتھ اور آنکھوں میں بھرنے والا پانی وہ یہاں سے بھی دیکھ رہا تھا۔
چہرے پر ہاتھ اور آنکھوں میں بھرنے والا پانی وہ یہاں سے بھی دیکھ رہا تھا۔

لی سکندر کو اس کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا اس کے ہونٹوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔ دل و دماغ میں سخت مہارہا رہی تھی۔

”ہم اگر میں تمہیں تمہارے اصل نام سے پکاروں تو تم ہنسنا بھول جاؤ گی۔ تمہارے چہرے پر ہنسنے لگیں گے، آنکھوں میں شرمندگی کا پانی اتر آئے گا اور یہی گردن، جسے تم نے ابھی بڑی شان سے مڑا ہے جھک جائے گی پھر کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔“ وہ سوچتا چلا گیا۔

”تمہارا طائف ہونا بہت بڑی بد قسمتی ہے روشانے بی بی اور اس بد قسمتی پر جتنا افسوس مجھے ہے شاید ہی نہیں ہو۔ یہی تو وہ کمزوری ہے جس نے تمہیں سکندر سمین حیات کے ساتھ سے محروم کیا ہے اور یہ تمہاری بیکار بد قسمتی ہے۔“

افسوس میں سر ہلاتے ہوئے اس نے پھر سے اسے دیکھا جواب کلاس روم کی طرف جاری تھی۔ انداز میں لپکتا گیا جانے والا شانہ بین تھا ہر اٹھتے قدم تلے گویا وہ دنیا روغ رہی تھی۔ گردن مغلیہ شہزادوں کے شانہ میں ملتی ہوئی تھی۔

سکندر نے منہ کا زاویہ ایگاڑ کر گردن موڑ لی۔
”فدا حسن بھی چھپر بھاڑ کر دیتا ہے اور وہ بھی ایسیوں کو۔“
”وہ بھی کلاس روم کی جانب چل دیا تھا اگرچہ پروفیسر ہاشمی کی کلاس شروع ہونے والی تھی مگر اپنے دوستوں کی فریادوں، گما میں تھا پور ہونے سے تو یہی بہتر تھا کہ سب کے ساتھ مل کر پور ہو لیا جائے۔“

+

اس کے لیے اپنی ہی سوچ میں مشکل بنتی چلی جا رہی تھی۔
”فدا حسن بھی چھپر بھاڑ کر دیتا ہے اور وہ بھی ایسیوں کو۔“
”وہ بھی کلاس روم کی جانب چل دیا تھا اگرچہ پروفیسر ہاشمی کی کلاس شروع ہونے والی تھی مگر اپنے دوستوں کی فریادوں، گما میں تھا پور ہونے سے تو یہی بہتر تھا کہ سب کے ساتھ مل کر پور ہو لیا جائے۔“

رودادہ علوی سے ہونے والی اس چوتھی ملاقات نے اس کے موڈ پر خاصا خوشگوار اثر نہ
رودادہ نے اس کی تلخ یاؤنر کی آفر کا مثبت جواب دیا تھا مگر دن مقرر نہیں ہو سکا تھا۔ جو کہ ان کا دوست

اپنے سامنے دو دبا کی بجائے روشنائی کو سکرانے دیکھا رہا تھا۔

عجیب مشکل سی مشکل تھی اور اس مشکل میں اس کا طوائف ہونا خود سکندر کو اپنی بد قسمتی محسوس تھی۔ وہ حسین تھی اور وہ حسن کا چچاری۔

وہ دو متضاد کیفیات میں گھر گیا تھا۔ ایک طرف اپنے عزت دار گھرانے کا وقار تھا تو دوسری طرف روشنائی کے نام سے جزا وہ رذیل حوالہ۔

وہ اپنے دل کے بے شکے مطالبے پر خود چڑ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے خدا نخواستہ روشنائی محبت و جنت ہو گئی تھی بلکہ اس نے تو کبھی کسی عورت کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس سے محبت کی حصول کبھی بھی اس کا مسئلہ نہیں رہا تھا اور اب بھی وہ اس "حصول" کو اپنا مسئلہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ روشنائی سے شخص دوستی کرنے کی ایک آخری سی کوشش ضرور کرے گا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا تبھی مطمئن تھا۔

یہ اس سے دو روز بعد کی بات ہے۔ وہ لاہریری بہت کم جایا کرتا تھا اور اس روز بھی بس یوں تھا۔ یونیورسٹی کی مین لاہریری میں بہت سی لڑکیاں دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

"تم مان لو سکندر بہمن حیات سوشیا لوجی ڈپارٹمنٹ کا سب سے زیادہ پینڈم شخص ہے۔" وہی تھا۔ کتابوں کی الماری کی دوسری جانب سے آنے والی آواز خاصی بلند تھی۔

"اچھا تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔" یہ اکتائی ہوئی آواز تو وہ بتا دیکھ بھی پہچان سکتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بے حد احتیاط سے نکال لی۔ اب دوسری طرف دیوار کے ساتھ رکھی گولانا دکھائی دے رہی تھیں۔

صنف نازک کے مابین موضوع گفتگو بننا بھلا کس کجخت کو برا لگتا ہے۔ فطری تجسس کے انھما ہو کر وہ سننے لگا تھا۔

"کیوں روشنائی! کیا تم اس بات کو نہیں مانتیں۔" فہمینہ کی آواز خیر آ میر تھی۔

"مانتی ہوں۔" سکندر کے لبوں پر خاصی لطف لیتی مسکان بکھری تھی۔

"لیکن میرے ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"سکندر کو تو پڑتا ہوگا۔ میں نے نوٹ کیا ہے کافی غور سے دیکھتا ہے جنہیں اور یقیناً اعتراض ہے۔"

میں۔

"مردوں کی عادت ہوتی ہے۔ ہر لڑکی کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ تو کیا وہ سب ان لڑکیوں میں سے ہوتے ہیں اور سکندر صاحب کی تو کچھ زیادہ ہی پختہ عادت ہے کبھی یہ بھی غور کرنا وہ ہر لڑکی کو غور سے دیکھتا ہے۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

سکندر کی سکرابٹ غائب ہوئی تھی۔ اپنی ہی سوچ میں وہ ان لوگوں کی اگلی باتیں سن نہیں سکا تھا۔ "سکندر بہمن چپے لوگ تو لڑکیوں کے آئیڈیل ہوا کرتے ہیں۔ اس کے پاس دولت ہے۔"

"جہاں۔"

"دولت اور جاہت کا اچا نہیں ڈالنا فہمینہ! اگر دار بھی ہونا چاہیے۔" روشنائی نے پھر اختلاف کیا۔

"کیوں کر دار کا اچا رڈالنا ہے؟"

"جوت۔" وہ ہنسی تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ لڑکیاں دولت و جاہت کو اہمیت دیتی ہیں۔ اگرچہ یہ چیزیں بھی اہم ہیں لیکن کر دار ان سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ جہاں تک سکندر بہمن کا تعلق ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا میں اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ ایسے لوگ لڑکیوں کو اپنی دولت سے متاثر کرتے ہیں، و جاہت سے متاثر کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ عورت کو ایک گھر نہیں دے سکتے جو کہ بہر حال ہوت کی اول ترجیحات میں شامل ہے۔" سکندر کا چہرہ خفت اور احساس حقیر سے سرخ ہو گیا تھا۔

"اور جو مرد عورت کو ایک گھر نہ دے سکے وہ تو مرد کہلانے کا بھی حقدار نہیں ہے۔"

اس کے جڑے مضبوطی سی سمجھ گئے تھے۔ کپٹی کے قریب رگیں ابھرا آئی تھیں۔ پیشانی پر لکیروں کا ہلے ہلے دریا ہاں تھا۔

مٹس کے شدید ترین احساس نے اس کے ہاتھوں میں سختی بھر دی تھی۔

لکڑیوں کے درمیانی فاصلے سے اس نے دوسری طرف دیکھا۔ روشنائی کسی بات پر اب ہنس رہی تھی۔

"وہ حریف وہاں نہیں رک سکا تھا۔ بلکہ لے لے ڈگ بھرتا لاہریری کے داخلی راستے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کے دماغ میں شرارے سے چھوٹ رہے تھے اور آنکھوں میں نفرت کے سرخ ڈورے بڑے واضح تھے۔"

+

"تم! آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

ایئر میس پر ابھرنے والی سترنم آواز میں دیا جانے والا عندیہ اسے فتح کے احساس میں مبتلا کر گیا تھا۔ ایک بہت ہی گولہ باز اور سا احساس اس کے گرد و حال ڈال رہا تھا۔

اس کی پانچ تو قہات کے عین مطابق بالکل صحیح جاری تھی۔

علاقہ کا وقت اور صحیح مقام ملے کر لینے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کا ٹکیرہ سر کے نیچے رکھ کر چھت

پرنگاہیں گاڑدی تھیں۔

وہ اگلا نکل عمل ترتیب دے رہا تھا۔

روشانی کی فون کال اس قدر جلدی موصول ہو جانے پر وہ حیران تو ہوا ہی تھا آج صبح اس سہل کر لینے کے بعد وہ دوبار ایک روز تک انتظار کی توقع کر رہا تھا۔

صبح اسے ڈپارٹمنٹ کے لان میں تہجد کیل کر وہ اس جانب آ گیا تھا۔

”ہیلو“ روشانی نے اسے سراٹھا کر دیکھا تھا اور پھر قدرے اکٹھا ہٹ سے سر جھکا لیا تھا۔ حیرت نہیں ہوئی تھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ جیسے بار بار اس کے راستے میں آ رہا تھا۔ روشانی کا کافی عرصہ لازمی امر تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی جناب بھائی صاحب! آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟“

اس کے انداز سے جھلپا ہٹ واضح تھی۔ سکندر مسکراتا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ کوئی بہن نہیں ہے میری۔ مجھے ہمیشہ بتانے کا شوق ہو گیا ہے اور آپ جیسی خاتون کو بہن بنانے کا شوق تو بالکل بھی نہیں ہے۔ سو برائے مہربانی آپ مجھے بھائی کہنا تکلف مت کیجئے۔“

”آپ مجھے بلانے کا تکلف مت کیجئے میں آپ کو بھائی نہیں کہوں گی بلکہ آپ کی مثل ہو گئی دیکھوں گی بھائی صاحب۔“ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس نے تمام تر زور ”بھائی صاحب“ ہا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کی تپتی ہوئی شکل دیکھتا رہا دلچسپی سے پھر خفیف سا ہنس دیا۔

”اب اگر میں یہ کہوں کہ لڑکیاں ہلڑکے کو جان بنانے سی پہلے بھائی جان بناتی ہیں تاکہ دوسرا صورت میں بھائی پر ہی گزرا کر سکیں تو تم برا مان جاؤ گی۔“

اس نے روشانی کو تھوڑا نظر سے اپنی جانب دیکھتے پایا تھا۔
”ویسے لڑکی! تم ہو ذہین۔ مگر افسوس یہ ذہانت تم جیسی لڑکیوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔“ ہنسنا مگر تسخیر بھی۔

”مطلب کیا ہے آپ کا۔“ وہ بین جڑل پر پٹخ چکی تھی۔

”کوئی مطلب نہیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غصہ ذہانت کا دشمن ہے اور تم تو بہت غصیلی ہو۔“ تکلفی کی آخری حد بھی با آسانی عبور کر گیا تھا۔

”ہرگز نہیں۔ میں بالکل بھی غصیلی نہیں ہوں۔ بلکہ آپ جان بوجھ کر مجھے غصہ دلانے والی دیکھتے ہیں۔“

”غصہ دلانے والی حرکتیں..... مثلاً۔“

سکندر پاس کرنا، بلاوجہ مخاطب کرنا۔“

”جی ہاں، مجھے آپ پر کھٹکس پاس کرنا، بلاوجہ مخاطب کرنا۔“ نہیں سمجھتی تھی کسی کے پیچھے نہیں آتا البتہ آگے آنے کی بات دوسری ”جی“ اسے اچھا ہوا تھا۔ ”نہیں سمجھتی تھی کسی کے پیچھے نہیں آتا البتہ آگے آنے کی بات دوسری“ اس نے بڑے دوستانہ انداز میں جواب دیا تھا۔

”سنو دیتی کر لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے دوستی نہیں کرنی۔“ اس کا انداز بے حد جلا کٹا تھا۔

”میں نے ایک بار تم کو دوستی کی آفر کی۔ تم نے انکار کر دیا۔ دوسری بار بھی انکار کر دیا اور تیسری بار انکار کیا۔“

”میں اب بھی انکار کر رہی ہوں بہتر ہوگا کہ آپ چوتھی بار ایسی کوشش نہ کریں۔“ سکندر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے بے حد گہرا سانس بھر لیا تھا۔

”سکندر میں حیات سے دوستی کھانے کا سودا نہیں ہے۔ بہت اثر و رسوخ والا ہوں میں۔“ ”ہاں اثر و رسوخ سنبھال کر رکھیے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں بھی بہت اثر و رسوخ والی ہوں۔“ وہ بہت جلد سے غصہ پھیر کر بول رہی تھی جبکہ انداز بے حد سخت تھا۔

”میرا اب میری برداشت جواب دے گئی ہے۔ مسٹر سکندر! آپ نے مجھے واقعی زچ کر دیا ہے۔ سمجھ گیا تھا کہ آپ کے لیے ذہین کا لفظ استعمال کروں یا بے شرم کا اور..... بہر حال جو بھی ہے اب میں آپ کو وارن کر رہی ہوں کہ اگر آپ نے اپنی حرکتوں سے پرہیز نہ کیا تو میں ڈپارٹمنٹ کی اتھارٹیز سے آپ کی شکایت کروں گی۔“

سکندر کا دل چاہا تھا کہ اس کے منہ پر لمبا نچہ دے مارے مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کے منہ سے تڑپ میں خاصی سختی آگئی تھی۔

”میں نے تمہیں انوار کروانے کی کوشش کی ہے؟ تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ آخر ایسا کیا کیا ہے تمہارے لیے؟ تم شکایت کرو گی؟ صرف دوستی کی آفر کی ہے نا تو کسی بھی ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”چلو ہم ابی وقت ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس چلتے ہیں۔ تم انہیں یہ بتا دو کہ میں تمہاری کوشش کی آفر کر رہا ہوں اور میں انہیں یہ بتا دوں گا کہ تم کتنی اثر و رسوخ والی ہو۔ کتنے ستاروں والے،

جھنڈوں والے تمہارے آستانے پر حاضری دیئے آتے ہیں۔ تم کون سے علاقے سے تعلق رکھتے ہو؟ اصل نام کیا ہے، تمہارے خاندان کا پیش کیا ہے..... میں سب بتا دوں گا انہیں۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ ان کے خلاف ایکشن لیتے ہیں اور کے investigate کرتے ہیں۔“

اپنی بات ختم ہو جانے تک وہ اسے دیکھتا رہا تھا لفظوں کے تیز نشانے پر لگے تھے روشنائے گئے پروانگی سکتی کی طرح رنگ تبدیل ہوئے تھے۔

اور اس کے بعد وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ اسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

بکری پہاڑ کے نیچے آ چکی ہے۔

+

کار کے بند دروازے سے کمر نکا کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تھی۔ شام پانچ بجے پہلے تھوڑا ٹینٹ کا بیرونی حصہ خاصا سنسان تھا۔

بمشکل تین منٹ گزرے تھے جب سیاہ سن گلاسز کی اوٹ سے اس نے روشنائے کو اپنی جانب دیکھا تھا۔ وہ اسی لباس میں ملبوس تھی جو اس نے صبح پہن رکھا تھا اور اس پر بڑی شکنیں خاصی نمایاں تھیں۔ گھنی چٹیا کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اسے ایک بار پھر برش نہیں کیا گیا۔ کئی ٹیس لا پرواہی سے کانوں کے اڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی قدرے نمایاں تھے شاید اس نے منہ بھی نہیں دھوا تھا۔

سکندر نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا۔ بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ شخص ایک بجے اسے اس حال تک دے گا۔

روشنائے کار کے قریب آ کر خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی شکل پر بچے بارہ ایک بار گزرا کو مسکرانے پر مجبور کر گئے تھے۔ کار کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنی اس فنی کو قابو کیا اور اندازہ لگایا۔

”کہاں چلتا ہے؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا مگر روشنائے نے جواب دیا۔

بجائی خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔ سکندر نے دیکھا اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں گود میں رکھے ہوئے تھیں۔

”روشنائے.....“ سکندر نے پھر بکارنا چاہا مگر اب کی بار وہ اس کی بات قطع کر چکی تھی۔

”تم کیا چاہتے ہو سکندر؟“ اس کی آواز محض سرگوشی سی تھی۔ اس کے انداز اور آواز دونوں پر ہر چھائی ہوئی تھی۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں۔“

سکندر نے بہت تیزی سے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اس نے روشنائے کو سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

عالمی جانب دیکھا تھا۔

”اس نے کہا شروع کیا اس دوران وڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے منہ روشنائے.....“

بہت کم کہا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ روشنائے اسے بہت غور سے سن رہی ہے۔

”تم میرے origin سے واقف ہونے کے باوجود مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں تمہارے origin سے واقف ہونے کے باوجود میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ اس نے کچھ اور الفاظ روشنائے کو مطمئن کرنے کے لیے کہے تھے اور اپنی بات ختم کر کے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحوں اس کی کامیابی اس کی پیٹھ ٹھپک رہی تھی۔ روشنائے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا ہی پرسکون اور طمانیت آمیز تاثر تھا۔

”تم مجھے ہاتھ تک چھو دو گے؟“ اس پچیس منٹ کی ملاقات میں یہ تیسرا فقرہ تھا جو روشنائے نے ادا کیا تھا۔ سکندر نے سر ہلا کر کار آگے بڑھا دی تھی۔

اس بے تحاشا حسن کی مالک لڑکی کی ہر اینی میں اس کا دل سینے کے اندر تھپتھپے لگا رہا تھا۔

”جو ہار جاتا ہے وہ سکندر نہیں ہوتا اور جو سکندر ہوتا ہے وہ کبھی ہارنا نہیں ہے۔“ اس نے اپنے دل کو کہنے لگا تھا۔

+

یاس سے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔

روشنائے نے اسے اپنے ساتھ لہجے کی دعوت دی تھی۔ اسے تھوڑا سا اعتراض تھا۔ کیونکہ کچھ روز قبل اس نے بھی روشنائے کو اسی قسم کی آفر کی تھی مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور وہ اس انکار پر خاصا بد مزہ اڑا رہا تھا۔

بہر حال اس نے روشنائے کی آفر قبول کر لی تھی۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کی طرف یہ ایک اور قدم تھا۔ وہ مکان کے حدود خارج سے مکمل واقفیت کی بنا پر اسے اپنی پسند کے ایک چائیز ریسٹورینٹ میں لے آیا تھا۔

ان دونوں نے بہت خوشگوار موڈ میں کھانا کھایا تھا اور ویٹر کے بل لانے پر جب سکندر نے پے منٹ کرنی چاہی تو روشنائے نے ٹوک دیا تھا۔

”یہ کتنی بھری طرف سے تھا لہذا بل بھی میں ہی پے کروں گی۔“

وہ اس بات پر ہنسنا تھا۔

”میں یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک خوب صورت لڑکی میری موجودگی میں مل پے کر سہ“
 ”وہ سامنے والی میز پر بیٹھی لڑکی بھی خاصی خوب صورت ہے اور تمہا بھی تو کیا اس کا مل بھی تمہا کو
 گے۔“ شرارتی سے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔ سکندر نے والٹ سے رقم نکالتے ہوئے پہلے اس لڑکی
 دیکھا پھر اس کی طرف۔

”لڑکی واقعی خوب صورت ہے مگر میری فریڈ نہیں ہے۔“ رقم گلدان تلے رکھ کر اس نے والٹ جیب
 میں رکھ لیا تھا۔

”پلیز سکندر! یہ روپے تم رکھو یہ تمہارے ہیں۔“

”فریڈ ز میں تمہارا ہمارا کچھ نہیں ہوتا۔“ سکندر نے اسے ٹوکا تھا۔ وہ اس کی خود ساختہ غیرت سے
 بھی رہا تھا۔

”آج میں مل پے کر دیتا ہوں اگلی بار تم کر دیتا۔“

جان چھڑوانے کی غرض سے اس نے کہا تھا۔ اپنی دولت کا رعب بھی تو جمانا تھا۔

پھر سننے والوں نے سنا اور دیکھنے والوں نے دیکھا۔ وہی روشا نے قمر جو سکندر مبین حیات کے
 سے بھی گریز کرتی تھی۔ اب سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگی۔

بہت سے لوگوں سمیت اس کے دوستوں کے لیے بھی یہ بات حیران کن تھی مگر خود اس کے لیے نہیں
 یہ اس کے التفات کی کرامات تھیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس میں ہر وہ خصوصیت موجود ہے جو کسی بھی لڑکی کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی ہے۔
 میں روشا نے اس کی جانب کھینچے چلے آنا کچھ ایسا غیر معمولی بھی نہ تھا۔ اس جیسے لوگ ہمیشہ ”ایسی گورڈز
 کی good books میں شامل رہتے ہیں۔“

+

ان کی دوستی محض ڈپارٹمنٹ کی ملاقاتوں اور ٹیلی فونک گفتگو سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اب ان کی
 شامیں اکٹھی گزرنے لگی تھیں۔

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی جب سکندر بہت چالاکی سے اپنے ڈپارٹمنٹ میں لے گیا تھا۔ ان لوگوں
 لانگ ڈرائیو کا پروگرام تھا۔

”میں اپنا موٹر بائل گھر بھول آیا ہوں۔ یہاں سے صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ اگر تم بہت
 تو میں پہلے موٹر بائل لے لوں۔“ اس کے پاس بڑا موٹر بیہانہ تھا۔ روشا نے کو کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہاں
 تردد کے اس کے گھر آگئی تھی اور یہاں آ کر بھی کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے کی بجائے وہاں

میری میڈم آگئی تھی۔
 ”جہانے اور کتنوں کے گھر جاتی ہوگی۔“ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر جاتے ہوئے اس نے
 ”چاہا اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔“

”تم میرے گھر پہلی بار آئی ہو خدمت تو کرنی ہی پڑے گی۔“ سافٹ ڈرنک کا گلاس اسے تھماتے
 ہوئے اس نے کہا تھا۔ روشا نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

”وہی تمہارا ڈپارٹمنٹ خاصا خوب صورت ہے۔“

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ کبھی ہماری حویلی دیکھو۔“

”وہ بھی دیکھ لوں گی فی الحال تو سارا ڈپارٹمنٹ ہی دکھا دو۔ یہ ڈرائنگ روم تو بہت اچھا سجا رکھا ہے تم
 نے کمرہ تو ہلا کر ڈھونڈ لیا؟“

”ہاں..... وہ دراصل۔“ اس نے خود کو بڑی مشکل سے بتانے پر آمادہ کیا۔ اس کی نگاہیں مسلسل اپنے
 مانے والے سنگل صوفے پر بیٹھی حسینہ کے گرد بھٹک رہی تھیں۔ وہ سر اٹھائے چاروں طرف دیکھ رہی تھی
 اور اس میں اس کی سرسری گردن سکندر کی نگاہوں کی زد میں آگئی تھی۔ اس کے دل میں کھد بھونے لگی
 تھی۔

”آؤ میں جس سارا ڈپارٹمنٹ دکھاتا ہوں۔“ اپنی نظروں اور دل کو قابو کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
 مارے میں چکر لگا کر وہ سب سے آخر میں اسے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔

”واقعی سکندر! تمہاری پسند بہت شاندار ہے۔“ بیڈ روم میں لگی ایک پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے اس نے
 کہا تھا۔

”ہاں میری پسند واقعی بہت شاندار ہے۔“ وہ زیر لب نہیں با آواز بلند بڑبڑایا تھا۔ وہ روشا نے کے
 صوب میں کھڑا تھا۔ اس کے لیے سیاہ بال نگاہوں کے سامنے تھے۔ اس کی انگلیوں میں اضطراب از سر نو
 بیدار ہونے لگا تھا۔

تمہائی میں تمام تر ”جذبات“ اپنی شدت سے بیدار ہونے لگتے ہیں۔ ایک بل کے لیے اس کا دل چاہا
 کہ وہ اپنے عقب میں موجود روزانہ بند کر کے ہر مصلحت کو پس پشت ڈال دے اور..... مگر وہ اپنے پاؤں پر
 کھڑی نہیں رہ سکتا تھا۔

”جانتی ہو میرا گھر کبھی اتنا خوب صورت نہیں لگا جتنا کہ آج تمہاری موجودگی میں لگ رہا ہے۔“ اس
 نے بہت ہذب سے کہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا اور کمر کی میں جا رہا تھا۔

”ہاں تمہارے کے علاوہ تم اور کیا اچھا بنا لیتے ہو۔“ اس نے روشا نے کی سنجیدہ آواز سن کر
 ”کافی۔“

”اور میں پاشا بہت اچھا بناتی ہوں۔“ وہ اس کے پیچھے آرہی تھی۔
”تو یوں نہ کریں تمہارے فلیٹ پر ایک چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کر لیا جائے۔“

”تو گویا طوائف اپنے رنگ میں داپس آ رہی ہے۔“ اس نے سوچا تھا اور جو کہا تھا وہ لگا تھا۔

”اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔“

اس شام اگر چہ طوائف اپنے رنگ میں داپس نہیں آئی تھی مگر سکندر کو یقین تھا کہ وہ وقت بچا ہے جب وہ روشنائی کو اپنے سامنے جھکا ہوا پائے گا۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب اس نے روشنائی کو گرلز ہاسٹل کے سامنے ڈراپ کر دیا تھا۔ ایک شام کے یوں بے رنگ گزر جانے کا اگرچہ اسے افسوس تھا مگر اس بات کا بھی یقین تھا کہ اصل مقصد کی طرف ایک اور ہٹ لگا چکا ہے۔ وہ جس مقصد کے لیے روشنائی کو یہاں لایا تھا وہی روشنائی قمر اس کی شرافت سے متاثر ہو کر گئی تھی۔

اس کے بعد وہ اکثر و بیشتر اس کے فلیٹ پر آنے لگی تھی..... فاصلے سینے لگتے۔ دور دراز نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھ چکا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ جلد کامیاب ہونے والا ہے۔ وہ مغربی اس کے قدموں میں ٹھکنے والی تھی۔

+

”تم مجھ سے خفا ہو؟“

غیر مکمل ہونے کے ساتھ ہی اس نے اپنے مضبوط ہاتھ پر ایک نرم سی گرفت محسوس کی تھی۔
”میں اس کی لطافت کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اسے روشنائی کی پیش قدمی پر خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ۔ وہ اپنا ہاتھ بے حد سرد مہری سے ہٹا چکا تھا۔

وہ اس وقت ڈپارٹمنٹ کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ روشنائی چلی بیڑی کا قدموں کے قریب بیٹھی تھی۔

فائل ایئر کو دو دن پہلے نی فیئر ویل پارٹی دی گئی تھی ایگزامز قریب آنے کی وجہ سے؟
حاضری بے حد کم ہو گئی تھی۔ جو لوگ آتے تھے ان کا بھی بیشتر وقت لائبریری کی بند رہتا تھا۔ سکندر نہ تو پہلے پڑھنے کی غرض سے آتا تھا اور نہ اب..... اس کا مقصد اب بھی محض وقت گزاری تھا۔
ایگزام دینے کے متعلق بھی سوچا نہ تھا۔ پچھلے پانچ ماہ بھی اگر روشنائی کی بند رہنے سے اس کے متعلق سوچ لیتا۔

”تم مجھ سے خفا ہو سکندر؟“ اس نے پھر روشنائی کو کہتے سنا تھا۔

”نہیں۔“

”مگر مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو۔“ اس نے اپنے لفظوں پر زور دیا تھا۔

”میں ہر ایک سے ناراض نہیں ہوتا۔“ اس نے بڑی لائقیت سے کہا تھا۔

”میں ہر ایک نہیں ہوں بلکہ تمہاری دوست ہوں۔“ وہ رمان سے بولی۔

”میں ہر ایک نہیں ہوں تو اسید ہمدانی کے ہمراہ کیوں نظر آتی ہو؟“ وہ جیسے پھٹ پڑا تھا اور اسے

”مگر تم میری دوست ہوتی تو اسید ہمدانی کے ہمراہ کیوں نظر آتی ہو؟“ وہ جیسے پھٹ پڑا تھا اور اسے

خود ہی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے روشنائی اسے نظر انداز کرتے ہوئے

فائل ایئر کے اسید ہمدانی کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔

فائل ایئر کے اسید بہت برا لگ رہا تھا اور اسے یہ برا لگنا بھی برا لگ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ روشنائی

فر کے بارے میں وہ اتنی شدت سے کیوں سوچ رہا ہے کہ اسید اسے اپنا قریب لگنے لگا تھا۔

”تم جانتی ہو وہ اسید کا بچہ کس قدر کرپٹ بندہ ہے۔ ایک نمبر کا فلرٹ اور دھوکے باز..... پرسوں

پارٹی میں تم ہی تم زیادہ وقت اسی کے ساتھ تھیں۔ پھر اس سے بھی پہلے کرم نے خود تمہیں اس کے فلیٹ سے

ٹھکے دیکھا تھا کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ یہ راہ و رسم کس لیے بڑھا ہے جا رہے ہیں؟“ وہ خود متحیر تھا کہ اتنا

انتہائی ہر سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔

روشنائی نے اس کی بات بہت تھل سے سنی تھی اور پھر سکندر نے اس کے لیوں پر بڑی محفوظ سی

مکراہٹ ابھرتے دیکھی۔

”میں کبھی دیکھنا چاہتی تھی کہ تم میری اسید ہمدانی سے بے تکلفی پر کس طرح ری ایکٹ کرتے ہو۔“

اس نے رمان سے کہا تھا۔ سکندر نے طنز یہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہلیز اب مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو روشنائی! یعنی صرف میرا ری ایکشن دیکھنے کی غرض

سے تم اس جیسے کرپٹ اور لوڑ کریکٹر کے گھر گئی تھیں۔“ اس نے بڑے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ جانتا تھا

کہ روشنائی اس کے گھر کیوں گئی ہو گی اس جیسی عورتیں کسی کے بھی گھر جاسکتی ہیں۔

”نہیں میں اس لیے اس کے گھر نہیں گئی تھی۔“ اس نے روشنائی کی اطمینان بھری آواز سنی تھی۔

”مجھے جتا ہے تم کیوں گئی تھیں۔“ اس نے دل میں حقارت سے کہا تھا۔

”مگر چہ اسید ہمدانی سے بے تکلفی میں نے تمہارا ری ایکشن دیکھنے کے لیے ہی بڑھا دی تھی مگر اس کے

گھر میں اس کی بہن سے ملنے گئی تھی۔ اسید ہمدانی، ہما ہمدانی کا بھائی ہے جو میری روم میٹ تھی پھر اس کے

بھائی نے یہاں گھر لے لیا تو وہ وہاں شفٹ ہو گئی۔ جس روز کرم نے مجھے دیکھا میں ہما کی عیادت کے لیے

اس کے گھر گئی تھی۔“

ماضی نہیں ہے میری ماں بہن آج بھی اسی کام سے منسلک ہیں۔“

اس کی سوئی وہیں لٹکی ہوئی تھی سکندر کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

”تم یہ سب فراموش کر کے تو دیکھو روشنی! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تمہارا دوست۔“

”تم ہمیشہ اپنے اور میرے رشتے کی وضاحت نہ کیا کرو سکندر! میں جانتی ہوں کہ تم دوست نہ
سکندر نے اس کو ذرا حیرانی سے دیکھا تھا۔ روشنانے نے اگرچہ تحمل سے کہا تھا مگر کچھ عجیب
گویا اسے یہ بات بری لگی ہو۔

میری بڑی بہن نے یہ حقیقت بھلانے کی کوشش نہ تھی جانتے ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟
خود کوئی کرنی پڑی اور اب رہا..... مجھے اس کی بہت فکر ہے جانتے ہو ایک فلم پر ڈیوہ سے بہت کر
نے۔ میں اپنی بہن سے بہت محبت کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ جو وہ چاہتی ہے اسے مل جائے۔

کبھی کبھی تو مجھے خدا پر بھی غصہ آنے لگتا ہے۔ بھلا کس بات کی سزا دی اس نے ہمیں۔ مرنے
بنایا، حسن دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دل بھی عام عورتوں جیسا دے دیا اور نام رکھ دیا طوائف۔

کم سے کم کوئی ایک چیز تو ایسی ہوتی جو ہمیں بھی ممتاز یا برابر کر دیتی۔ اب ہم اس عالم
ضرورت ہیں مگر اس کا حصہ نہیں۔ اب عورتیں ہمیں حقارت سے دیکھتی ہیں۔ بچے ہم سے نفرت کر
اور مرد..... مرد ہمیں استعمال کرنا جانتا ہے وہ ہمیں ایک گھر نہیں دے سکتا۔

سب لوگ ہمیں غلیظ سمجھتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ ان غلیظ وجودوں میں دھڑکنے والا
عورت کا ہے جو ایک بر سکون اور عزت دار زندگی کی خواہاں ہے۔ جو مرد کی ہمرای میں ایک گمراہ
دیکھتی ہے۔

”کیا تم بھی ایک گھر حاصل کرنا چاہتی ہو روشنی۔“ اس نے پوچھا تھا۔ روشنانے ہمرایت
نہیں تھی۔

”میں نے کہا نا چاہے مجھ پر طوائف کا لیبل چسپاں ہے مگر میرے سینے میں بھی دھڑکنے والا
عورت کا ہے جو گھر کی خواہش کرتا ہے۔ جہاں سکون ہو، عزت ہو اور..... اور سب کچھ ہو جائے۔“

سکندر کو وہ وہاں آئے ہوئے تھے وہاں نہیں تھی۔

”اور اگر یہ گھر نہیں ملے تو خواتین سے ملنے کے لیے ایک لڑکا لے کر آئے۔“ وہ اس نے بتایا کہ وہ لڑکا
کا گھر ہو رہا تھا تھا تھا۔

”تم مجھے کس گھر سے لے کر آئے ہو؟“ یہ بات سن کر وہ بھی حیران ہوئی۔ وہ بے یقینی سے
نہیں دیکھتا تھا۔ وہ مجروح سے انداز میں ہنسا تھا۔

”تم مجھے کبھی سمجھ نہیں سکیں اور تم کبھی مجھ پر یقین بھی نہیں کرتیں۔ بہر حال میں تمہاری خواہش پوری
ہم مجھے سمجھنا ہوں اور یہ میری خواہش ہے کہ جو گھر تمہارا ہو اس کے ساتھ میرا حوالہ جڑا ہو۔ بتاؤ ناروشنی کیا تم وہ

گھر قبول کر لو گی جو کبھی میرا بھی ہو۔“
مگر قبول کر لے وہ اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ روشنانے نے ایک نظر اس کے ہاتھوں کو
بہت جذب سے دیکھا تھا۔ روشنی کی شدت سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ سر ہلا دیا۔

”ہاں۔“
سکندر نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیے تھے۔

عورت کی ایک ”ہاں“ بہت سی باتوں پر قبولیت کی مہر لگا دیتی ہے اور ان باتوں میں وہ تمام باتیں
مثال ہوتی ہیں جو اسے ناپسند ہوتی ہیں اور جو اسے پسند ہوتی ہیں۔

+

میں اس بچے کے قریب وہ روشنانے کو رخصت کرنے دروازے تک آیا تھا۔ اسی وقت احمر آ گیا تھا۔
روشنانے چلی گئی تھی اور احمر اندر آ گیا تھا۔

”یہ روشنانے اس وقت یہاں؟“
”وہ رات بھر یہیں تھی۔“ اس کی حیرانگی کے جواب میں سکندر نے بہت ہلکے ہلکے انداز میں کہا تھا اور
ان کے تاثرات جانچنے لگا تھا۔ اس کے انداز میں فقط تعجب اور بے یقینی تھی۔

”ہیں..... یعنی کہ ساری رات؟“
”ہاں ساری رات۔“ اس نے کندھے اچکا کر یوں کہا گویا یہ عام سی بات ہو اور واقعی یہ عام سی ہی
بات تھی۔

”مگر ساری رات..... وہ یہاں کیا کرتی رہی؟“ احمر کی معلومات ایسے معاملات میں قدرے محدود
تھیں۔

سکندر نے گھور کر اس کی ہونٹیں شکل کو دیکھا۔

”مگر امر کا کورس کرنے آئی تھی۔ ساری رات اس کے اسرار و رموز سمجھتی رہی۔“
”کے لیے نچے دونوں ہاتھوں کا تکیہ رکھتے ہوئے اس نے چھت پر نظریں گاڑ دی تھیں۔

کل شام میں برسنے والی مسلسل دھوا تر بارش نے چاہے شہر میں جتنی بھی تباہی مچا دی ہو مگر یہ بارش
ہمیں لے کر بہت سویرے صبح ہوئی تھی۔

اگر کل بارش نہ برسی ہوتی تو یقیناً وہ، یہ سرور نہ حاصل کر پایا ہوتا۔ (اتنی جلدی) اگرچہ ایسا نہیں تھا کہ

وہ ”لطف“ کی اس حد تک پہلی بار شناسائی حاصل کر سکا تھا مگر روشنائی فکری کی قوت ابھی کچھ کم تھی۔ اپنے نام کی طرح تھی ”چاند کی طرح روشن۔“

سکندر کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ جولائی ہستے ہوئے پاگل کرتی ہے، روتے ہوئے ہلر خود کر دے گی۔ وہ خود بھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ روتے ہوئے زیادہ حسین لگتی ہے یا ہستے ہوئے کبھی کبھی خواب اور حقیقت میں سے زیادہ خوب صورت کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے؟ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا بہر حال جو بھی ہوا تھا وہ کافی مصور کن اور مبہوت کر دینے کی صلاح تھا۔

”مجھے تو یقین نہیں آ رہا بھلا..... روشنائی جیسی لڑکی بھی ایسی ہو سکتی ہے۔“ اترنے لگا۔
وہی ہمدردی کا ابال اس وقت دکھ میں بدل گیا تھا۔

”تم ایک طوائف سے اور کیا توقع کر سکتے ہو۔“ سکندر نے کہا تھا۔ بے شک وہ بہت غماز اس کے باوجود وہ حقیقت سے نگاہیں نہیں چا سکتا تھا۔

کل رات جو بھی ہوا روشنائی اس میں نہ صرف برابر کی شریک رہی بلکہ بارضامی بھی تھا اور۔
کی اپنی رضا بھی شامل ہو تو تنہائیاں کچھ اور حسین ہو جایا کرتی ہیں۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔

”اس میں غلط کیا ہے سکندر؟“ سکندر نے بے حد نفرت سے اسے دیکھا تھا اور پھر ہاتھ میں گول مول کر کے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کچھ روز میں یہ مطالبہ ہوگا لیکن اتنی جلدی غیر محسوس ”اول تا آخر سب غلط تو ہے..... ایک طوائف کو دوائف بنانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا“ وہ استہزاء سے بولا تھا۔ اپنے دل کی نفرت و حقارت کو لفظوں میں ڈھال کر اس تک پہنچانے نے مرکز کو دیکھا تھا۔ وہ روشنانے جس جگہ کھڑی تھی اب وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی شرٹ کے کھلے بٹن بند کیے تھے اور کار کی چابی اور وراثت اٹھاتے ہوئے چلا تھا۔ اس کی چوٹی پھسل کر آگے آگئی تھی۔ وہ کار پٹ پر دوڑا تو بیسی تھی۔ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کے تاثرات دیکھ نہیں پایا تھا مگر اس کی شکل نہ دیکھ سکنے کے باوجود وہ اس کی سوچ سے واقف تھا۔ ہارے ہوئے انسان کے پاس سوچنے کے لیے اپنی ہار کے اسباب، وجوہات اور موجودہ حالت ہیں۔ جنہیں اپنی تفصیلوں کے پپالے میں بھر بھر کر وہ اپنے سر میں خاک کی طرح اغماص بنا لیتا ہے۔

اس کے قریب آ گیا تھا اور بچوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

چلے دوائے شفا سے ترحم سے دیکھتا رہا پھر کئی نوٹ اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔
تیبا کی کت ہے۔ میں تمہارے تمام واجبات ادا کر چکا ہوں اب مجھ پر کچھ بھی واجب الادا نہیں
رہا۔ جواب برابر ہو گئے۔

جہاں تمام حساب برابر ہوئے۔
 اور اس زندگی میں بھی خدمت ملی تو تمہارے آستانے پر حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ جانتا ہوں کہ تم
 اور وہاں کی سبھی خواتین اپنے درہمارے لیے ہمد وقت کھلے رکھتی ہیں۔ ہاں، بھیجی ہم جیسے امراتو
 کو وہاں کی سبھی خواتین ہاں صحت خواتین اپنے درہمارے لیے ہمد وقت کھلے رکھتی ہیں۔ ہاں، بھیجی ہم جیسے امراتو
 کو وہاں کی سبھی خواتین ہاں صحت خواتین اپنے درہمارے لیے ہمد وقت کھلے رکھتی ہیں۔ ہاں، بھیجی ہم جیسے امراتو

مہمچا خیر چلا ہوں ڈیپارٹمنٹ میں تو ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ کسی چیز کی یا رقم کی ضرورت ہو تو بلا مجھے نہ کرو۔ آخروست ہی دوست کے کام آتا ہے۔“

اس کے بعد روشنائی قبریوں غائب ہوئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینک غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ جہاز چا پاک آ کر کرب کے حواسوں پر چھا گئی تھی بالکل ویسے ہی اچانک منظر سے غائب ہو کر حواسوں پر ٹوٹی ہوئی تھی۔

اپنے صاحب سے وہ روشنائے قرمے آخری ملاقات کر چکا تھا مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک بار پھر اسے آگنا سامنا ہوگا۔

الہ نے اسے پورے چار ماہ بعد دیکھا تھا اور جس حلقے اور حیثیت میں دیکھا تھا وہ خاصا اعصاب شکن
 الہ کی بساط الٰہ کی جلی تھی۔

✦

”سن زعمی میں کبھی نہیں ہارا۔ مجھے ہارنا سکھایا ہی نہیں گیا۔“

محرمستان کے بہت قریب کسی نے بہت دھیمے سے سرگوشی کی تھی۔ کسی کے پُر غرور و پُر عزم لہجے نے یہ بات کہ غصہ پر بڑی زور سے دستک دی تھی۔

یہ بات کہ کھانے کے بعد اور کس انداز میں کبھی تھی میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں کہ وہ شخص ابھی کچھ
میں اس بات پر مجھ پر ہنس رہا تھا۔

پہلے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ بسات کے پوں پلٹے جانے پر نا صرف حیران

بلکہ کچھ کچھ پریشان بھی ہوگا۔

کچھ بار حیا اور کچھ مسکارے کے بوجھ سے جھکی پکوں کو نزاکت سے اٹھا کر میں نے ایک فرار دیکھا بھی تھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر نگاہیں تھیں۔ وہ ایک لگ بھگ کچھ کچھ اس کی گہری براؤن آنکھوں میں چپقلش، رخش، حقارت، غصہ اور نفرت جیسی کوئی ایک چیز کی طرح نظر آتی تھی۔ اسے حیران ہی ہونا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے مجھے دلہن کے روپ میں دیکھ کر ہوش اڑے تھے۔ اب ایسے میں وہ مسرت آمیز دھماکا تو ڈال نہیں سکتا تھا۔

ساتھ کی دہائی کے بھاری فرخچر سے آراستہ اس کمرے میں ہوش اڑا دینے والی دھڑکیوں کا ایک میں اور دوسرا میرا دھڑکا۔

سکندر زمین حیات کے لیے یہ دونوں چیزیں ہی حیران کن تھیں۔ حیران کن چیزیں وہی ہوتی تو قعات کے برعکس ہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ سکندر زمین حیات کے ساتھ ہوا وہ اس کی توقعات کے تھا۔ بعض دفعہ شکست انسان کو انگشت بدنداں کر دیا کرتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ سکندر زمین حیات شکست سے دوچار ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے سکندر سے کہا تھا۔ ”نام سکندر رکھ لینے سے تقدیریں سکندر بن جاتیں۔“

اور تب اس نے گردن تان کر کہا تھا۔ ”سکندر کی تقدیر بھی سکندر ہی ہے۔ میں کبھی نہیں ہارا کیونکہ مجھے ہارنا سکھایا ہی نہیں گیا۔“ اور دل چاہ رہا ہے کہ اس کی شکست پر قہقہہ لگاؤں اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوں بھرپور چوں۔

”کیوں میاں کہاں گئی وہ سکندر کی تقدیر جس پر آپ کو بڑا مان تھا۔“ لیکن چونکہ میں دلہن تھی اور مجھے شرمنا چاہیے تھا۔ سو میں وہی کر رہی تھی جو کہ موقع کا دستور تھا وہ میری سوچ پڑھ چکا تھا تبھی وہ اس کمرے سے چلا گیا۔ ممکن ہے کہ اپنے اونچے شیلے والے باپ حقیقت سے آگاہ کرنے گیا ہو جس سے وہ پہلے ہی واقف ہے۔

لیکن نہیں..... اپنی عزت کو وہ کیسے رگید سکتا ہے۔ یہ تو اس بڑی حویلی کی شان نہیں ہے اور چونکہ اس حویلی کی زینت بن چکی ہوں تو وہ اس زینت کو بنائیں لگا سکتا۔

مجھے دلہن کے روپ میں دیکھ کر کتنی آگ لگی ہوگی۔ کتنے بیچ و تاب کھائے ہوں مے اس نے کے دل و دماغ میں ہار کی انٹھن اٹھی ہوگی۔ کتنا تھلا یا ہوگا وہ۔ میں اس سب سے واقف ہوں۔ کیا بھی یہی سب محسوس کر چکی ہوں محض اس کی وجہ سے میں بھی صرف ایک نہیں بلکہ کئی راتیں تک پریشان پر سر رکھ کر سوئی تھی۔ صرف اس سکندر زمین حیات کی وجہ سے جسے اپنی تقدیر کے سکندر ہونے پر

دلہن کی کوسکھایا نہیں جاتا۔ جتنا بھی کسی کو سکھایا نہیں جاتا۔ یہ تو وہ ہنر ہیں جو انسان خود بخود دیکھتا

مجھے بھی جتنا نہیں سکھایا گیا تھا کبھی ہارنا بھی نہیں سکھایا گیا تھا مگر صرف سکندر زمین حیات کی وجہ سے مجھے ”تہہ“ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ سکندر کو بھی بغیر ہارنے کا فن سیکھے ہارنا پڑا تھا۔ کبھی کبھار انسان کو بغیر سیکھے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ سکندر کو بھی بغیر ہارنے کا فن سیکھے ہارنا پڑا تھا۔ کبھی کبھار سکندر کی تقدیر ایسے موز بھی اختیار کرتی ہے جن سے انسان نہ منہ موز سکتا ہے اور نہ سامنا کر پاتا ہے۔

پتھاب سے زکریا بخاری تک کا مائیکریشن محض ایک احتیاطی تدبیر تھی۔ اگرچہ لاہور میں بھی مجھے بہت زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ میرا حلقہ احباب بے حد محدود تھا۔ جسے ہاتھ ہونے بھی میں دستغیب نہیں کر سکتی تھی وجہ ظاہر ہے کہ میرا ”اصل“ تھا۔ بس احتیاط ہی کسی متوقع خفت سے بچنے کے لیے میں دوام کے اندر ہی اندر ملتان آگئی تھی مگر مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ایک بہت بڑی مصیبت میری منتظر ہے۔

+

”میں آتا ہوں، میں دیکھتا ہوں اور میں فتح کر لیتا ہوں۔“ سکندر زمین حیات کی آنکھوں میں جو پہلی تحریر میں نے دیکھی وہ یہی تھی جو صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ انہماک اور اندازہ ہمیشہ چچ کر رہی کہتا تھا۔

مگر کیا ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کے ڈپلومیٹک رویے سے مات کھاتی آئی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ حالانکہ عرشہ نے مجھے اول روز ہی وارن کر دیا تھا۔

”یہ سکندر زمین حیات ہے۔ ذرا بچ کر رہتا اس سے، محترم زمیندار گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ۔“ غلام اللہ عرشہ نے لڑکی کو اپنی ہپ پاکٹ میں رکھنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں اور لڑکیوں پر پندیدی

البتہ عرشہ پر میں سراسر بھاری سکتی تھی سکندر زمین حیات اس وقت کلاس میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا نظر دیکھا بھی تھا۔ عرشہ کی کئی باتوں پر اس وقت تو ایمان لانا مشکل تھا البتہ اس شخص کی غیر معمولی اہلیت، باقی قابل ستائش تھی۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس وقت میں متاثر ہوئی تھی اور میرے ذہن میں وہ ”عشرہ“ کی سوچ کھڑی ہو گئی تھی۔ عرشہ اپنی کسی ذاتی چپقلش کی بنا پر اس کی کردار کشی کر رہی تھی۔

کلاس میں ہونے والی اچھی خاصی منجیدہ ڈسکشن کے دوران جس طرح سے اس نے میرے پوائنٹ

آف ویکو گیدراتھادہ مجھے خاصا ناگوار گزرا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس وقت اس کا پوائنٹ غلط ایسا ہو گیا۔
اس کا بات کرنے کا انداز غلط تھا۔ محض چند جملوں کے تبادلے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ کون سا
برائے بحث کا قائل ہے۔
”لڑکیوں کے مسائل سمجھنے کے لیے لڑکی بن جاؤ۔“
”جانوروں کے مسائل سمجھنے کے لیے جانور۔“

مجھے کچھ اس قسم کے جملوں اور طنزیہ قہقہوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اپنی ناگواری کو قابو کر کے ہنسنا
نے بہتر یہی سمجھا کہ خاموش رہوں۔ اس کلاس کے فوراً بعد سکندر زمین حیات نے مجھے سے نوٹس لگائے تھے
میں نے صاف انکار کر دیا تھا حالانکہ اس سے قبل میں بہت سے لوگوں کو اپنے نوٹس دے چکا تھا جنہم
لڑکے لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ مجھے ہمیشہ دوسروں کے کام آ کر خوش محسوس ہوتی تھی لیکن سکندر کو
کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی برا نہیں لگا تھا۔ میرے دل نے اس بات کی گواہی دی تھی کہ اس شخص سے کم
بھی قسم کا رابطہ نقصان دہ ہو سکتا ہے پھر چاہے وہ نوٹس کے لین دین تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ اپنے انکار
جواب میں، میں نے اسے مسکراتے دیکھا تھا اور اس کی مسکراہٹ خاصی طنزیہ تھی۔ جس بچی کی رائے
مثبت رہ جانے کا خدشہ تھا وہ بھی خراب ہو گئی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ بے حد بری لگی تھی اتنی دیر تک وہ
اپنے لہجے کو نابل رکھے ہوئے تھے وہ فوراً سخت ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ اس طرح سے وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا مگر حقیقت یہ میری غلط فہمی تھی یہ تو آواز
میں سمجھ نہیں سکی تھی کہ سکندر کی یہ خاص عنایات صرف میرے لیے ہیں یا وہ ہر لڑکی کو اسی طرح سے نہیں
دیتے۔
کلاس روم میں وہ، جیسے کے لیے میری چیز سے قریبی چیز چنتا تھا۔ کینٹین میں جس ٹیبل پر میں
تھی اس کے قریب ٹیبل پر بیٹھتا تھا۔ ہر روز مجھے لفٹ کی آفر بھی ضرور کرتا تھا اور بار بار بلاوجہ مخاطب بھی
تھا۔ نجانے کیوں اسے میرے چہرے پر لگا نوٹس کا بورڈ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا حالانکہ ڈپارٹمنٹ کے
تمام لڑکے جو مجھے مخاطب کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے سبھی اپنی اپنی راہ لے چکے تھے سوائے
کے۔

مگر اسے مسلسل نظر انداز کرنے کی کوشش کا میاب رہی تھی۔ وہ نوڈن خاصے سکون سے گزرے
سکندر ان دنوں اگرچہ ڈپارٹمنٹ آتا تھا مگر اب اس نے مجھے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا اور میں نے وہ
سکون کا سانس لیا تھا۔
ممکن ہے کہ یہ عرشہ کی کمی ہوئی باتوں کا اثر ہو مگر میں سکندر زمین حیات کے بارے میں کوئی بھی
رائے قائم نہیں کر سکتی تھی کچھ تو ڈپارٹمنٹ میں اس کے قے مشہور تھے پھر کچھ اس کی حسیں ہی لگتی تھیں۔

مگر کوئی بھی اس کے بارے میں مثبت سوچ سکتا تھا۔
صاف جاننے سے نہ بھی میں نے سخت رویہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت تھی۔
مگر میرا انداز ہر ایک سے ہلکا پھلکا
نی ہٹ کر بات کر لیتی اور اگر نہ مخاطب کرتا تو پروا کے تھی۔ مگر میرا انداز ہر ایک سے ہلکا پھلکا
تندی رہا تھا۔ کیونکہ ہر دو طرح سے آپ دانستہ یا نادانستہ طور پر دوسروں کو اپنے بارے میں متحس کر
چہ ہیں اور یہی تجس میرے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔
میں نے بیٹھ کوشش کی کہ سکندر زمین حیات کی فضول سی گفتگو پر کان بند کر لوں اور اگر کان کھلے رہ
لیڈو کمز زبان پر ہی قابو رکھ لوں مگر نجانے وہ شخص کس مٹی سے بنا تھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات
رکھتا تھا کہ اپنے آپ پر بے تحاشا قابو رکھنے کے باوجود میں اس کی بات کا جواب دے دیتی تھی اور وہ
باتوں سے باتیں نکال کر سامنے والے بندے کو زچ کر دینے میں یہ دیر طویل رکھتا تھا۔
+

کلاس میں میری اسائنمنٹ پسند کی جاتی تھی۔ اکثر کلاس میٹ اسی کوشش میں ہوتے تھے کہ میری
نن کا پی کرالیں۔ ٹیچر میری رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ محض ڈیڑھ ماہ کے اندر ہی اندر میں کلاس
جرنل اسٹوڈنٹس میں شمار ہونے لگی تھی اور یہ مجھ جیسی لڑکی کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایسا نہیں تھا
کہ کوئی بہت آؤٹ اسٹینڈنگ تھی اور کم پڑھائی کر کے بھی یہ مقام حاصل کر رہی تھی۔ اسائنمنٹ تیار
کرنے کے لیے مجھے کئی گھنٹے سرکھپانا پڑتا۔ کسی بھی ٹاپک پر وسیع تر معلومات اکٹھی کرنے کے لیے کئی کئی
گھنٹے سرکھپانا پڑتا تھا اور پھر کہیں جا کر میں اس قابل ہوتی تھی کہ پورے اعتماد سے اس موضوع پر
رائے سکوں۔

کچھ دن سکون سے گزرے تھے اور ایک دفعہ پھر سکندر زمین حیات کے ڈرامے کی نئی قسط چل پڑی
میرا خیال تھا کہ اس کی دوستی والی پیشکش کے جواب میں کوہا جواب سن کر وہ غیرت مندوں کی طرح
بکھڑکے ہوئے ہوں گے مگر وہ ڈھیل ڈھیل نہیں ڈھیلوں کا سردار تھا غیرت کرنا تو اس نے سیکھا نہ تھا۔
پانچ گھنٹہ کا احساس دلانے پہنچ جاتا تھا۔

مگر مجھے پروفیسر باگی کی اسائنمنٹ کی وجہ سے آنا پڑا تھا۔ وہ خاصے سخت ٹیچر تھے اور اسی وجہ سے اکثر
بچہ آئے ہوئے تھے۔ مگر، عرشہ اور ہمینہ پہلے ہی اسائنمنٹ جمع کروا چکی تھیں۔ اسائنمنٹ جمع کروا
میں پروفیسر باگی کے آفس سے باہر لگی تو موسم خاصا اچھا ہو چکا تھا ہلکے ہلکے بادل آسمان پر ہوا کے دوش

پراڑتے پھر رہے تھے۔ بہار کی آمد ہی آمد تھی پچھلے کچھ دنوں سے بے رنگ ہواؤ پارٹمنٹ کالان صاحبہ رہا تھا۔

میں وہیں بیڑھیوں میں بیٹھ کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے کچھ دیر گزرا جب میں نے ایک عجیب سا احساس محسوس کیا تھا۔ اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ موڑ کر دیکھا۔ دو تین فٹ کے فاصلے پر میری والی سیر می سے غلی سیر می پر سکندر مبین حیات بیٹھا ہوا تھا۔ نے کہنیاں گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اسے اس کو مینے طرف دیکھا پا کر میں حقیقتاً اندر تک کڑوی ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟“ میرے دیکھنے پر اس نے جھٹ سے بڑے دوستانہ انداز میں تھا۔ اور میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کہہ دوں ”تمہارے آنے سے پہلے تو بہت اچھی تھی البتہ ہوں۔“ مگر میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے یوں بتایا تھا جیسے میں اس کی خیریت جاننے کے لیے جا رہا ہوں۔

”آپ آج تنہا آئی ہیں؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”جی۔“ میں نے جان بوجھ کر اختصار سے کام لیا تھا۔

”میں نے آپ کو تنہا بیٹھے دیکھا تو سوچا شاید آپ بور ہو رہی ہوں۔ تبھی کہنی دینے آ گیا۔“

”ناحق زحمت کی آپ نے میں بور قطعاً نہیں ہو رہی تھی بلکہ میں تو ہمیشہ تنہائی کو انجاء کرتی ہوں۔ میں نے حتی المقدور لہجہ رد کھا رکھا تھا پتا نہیں اس پر اثر ہوا تھا یا نہیں مگر وہ خاموش ضرور ہو گیا تھا۔

طویل خاموشی یقیناً اس کے مسلک میں کفر تھی۔

”آپ کو معلوم ہے یونین صدر کے انتخاب کے لیے دو ٹنگ پرسوں ہوگی۔“

”جی۔“

”کس کو ووٹ دیں گی آپ۔“ نجانے اسے ان معلومات میں کیا دلچسپی تھی۔

”علی حسن کو۔“

”کوئی خاص وجہ۔“ میں نے جیکھی سی نظر اس پر ڈالی پھر جواب دیا۔

”ظاہر ہے وہ میرا پارٹمنٹ فیلو ہے اب اس کے علاوہ میں اور کسے ووٹ دے سکتی ہوں۔“

”اگر میں یونین الیکشن میں حصہ لوں تو کیا آپ مجھے ووٹ دیں گی؟“ اس کا سوال میرے لیے غم متوقع تھا۔ میں نے سہلے صحت ہو کر اسے دیکھا اور وہ بے حد جاندار طریقے سے مسکرا رہا تھا۔

میں نے اس کے ساتھ ہی شرارت بھی داخل مقدار میں تھی۔

”میں نے جھلا کر کہا۔“ مجھے اپنا ووٹ ضائع کرنے کا شوق نہیں ہے۔“

”مہمے کیوں بھی! میں تو آپ کا کلاس فیلو بھی ہوں اور پھر آپ کا ووٹ ضائع کیسے ہوگا۔“

”وہ بڑے قہر سے پوچھ رہا تھا۔“

”ہر تو آپ نے یوں بھی جانا ہے پھر اپنا ووٹ آپ کو دے کر میں کسی اور کا نقصان کیوں کروں۔“

میں نے اکابرانہ انداز میں وضاحت دی۔

”میری دنیا کا احساس دل میں لیے گھوم رہی ہیں۔ کچھ ادھر بھی دھیان دیتے۔ میں بھی اس بنی نوع

مذہب میں سے ہوں آپ کی ایک ہاں بڑی سودمند ہو سکتی ہے میرے لیے۔“ میں نے اس کی بات پر جہان و بامناہب نہ سمجھا۔

”وہ ایک بات بتاؤں مس روشانی اگر میں الیکشن میں کھڑا ہو گیا تو جیت صرف میری ہوگی۔“

”ہاں آپ مجھے ووٹ دیں یا نہیں۔“ اس کا پر زعم لہجہ مجھے اندر تک جھلسا گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ”میں آتا ہوں، میں دیکھتا ہوں، میں فتح کر لیتا ہوں۔“ والا تاثر پوری شان سے نکلتا تھا۔

”ہام سکندر رکھ لینے سے تقدیریں سکندری نہیں ہو جاتیں۔“ میں چاہتے ہوئے بھی اپنی ناگواری چھپا

لہجہ کی تھی۔ میری بات سن کر وہ ہنسنے لگا تھا۔ بالکل ایسے جیسے میری بات سے لطف لے رہا ہو۔ اس کے بعد

”اس نے میری طرف دیکھ کر اپنی گردن تان کر کہا تھا گویا کسی کم فہم بچے کو سمجھایا جا رہا ہو۔“

”سکندر کی تقدیر بھی سکندری ہے۔ میں کبھی نہیں ہارا کیونکہ مجھے ہارنا سکھایا ہی نہیں گیا۔“

مجھے اس کا لہجہ، اس کا انداز، اس کی شکل، اس کی آواز سب کچھ ہی بہت برا لگا تھا۔

”کچھ کام بغیر کیسے بھی کرنے پڑتے ہیں سکندر صاحب! ذرا دیکھ بھال کر چلیے کہیں ایسا نہ ہو منہ کے

لڑائی کا پتہ۔“ میں نے اسے تنبیہ کی تو وہ کسی قدر میری طرف گھوم گیا۔ اس کے لبوں پر بڑی محفوظ کن سی

”کچھ لوگ بڑائی ہارے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ کون سے لوگ ہوتے ہیں کبھی فرصت سے آپ کو

”میں نے اسے تنبیہ کی تو وہ کسی قدر میری طرف گھوم گیا۔ اس کے لبوں پر بڑی محفوظ کن سی

ہوتی بدلتی تھی۔ میرے ہر دفعہ ناگواری سے بات کرنے کے باوجود وہ مجھے بار بار مخاطب کرتا تھا۔
اس روز میں مریم اور ہمیں کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی چونکہ کچھ پڑھائی کا ارادہ تھا تھی ہم لوگ دیگر
لوگوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب مریم نے بھوک بھوک کا شور کر دیا۔ میرا
تنبہ بن جانے کا ارادہ نہیں تھا تھی وہ دونوں چلی گئیں۔ مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ ابھی وہ مصیبت فیک
پڑے گی تو میں بھی چلی جاتی۔
سکندر نے کچھ دیر بے نیکی گفتگو کے بعد پھر سے مجھے فورس کرنا شروع کر دیا تھا۔

”میں آپ کو وارن کر رہی ہوں سکندر صاحب! اگر آپ نے اپنی حرکتوں سے پرہیز نہ کیا تو میں
ڈانٹ کی انتہائیں سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔“
میں جانتی ہوں یا میرا خدا..... کہ یہ دھمکی میں نے کس قدر اکتا کر دی تھی مگر مجھے رتی بھر اندازہ نہیں تھا
کہ اب مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی ہفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات کسی بھی صدمے سے کم نہیں
تھی کہ وہ میری حقیقت سے واقف ہے۔

”چلو ہم اسی وقت ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس چلتے ہیں۔ تم انہیں یہ بتا دو کہ میں تمہیں دوستی کی
آزکر رہا ہوں اور میں انہیں یہ بتا دوں گا کہ تم کتنی اثر و رسوخ والی ہو۔ کتنے ستاروں والے جھنڈوں والے
نہارے آسمانے پر حاضری دینے آتے ہیں۔ تم کون سے علاقے سے تعلق رکھتی ہو تمہارا اصل نام کیا ہے
نہارے خاندان کا پیش کیا ہے میں سب بتا دوں گا انہیں پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کس کے خلاف ایکشن لینے
بیادار کے investigate کرتے ہیں۔“
وہ بول چکا تھا اور میں بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

ایک بار پھر میرا سامنا اسی ہفت سے ہوا تھا جس سے میں ہمیشہ پہلو بچاتی آئی تھی اور جو بچپن سے
میری راہ میں پتھر بکھرائی آئی تھی۔ میں اب تک سمجھ نہیں سکی کہ میری غلطی کہاں نکلتی ہے۔ کیوں مجھے ایک
لنگا جگہ چھیک دیا گیا جہاں غیرت پاؤں کے نیچے لیتی ہے اور بے غیرتی اونچے استھانوں پر براجمان رہتی
ہے۔ آخر وہ کون سی خطا ہے جس کے نتیجے میں مجھے ”بازارسن“ کے ایک چوبارے میں پیدا کیا گیا۔ میری
پیش کی مشہور قاصدہ تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟ میری بہن عصمت فروش تھی تو اس کا بھگتان میں
کیوں بچوں؟

لیکن ایسے سوالوں کے جواب نہیں ملا کرتے ایک نسل کی عیاشیوں کی تو کبھی خطاؤں کی سزا اگلی نسل کو
بھی عیاں ہوتی ہے۔

الٹا سمت کو بہت زیادہ کوس لینے اور جی بھر کر رو لینے کے بعد میں نے سکندر زمین حیات کو فون کیا تھا۔
اس کا فون نمبر میں نے کیسے حاصل کیا۔ یہ الگ کہانی ہے۔ اسے ڈپارٹمنٹ آنے کا کہہ کر میں خود پہلے ہی

تھا۔
”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اگر میں الیکشن میں کھڑا ہوا تو جیت میری ہی ہوگی۔“ وہ ابھی کی پانڈی
مجھے مزید تاؤ آگیا۔ خاموش رہنے کا معاہدہ رائیگاں ہی گیا۔
”اول تو الیکشن میں کھڑے رہنا ہی آپ کے لیے مشکل ہے اور اگر وہ بھی گئے تو مجھے سو فیصد یقین
ہے کہ جلد ہی بیٹھ جائیں گے۔ میں اس پر شرط بھی لگا سکتی ہوں۔“
میں جانتی ہوں کہ اس وقت کے حساب سے یہ بہت بڑا دعویٰ تھا مگر مجھے اس وقت وہ بہت برا لگتا تھا
لہذا میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھی۔
”سوچ لیجئے مس روشنائے! کیونکہ ناکام ہونے کی صورت میں آپ کو وہی کرنا پڑے گا جو کہ میں کر
گا۔“ وہ تو جیسے اپنی جیت کفرم کیے بیٹھا تھا۔

”مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں ہار آپ کی ہی ہوگی۔“ میں نے ہر
اطمینان سے کہا تھا اگر پروٹو وہ تھا تو پریقین تو میں بھی تھی۔
”ہار میری نہیں ہوگی بلکہ ”ہار“ میرے ہوں گے اور وہ بھی فتح کے۔“ وہ مسکرایا تھا۔
”مگر مجھے وہ فتح منظور نہیں ہوگی کیونکہ اس میں آپ میرے ساتھ شامل نہیں ہوں گی۔“
مجھے اس کی چالاکی پر ہنسی آگئی تھی جسے میں نے ضبط کر لیا تھا۔
”اب خواخواہ میرے کندھوں پر رکھ کر بندوق تو مت چلائیں۔“
”تو پ چلا دیں۔“ اس کا اندازہ دوستانہ تھا۔ وہ ناقابل اصلاح تھا میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہ
ہوئی تھی جب وہ بولا تھا۔

”ویسے ایک بات ہے آپ مانیں یا نہ مانیں ہماری صحبت نے آپ کو باتیں کرنے کا فن سکھا
ہے۔“
”اف.....“ میرا دل چاہا اپنا سر پیٹ لوں اس شخص کو ہر کریڈٹ اپنے سر لینے کا خطہ تھا۔ اب میرا
حاضر جوابی کبھی وہ اپنی ہی کرم فرمائی سمجھ رہا تھا۔

”ہر برا کام شیطان کی صحبت ہی سکھاتی ہے۔“ میں طنز سے مسکرائی۔
اب وہاں مزید ٹھہرنا میرے لیے مشکل تھا اور اپنے پیچھے میں نے سکندر کو ہستے سنا تھا۔

+

سکندر کی مستقل مزاجی پر میں جتنا بھی کڑھتی وہ کم تھا۔ ہمیشہ تنہا یا کردہ مزید شیر ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا
کہ اس نے کبھی کوئی غیر اخلاقی حرکت یا بات کی ہو۔ مگر مجھے اس سے چڑھی تھی جو اس کی حرکتوں پر حیرت

وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس سے دوستی کرنا اب میری مجبوری تھی چاہے میرے دل میں اس کے ساتھ
ناپسندیدگی تھی مگر اب اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو واپس پلٹ جانے سے قبل ہی مجھے تھا تاہم میری مجبوری تھی۔
کا تھا ضابطہ بھی تھا اور میری مجبوری تھی۔

میرا ایک پوائنٹ اس شخص کے ہاتھ لگ چکا تھا اور اب اس کی بات نہ مان کر میں اپنے آپ کو
کلباڑی نہیں مار سکتی تھی۔ میری انکار کی صورت میں میرے ہی خلاف کچھ ایسی باتیں ڈپارٹمنٹ میں پہنچا
جاسکتی تھیں جنہیں بنیاد بنا کر مجھے با آسانی rustigate کیا جاسکتا تھا۔

پھر میں نے خود کو سکندر کی شخصیت کے مثبت پہلو دکھا کر مطمئن کر لیا تھا۔ وہ اتنا بھی برا نہیں تھا
میں سوچتی تھی۔ اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو میرے لیے باعث شرمندگی ہوتی ہو۔ ہاں وہ بار بار
میرا مخاطب کرتا تھا۔ تو یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی اور لڑکے بھی مجھے بار بار مخاطب کرتے تھے اور ان کی
میرا ستر لہو تھا۔ جس کی اسکول میں پھر کالج کی لڑکیوں سے لے کر ٹیچرز تک معترف تھیں۔

ہاں سکندر کی ایک خامی بہت نمایاں تھی اور وہ تھے اس کے زبان زد خاص و عام فحش زبان۔
یہاں بھی خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کون سا اس کے ساتھ کوئی افیئر چلا تا ہے۔ میں اس سے
ہی عام سی دوستی کروں گی جیسے دولڑکوں کی دوستی ہوتی ہے یا دولڑکیوں کی..... لیکن میری یہ غلطی تھی۔
بھول گئی تھی صنف نازک اور صنف قوی کے درمیان کبھی بھی ”دوستی“ نہیں ہو سکتی۔

”مرد“ مرد ہوتا ہے اور ”عورت“ عورت ہوتی ہے۔
اور جہاں کہیں مرد اور عورت اکٹھے ہوتے ہیں وہاں شیطان بھی ضرور ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ
تہائی۔

مقررہ وقت پر چرب میں ڈپارٹمنٹ کے باہر پہنچی تو وہ کار سے ٹک لگائے کھڑا تھا اور مجھے دیکھ کر
سیدھا ہو گیا تھا میں خاموشی سے جا کر اس کی کار میں بیٹھ گئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔
”روشانے“ اس نے ہولے سے مجھے پکارا تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر کچھ بول؟
سکتی تھی۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اپنی کم پائنگی پر رونا بھی۔

اس نے مجھے پھر پکارا تھا اور اب کی بار میں نے پھر جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تمام باتیں جو میں بولنا
آتی تھی میرے ذہن میں گنڈ بونگئی تھیں۔

”تم کیا چاہتے ہو اسکندر؟“ اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے میں نے کہا تھا میں جو کہنا چاہتی تھی
نے نہیں کہا تھا مجھے اس وقت بہت زیادہ رونا آ رہا تھا۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں۔“
”کیا.....“ سکندر کی بات میرے لیے اتنی غیر متوقع تھی کہ میں ششدری اسے دیکھ رہی تھی۔

میری حیرت پر وہ بہت دلکشی سے مسکرایا تھا۔

”کیوں؟ کیا میں تمہیں نہیں چاہ سکتا؟“

”میں اب بھی خاموش رہی تھی۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا حالانکہ اس کی آنکھیں مجھ سے
میں اب کچھ کہہ رہی تھیں جو میں آج تک سن نہ سکی تھی۔

”کیا کسی کو پسند کرنا غلط ہے؟ کسی سے دوستی کی چاہ کرنا غلط ہے؟ دیکھو روشا نے میں یہ نہیں کہتا کہ تم
”اس کے لہجے میں خاصی عاجزی

میری چاہ کا جواب مثبت دو مگر دوستی..... دوستی کرنے میں کیا برائی ہے۔“ اس کے لہجے میں خاصی عاجزی

تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم مجھے ناپسند کرتی ہو۔ بہت بری سوچ ہے تمہاری میرے بارے میں۔ لیکن
”اس کی بیوی اس برے شخص نے زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کو اس قدر مسلسل سوچا ہے۔“ اس کی

روشانے..... بیوی اس برے شخص نے زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کو اس قدر مسلسل سوچا ہے۔“ اس کی

تمام باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

”تم میرے origin سے واقف ہونے کے باوجود مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے جھجکتے

ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔“ کچھ سوچتے رہنے کے بعد ایک گہری سانس کی صورت پہ ہاں اس کے منہ سے باہر آئی

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم کہاں سے تعلق رکھتی ہو یا تمہارا ماضی کیا تھا؟ یا تمہاری ماں یا نہیں کیا کرتی

ہیں۔ مجھے سرے سے ان باتوں کی پروا ہے ہی نہیں کیوں کہ تم میرے لیے اہم ہو اور کوئی نہیں بلکہ میں تو ان

باتوں کا حوالہ بھی نہیں دیتا چاہتا تھا وہ تو بس..... بے اختیاری میں آئی ایم ساری روشا نے! میں جانتا ہوں

میری باتوں نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن تم سے دوستی کرنے کا مجھے صرف

ایک ہی راستہ نظر آیا تھا۔“

اس کے لہجے میں شرمندگی اور معذرت خواہانہ انداز بھی کچھ میرے لیے عجیب تھا۔

لیکن عورت ہمیشہ مرد کے ذلیط روئے سے مار کھاتی آئی ہے اور میں بھی ہار گئی تھی۔ مجھے اس کی

اکثر باتوں پر خوشگوار حسرت ہوتی تھی۔

میرے سامنے بالکل ایک نیا سکندر بین حیات تھا جو اس سکندر سے بالکل مختلف تھا جو اب تک میں

نے ڈپارٹمنٹ میں دیکھا تھا اور لوگوں سے سنا تھا۔

میں نے اس سے دوستی کر لی تھی اور اس بات کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا کہ میں واقعی اس روز ہار گئی تھی

لیکن کاش میں یہ بھی اسی روز جان لیتی کہ کتنا جلدی پلٹ کر حملہ کرتا ہے جب آپ کا پاؤں اس کی دم کو چکاتا

ہے یا آپ کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں جھانک کر چلیج کرتی ہیں۔ میں نے یہ دونوں کام ہی نادانستہ

کے کر دیے تھے۔

میں نے اسے لچ کی آفر کی تھی اور یہ میری منزل کی جانب پہلا قدم تھا۔

سب سے زیادہ جو آوازیں میں نے سیں وہ گھنگھر دوں کی چھٹکار تھی، کبھی طبلے کی آواز سے ہم تو کبھی ہارمونیم کے سروں سے رچی ہوئی۔ نتیجتاً مجھے ان آوازوں سے نفرت ہو گئی۔ مجھے اپنے اندر نفرت ہو گئی اور کبھی کبھی تو مجھے خود سے بھی نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔ جب جب اپنی خوبصورتی کا ہوا اپنا چہرہ خود ہی داغنے کو دل چاہتا تھا مگر میں اتنی بہادری کبھی نہیں دکھا سکی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ میرا باپ کون ہے اور یہ تو شاید میری ماں بھی نہیں جانتی تھی اسے تو بس کہ خدا نے اس پر خاص مہربانی کرتے ہوئے تین خوب صورت بیٹیوں سے نوازا ہے۔ جو حسین ہو۔ ساتھ ساتھ خوش گلو بھی ہیں۔ ہر ماں کی طرح انہوں نے ہم تینوں کو بہت پیار سے پالا تھا۔ یہ سوچے کہ اب بڑھاپے میں انہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ ان کی دونوں بڑی بیٹیوں نے ان کی اد پوری کی تھیں۔ ان دونوں کی وجہ سے ہمارا انداز رہائش، ہمارے مخصوص علاقے کے باشندوں سے قدر بہتر تھا۔ ہم ان میں بہت خوش قسمت تصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن رما اور ربکا کی طرح میں نے دنیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میری ماں جنہیں ہم آپا جان کہا کرتے تھے بہت پریشان تھیں مگر انہوں نے میری بات مان لی تھی۔ میں ان کی سب سے لاڈلی بچی تھی مگر اس کے باوجود اس ماحول میں رہنا میری تھی۔ تبھی میں نے ”گاما“ شروع کر دیا۔ اکثر محفلوں میں میں گاکر بہت کچھ حاصل کرتی تھی۔

دراصل ہمارے یہاں آنے والے لوگوں کی مختلف ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔ کچھ عورت چاہتے ہیں عورت کی آواز..... مجھے اسی چیز نے فائدہ پہنچایا تھا اور جسم فروخت کرنے کی بجائے آواز فروخت کر۔ ترجیح دی تھی۔ حالانکہ اپنے اس فیصلے پر ثابت قدم رہنے کے لیے میں نے بہت سے تردد کیے تھے۔ موسم بہار کی دس چھٹیاں گزارنے میں لاہور آئی تو آپا جان مجھ پر برسے کو تیار بیٹھی تھیں۔

”کیا سوچا ہے تم نے..... آخر کرنا کیا ہے؟ کیسے گزرے گی زندگی؟“

”کرنا کیا ہے آپا جان! ایم اے کر رہی ہوں ذرا ڈگری ہاتھ میں آ لینے دیں پھر میں اچھی نوکری کروں گی اور بس۔“ میں نے بڑے آرام سے انہیں اپنے آئینہ منسوبے سے آگاہ کیا۔

”ہاں جیسے نوکری دینے والے تو بس اسی انتظار میں بیٹھے ہیں کہ تم ڈگری دکھاؤ اور وہ نوکری ملے۔“ رکھ کر تمہیں دے دیں..... ہونہ۔..... کسی خوش فہمی میں مت رہنا بی بی! آج کل نوکری دینے والے کم ڈگری نہیں شکل دیکھتے ہیں۔ ایم اے کو مارو کوئی تم تو اگر دس جماعتیں پڑھ کر بھی نوکری مانگتے جاتی ہو۔

”میری کی بکری کی جلد مل جاتی اور پھر.....“

”آپ کی باتیں کر رہی ہیں آپا جان۔“ ان کا جلاکتا انداز مجھے الجھن میں ڈال گیا تھا۔

”میری کی باتیں تو نہیں کر رہی۔ ساری ہی کچی باتیں ہیں۔“ انہوں نے پھر ترخ کر کہا تھا پھر خاموش ہو گئیں۔

”انہوں نے سرائیوں میں گرا لیا تھا۔ یہ ان کا غصہ کم کرنے کا نسخہ تھا۔“

”ان کے ذہنی فٹنار کی بنیادی وجہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔“

”روشن! ہم جیسی عورتوں کے لیے تو عزت بھری زندگی کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہوتا ہے..... میں اپنی ہوں کہ تمہیں واقعی عزت کی زندگی مل جائے اور اس کے لیے تمہیں خود ہی تھوڑی بہت کوشش کرنی پڑے گی۔“ کافی دیر بعد انہوں نے کہا تھا۔

”اس سے پہلے کہ مناسب وقت گزر جائے کچھ سوچ لو۔“

”مثلاً کیا؟“

”میرا ذہن میں پڑھتی ہو تم، کوئی نہ کوئی ایسا شخص تمہارے حسن سے متاثر تو ہوگا۔“

”لیکن.....“ میں نے کہنا چاہا مگر انہوں نے مجھے ٹوک دیا تھا۔

”مجھے چاہے کہ تم ایسا نہیں چاہتیں لیکن کوئی بھی شریف شخص اتنی آسانی سے تم سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔ یہ مرد خود چاہے کہ سا بھی ہو مگر عورت پر شریف گھرانے اور شرافت کا ٹھپا ضرور ہی دیکھنا چاہتا ہے اور..... اور تمہاری پاس یہ ٹھپا نہیں ہے۔ اصول بدلنا مشکل ہوتے ہیں لیکن ناممکن نہیں۔ تمہاری

نہ صرف مورتی تمہارا پس پوائنٹ ہے۔ اپنے اصول بدل کر اسی پس پوائنٹ کو استعمال کرو میری جان! ہرگز کوئی ایسا شخص جو تمہاری خوب صورتی سے ہی اتنا متاثر ہو جائے کہ کسی اور چیز کو اہمیت ہی نہ دے۔ تم سے محبت کرے اور تم سے شادی..... شادی کر کے تمہیں عزت کی زندگی دے دے۔“

”میں تمہیں چاہتا ہوں۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کہاں سے تعلق رکھتی ہو۔“

”تم میرے لیے امپورٹ ہو اور کوئی نہیں۔“

”آپا جان کی آواز کے بعد جو آواز میرے کانوں میں گونجی تھی وہ سکندر زمین حیات کی تھی۔“

”میرا میری نگاہوں نے اس کے انداز کا دارفتہ پن دیکھا تھا۔“

”میں مگر اسے لگی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آپا جان کے خدشات رائیگاں جائیں گے۔“

میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ اتنے واضح اظہار

کے بعد اگرچہ کسی مزید بات کی ضرورت نہیں رہ جاتی مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی اس کے بعد اس نے
دونوں میں ہماری دوستی خاصی پروان چڑھی تھی۔

مگر جو کچھ مجھے چاہیے تھا اس کے لیے صرف دوستی کافی نہیں ہوتی مجھے "دوستی" سے کون سا
حاجت تھی اور جو کچھ مجھے چاہیے تھا وہ میں بارہا سکندر مبین حیات کی نگاہوں میں دیکھ چکی تھی۔
معنی جملوں سے سمجھ چکی تھی اور اسی بات نے میری امید بندھنی تھی۔

مگر مجھے لفظوں کی ضرورت تھی جو اس کی نگاہوں کی تحریر کو جملوں میں ڈھال کر مستحضر بنادیا
معنی اور پرواز جملے ہوں جن سے کسی قسم کا جھول ہی باقی نہ رہے۔

اور یہ صرف اسی صورت ممکن تھا جب میری جانب سے بھی کوئی پیش قدمی کی جائے۔ میں باوجود
بلکہ مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے اپنے لیے کوئی حد بندی کر رکھی ہے تو اس کی واحد وجہ صرف میرا
رویہ تھا تبھی میں نے اپنے اصولوں میں چند ترامیم کر لی تھیں۔

ہم سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پر، کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کے لیے
اصول ضرور بدلتے ہیں۔ کبھی یہ ہماری مجبوری ہوتی ہے تو کبھی ہمارے شاطر ذہن کا "مفید مشورہ"
شاطر ذہن نے بھی ایک صحیح منزل کے حصول کے لیے ایک نسبتاً نیا حارستہ اختیار کرنے کی صلاح دے
مگر کاش میں جان سکتی کہ یہ مفید مشورہ میرے لیے ایک ایسا موثر راستہ ثابت ہوگا جس میں پاؤں پا
مجھے منہ کے بل گرنے پڑے گا۔

اس روز وہ مجھے لاٹک ڈرائیو پر لے جا رہا تھا اور اتفاق سے اپنا موبائل گھر بھول آیا تھا۔
وہ مجھ سے اجازت مانگ رہا تھا تاکہ گھر سے موبائل لے سکے۔ میں نے اسے ایسا کرنے کی اجازت
دے دی تھی اور یوں مجھے پہلی بار اس کا اپارٹمنٹ دیکھنے کا موقع ملا۔

میں قیمت ڈیکوریشن پیسر، قیمتی پینٹنگز اور وال پیپرز سے مزین دیواروں والا بے حد
اپارٹمنٹ تھا۔ وال ٹیو وال بچھے قیمتی پینڈ میڈ کارٹس پر قدم رکھتے ہوئے میرے دل میں واقعی ایک
بھرتی گئی تھی۔ ایسے شاندار اپارٹمنٹ میں قیام کرنا کتنا پر لطف ہوگا؟ اگرچہ ایسا قیمتی اور آٹھ گھنٹے
گھر میرے خوابوں کا حصہ نہیں تھا لیکن اگر وہ میری قسمت بن جاتا تو اس میں برائی کیا تھی۔

واپسی کے وقت میں خاصی مسرور تھی۔ ایک ایسے شخص کی نگاہوں اور انداز میں اپنے لیے
عزت دیکھنا، جس کے لیے آپ اپنے دل میں بھی پسندیدگی محسوس کر رہے ہوں۔ یقیناً خوش آجیبتا
میں سکندر مبین حیات کے ساتھ تنہا تھی۔ وہ جو بھی چاہتا یا آسانی میرے ساتھ کر سکتا تھا۔ لیکن ان
کچھ بھی نہیں کیا تھا بلکہ اس نے تمام وقت ہمارے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا تھا۔ اس نے مجھ پر
نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ مجھے اس کی نگاہوں میں پاکیزگی ہی پاکیزگی نظر آتی تھی۔

میرا آپ کے خیال میں کردار کی مضبوطی کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ آنکھ کے علاوہ اور کوئی ہو سکتا ہے؟
+

اسید بھائی سے دوستی میری پلاننگ کا حصہ نہیں لیکن اسے ایک اہم موزر ضرور کہا جاسکتا ہے۔
مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر رقابت میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہاں! جو کچھ میں نے اس کی
جگہ اور انداز میں دیکھا۔ اسی رقابت کے علاوہ کچھ بھی کہنا غلط ہے۔

انہوں نے مجھے خاصا مزہ دیا تھا۔ یوں میں نے جان بوجھ کر اسید
لیکن اس کے علاوہ اس کی کلبلاٹ نے مجھے خاصا مزہ دیا تھا۔ یوں میں نے جان بوجھ کر اسید
بھائی کے ساتھ کچھ مزید وقت بتایا محض سکندر کو دکھانے کے لیے۔ اور نتیجتاً میری خواہش کے عین مطابق
تھا اس کی حد درجہ پوزیشن نے مجھے اندر تک پرسکون کر دیا تھا۔ ظاہر ہے جذبہ رقابت وہیں ابھرتا ہے
جہاں محبت ہو۔

کوئی تھا جو میرے دل میں رہتے ہوئے دماغ کے در پر متواتر دستک دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔
"سکندر مبین حیات تمہارا دیوانہ ہے۔"

مجھے دنیا کبھی اتنی اچھی نہیں لگی جتنی ان دنوں لگنے لگی تھی۔ ایک برے ماضی کے بعد پرسکون حال
گزارتے ہوئے یہ احساس ہر پہلے میرے ساتھ رہنے لگا تھا کہ ایک شاندار مستقبل میرا منتظر ہے۔ مجھے اپنی
اظہار کی بھی اتنی پروا نہیں رہی تھی۔ ہائیر اسٹڈیز کا صرف ایک مقصد تھا۔ "اچھی پرائسز نو کری" تو جب
ہائیر اسٹڈیز کی میری ہونے والی تھی تو پھر مجھے خواہ مخواہ دماغ کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں اور سکندر..... ہم دونوں کا ہی ارادہ اگلے سال امتحان دینے کا تھا لیکن ہماری ملاقاتیں ڈپارٹمنٹ
میں جاری تھیں۔ ایک ایسی ہی ملاقات میں، میں نے اسے سگریٹ پیتے دیکھا تھا اور اس کا انداز اسے
راہزن اس کو ظاہر کر رہا تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی ظاہر ہے کہ اپنی بے خبری پر۔

وہ گاؤں جا رہا تھا اور جانے سے پہلے ایک کام مجھے سونپ گیا تھا۔ نیو ملتان میں اس نے گھر خرید لیا تھا
پھر اس کا تھیر میجر سے ڈے لگا گیا تھا۔ حالانکہ یہ میرے لیے بہت بڑا کام تھا اور میں نے انکار بھی کیا تھا
لیکن چونکہ وہ میرے انٹیریئر ڈیزائننگ کے کورسز کے متعلق جان گیا تھا اسی لیے یہ کام میرے ذریعے ہی
کرانا چاہتا تھا۔

"نوٹنی! تم میرا اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتیں۔"

اس نے غصے سے کہا تھا اور میں اسے خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی خفگی برداشت بھی نہیں کر سکتی
تھی میرے لیے تو ایسا سوچنا بھی مشکل تھا کیونکہ آپ ہر اس شخص کی خفگی سے خائف رہتے ہیں جس سے
آپ محبت کرتے ہیں۔

اور میں سکندر زمین حیات سے محبت کرنے لگی تھی۔

میری اس کے ساتھ واسطی بڑھتی جا رہی تھی اور اس میں میرا کوئی دانستہ عمل دخل نہ تھا۔ میری اختیار کی کیفیت تھی جو مجھے کھینچ کر اس کے نزدیک کرتی جا رہی تھی۔ مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ میری اس سے فون پر باتیں کرتی رہتی تھی۔ ہر فارغ وقت میں اسے ہی سوچتی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں سے شیز کرنے لگی تھی اپنے دل کا غبار اس کے سامنے نکال کر مجھے خاصا سکون ملتا تھا۔ اس کے لمبی آنکھوں میرے لیے مرہم ثابت ہوتے تھے۔ وہ بتا کہے بھی میرے اضطراب کو بھانپ لیا کرتا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔

میں ربا کے لیے حقیقتاً بے حد پریشان تھی فلموں میں کام کرنے کی خواہش نہ جانے کیسے اس شخص کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔

میں نے اپنے دل کی ساری بھڑاس سکندر کے محض ایک بار پوچھنے پر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ میں نے کہا تا وہ میرا دوست تھا، میری محبت تھا۔ اس کے الفاظ میری تسلی و تسفی کا موجب ہوا کرتے تھے۔ اس نے میری توقع کے عین مطابق تسلی دی بلکہ یہ ہی نہیں میرے یہ کہنے پر کہ عورت ہمیشہ ایک گرا خواہش کرتی ہے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں بھی ایک گھر چاہتی ہوں اور ظاہر ہے کہ میں بھی ایک الگ تونہ تھی اور تب..... ہاں تب..... اس نے وہ کہا جو میری توقع کے لیے بہت برا خوش آمدند چکا تھا۔ ”اور اگر وہ گھر تمہیں میرے حوالے سے ملے تو کیا تم وہ گھر قبول کر لو گی روشتی؟“

مجھے یاد ہے..... مجھے سب یاد ہے..... حرف بہ حرف اور مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ اس بل اس کی گارڈ میں آس و زناش کی کتنی بے چیدیاں تھیں۔ وارنٹی کی کتنی حکایتیں تھیں۔ رد کیے جانے کا کیا ذخیرہ ہوا تھا مجھے یوں لگا تھا گویا وہ اپنا کشکول لیے میرے سامنے بیٹھا ہوا اور اگر میں نے اس کشکول کو نہ بھرا تو وہ مر جائے گا۔

میں نے ہاں کہہ دی میں واقعی بیان نہیں کر سکتی کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔ وہ وہ بات کہہ رہی تھی جو میں اب تک سننے کو بے چین تھی۔

”بتاؤ ناروشتی! کیا تم وہ گھر قبول کر لو گی جو کہ میرا بھی ہو۔“

اور یہی تو میں چاہتی تھی یہی حوالہ تو میری تنہا تھی۔ میری سن چاہی زندگی بس مجھ سے ایک بات..... فاصلے پر ہی تھی۔ ان دونوں میں ہر بل بس اسی خوب صورت دور کو اپنے خیل میں مجسم کیا تھا۔

دور روز بعد شام میں سکندر کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ ہاسٹل کے باہر میرا انتظار تھا۔ کچھ دیر قبل تبدیل کیے تھے یہی نیم گیلیہ بالوں کو ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی میں باندھ کر میں باہر آئی۔ وہ خوشگوار ہو رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے سے بادل تھے اور ہوا چل رہی تھی۔

”تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“ کار میں بیٹھتے ہی میں نے اس سے پوچھا تھا۔ کار اشارت کرتے ہوئے ایک مہر پرور نگاہ مجھ پر ڈالی تھی۔

”جیسے دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔“ میری پلکیں فوراً جھک گئی تھیں۔ کسی مرد کے منہ سے ایسی بات نہ پہلے کہہ رہا تھا۔ یکدم مجھے اس سے بے تحاشا جھجک محسوس ہونے لگی تھی اور اسی جھجک کو دور کرنے کی زحمت میں نے پوچھا تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں سکندر؟“

”ہم کلاس پار، فیلے مگن میں، ستاروں کے جھرمٹ.....“

”کہیں کوئی نشہ تو نہیں کر رکھا۔“ اس کے قطعی غیر سنجیدہ انداز پر میں نے مصنوعی فکر مندی سے پوچھا۔

”او۔۔۔۔۔“ وہ ہنسا تھا۔ ”تمہارے خیال سے برا نشہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔“

میں نے باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا کچھ دیر بعد جب کار کی تو ہم اسی اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے تھے کہ کچھ دیر قبل میں نے سکندر کی فرمائش پر ڈیکوریٹ کیا تھا۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

ظاہر ہے کہ میری حیرانی بجا تھی۔ سکندر نے جواب دیے بتائے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

”ٹائیڈ کوئی خامی رہ گئی ہو۔“ میں سوچتے ہوئے اندر آئی مگر وہاں کوئی خامی نہیں تھی سارے گھر میں بڑے بڑے کھانے ہوئے سکندر نے وہاں کی کلر اسکیم سے لے کر پلانٹس سینگ تک کی بے حد تعریف کی تھی اور سب سے آخر میں وہ میری طرف پلٹا تھا اور میری حیرانی پر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ گھر میرا تھا لیکن اب نہیں ہے۔ یہ گھر آج سے تمہارا ہے روشتی! صرف اور صرف تمہارا۔“

اس نے میرے ہاتھ پر گھر کی چابیاں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں پہلے تو اس غیر متوقع بات پر سناکتا تھا کہ وہ گھر میرا تھا لیکن اب نہیں ہے۔ یہ گھر آج سے تمہارا ہے روشتی! صرف اور صرف تمہارا۔

”مجھے اتنا زحمت کر لینے دو سکندر کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں، اور میرے دل کو کبھی اس بات پر پچھتاوا نہ ہو کہ میں نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا تھا۔“

”مجھے اتنا زحمت کر لینے دو سکندر کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں، اور میرے دل کو کبھی اس بات پر پچھتاوا نہ ہو کہ میں نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا تھا۔“

”تم میرا احسان ایک طرح سے اتار سکتی ہو روشتی!“ میرے گال اپنی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی تو وہ ایک دم بے حد مصومیت سے بولا

صبح میری آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ چند لمحوں میں یہی نہیں سمجھ سکی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ گویا ایک کرنٹ سا خون کے ساتھ ہی دوڑا تھا اور میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

ایک دم سے زیاں کا شدید احساس ہوا تھا۔ میری حماقت مجھی کو لٹا ڈری تھی۔ محض کچھ لمحوں کی سیر کے لیے میں نے وہ کر لیا تھا جو اب تک نہیں کیا تھا۔

اپنی ہی سوچ میں گم مجھے سکندر کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔

”گڈ مارنگ۔“ میرے قریب بیٹھے ہوئے اس نے میرے گال کو بہت نرمی سے چھوا تھا اور میں نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔ مجھے اس سے بے تحاشا جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت میرا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔ کچھ گناہ کے احساس سے اور کچھ شرم سے۔

”سکندر! کل رات جو کچھ ہوا.....“ بہت دیر بعد میں بولنے کے قابل ہوئی تھی مگر سکندر نے میری بات قطع کر دی تھی۔

”وہ سب بہت ہی مسکون کن تھا۔ بیوی کل کی رات میری زندگی کی سب سے یادگار رات تھی۔“ اس کے انداز میں واقعی حیرت میں اسے دیکھتی رہی اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

”مجھے اب جانا چاہیے۔“ وال کلاک کے الارم پر میں یکدم چونکی تھی سکندر نے چند منٹ کے وقفے سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے اسے کہتے سنا تھا۔

”ہاں..... نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں رات بھر ہاسٹل سے باہر رہی ہوں اگر وارڈن کو ہٹا چل گیا تو ایسے میں تمہاری موجودگی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس وقت سکندر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ میں نے اسے روٹین کے انداز میں لیا تھا۔ میں واقعی بھول گئی تھی کہ رات اس نے کیا کہا تھا۔

ہاسٹل میں سب خیر خیریت تھی۔ میری روم میٹس ویک اینڈ گزارنے اپنے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں جبکہ ارد گرد میں میری کسی سے کچھ خاص صاحب سلامت بھی نہ تھی مجھے ایک گونا سکون حاصل ہوا تھا۔ لیکن سکون وقتی ہی تھا اگلے دو دن میں نے ایک عجیب سی الجھن میں گزارے تھے۔ اب تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عجیب احساس، احساس گناہ نہیں بلکہ احساس زیاں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میرا بے حد جتنی مجھ سے الگ ہو گیا ہے۔

بہت زیادہ سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مجھے سکندر سے بات کرنی چاہیے کہ ہر حال میں

ہمیں ہر شے کا

ب کچھ ٹھیک تھا سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ میرے سامنے میرا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی اس کی باتوں میں محبت تھی۔ میرا دل چاہا ہاں لحوں کو اپنی مٹیوں میں قید کر کے کہیں نہ جانے دوں۔

لیڈنل، خیال ہی رہا چوٹی سے ہمارے لحات میرے تھے ہی نہیں پھر انہیں میں قید کیسے کر سکتی تھی۔ میری شادی کے ذکر پر وہ یوں بھڑک گیا تھا جیسے میں نے کوئی بہت غیر معمولی یا احمقانہ بات کر دی۔ اس کے لفظوں سے طیش کے تیر برے تھے مگر اس کا انداز بے حد سرد اور تحقارت آمیز تھا۔ اس تمام

دلے میں میں نے پہلی بار اسے اس انداز میں بات کرتے دیکھا تھا۔

میں اس کی باتوں میں سن کر اس کے خیالات اپنے بارے میں سن کر حقیقتاً ساکت ہوئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا کہ اس میں جب بھی ملی میں نے اس کے انداز میں محبت اور پسندیدگی محسوس کی مگر آج.....

”اور حیرت تو مجھے تم پر ہے۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں یعنی سکندر زمین حیات تم سے شادی لے گا..... ہائی فائیو جیسی عورتوں کو وقتی طور پر تو بیڈ روم کی زینت بنایا جاسکتا ہے مگر حوصلوں کی زینت لہذا جلد از جلد اپنی شکل یہاں سے گم کرو۔ چار دن کے تعلق کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم سے نکاح لیا جاوے۔ ایک گھر کی ڈیباڑہ کی تھی تم نے اور وہ میں تمہیں دے چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کی امید نہ تو مجھ سے رکھو اور نہ ہی میں تمہیں دوں گا۔“

مجھے اپنے بیڈ روم سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی مزید کھڑے رہنا گویا ناممکن ہی تھا میں گھٹنوں کے بل لیٹ کر گری گئی۔ میرے گھٹنوں پر خاصی زور وار ضرب لگی تھی مگر یہ تکلیف اس اذیت سے کم تھی جو میرے دل کے اطراف میں سرخ آندھ کی طرح دھماکے ڈال رہی تھی۔ میرے سینے میں سانس اکٹ گیا تھا اور جھنجھٹاؤں میں بھڑک رہی تھیں۔

”تمہیں تم کو سکندر! خدا کے لیے یوں مت کہو..... تم تو میری مسکراہٹ کی تعریف کرتے تھے۔“

”میں نے تم سے سکندر! تم کہتے تھے تم مجھ سے شادی کرو گے..... تم نے کہا تھا تم مجھ کو چاہتے ہو۔“

”میں نے تمہیں اس سے کچھ خاص صاحب سلامت بھی نہ تھی مجھے ایک گونا سکون حاصل ہوا تھا۔ لیکن سکون وقتی ہی تھا اگلے دو دن میں نے ایک عجیب سی الجھن میں گزارے تھے۔ اب تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عجیب احساس، احساس گناہ نہیں بلکہ احساس زیاں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میرا بے حد جتنی مجھ سے الگ ہو گیا ہے۔“

میں خاموش رہی میں بول سکتی بھی نہیں تھی۔ لوٹ لیے جانے کا شدید احساس مجھے مرنے کی گھنٹی بجاتا رہا اور وہ..... وہ بولتا ہی جا رہا تھا بے رحمی سے، بے گناہی سے، نفرت سے اور حقارت سے۔
 ”میں تمہاری مسکراہٹ کی تعریف بھی کرتا تھا۔ میں اب بھی تمہاری مسکراہٹ کی تعریف کرتا ہوں۔
 کرتا بھی رہوں گا مگر صرف مسکراہٹ اچھی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ایک طوائف سے شادی کروں گا۔ میں نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ کہ تم سے شادی کروں گا۔ مگر تمہیں جو ایسا سوچتی تھیں..... میرا کیا دماغ خراب ہے کہ ایک ایسی عورت سے شادی کروں گا۔ مگر تمہیں
 ”مجھے طوائف مت کہو سکندر.....!“ میں نے التجا کی تھی مگر وہ اس بے رحمی سے بولا تھا۔

”پھر کیا کہوں قاطعہ جناح، مدرٹریسا یا مقدس مریم۔“ اس کے انداز میں اتنا خطر تھا کہ میں کن گئی تھی میں نے پہلی بار اپنے اندر غصہ محسوس کیا تھا۔
 ”نہیں تم کچھ بھی مت کہو بلکہ ان پاکیزہ عورتوں کے نام بھی مت لو جن کی عزت نہیں کر سکتے ہیں۔
 نام بھی تمہاری زبان سے ادا نہیں ہونے چاہئیں۔“
 ”ارے واہ عزت کی بات کرتی ہو۔“ وہ استہزاء سے ہنسا تھا۔

”تم بھول رہے ہو سکندر زمین حیات! کہ اسی طوائف کو تم اپنے بیڈروم تک لے جا کر اپنی ہوس کر چکے ہو۔“ میں چیختی تھی۔

”نہیں روشن آرا بیگم! میں نہیں بلکہ تم بھول رہی ہو کہ میری ہوس کو بھڑکایا بھی تو تم ہی نے۔ کیا کیا..... عورت ایسا ہی کرتی ہے پہلے ہماری پیاس بھڑکاتی ہو اور جب ہم پیاس بجھالنے کا انتظام کر لیں تو سارا الزام ہمارے سر ڈال دیتی ہو اور یہ بیڈروم میں لے جانے کی بات بھی خوب کی تم نے۔ میں تمہیں گن پوائنٹ پر بیڈروم تک لے گیا تھا۔ اگر تم ایسی ہی فرشتہ مفت اور پاک باز تھیں تو میرے گھر کیوں آتی تھیں میں تو اچھا آدمی نہیں تھا۔ تم تو میری عزت نہیں کرتی تھیں۔ یہی خیالات ہوا کرتے تھے تمہارے میرے بارے میں؟

میں نے تمہیں کبھی مجبور نہیں کیا تھا اپنے گھر آنے کے لیے تم ہر بار اپنی مرضی سے آتی تھیں۔ برے آدمی کے گھر آتی تھیں جو کہ تمہارے خیال میں کسی عورت کو ایک گھر بھی نہیں دے سکتا۔ یہ روشن بانی! میں نے تمہیں گھر دیا اور تم نے مجھے وہ دے دیا جو کہ کسی بھی مرد کی خواہش ہو سکتی تھی۔ تمہارا خیال ہے جسم سے لباس چپکا کر اوڑھ لگوں میں رسیوں کی طرح دوپٹے ڈال کر پھرنے والی تم جیسا ہونا سے مرد محبت کر سکتا ہے؟ نہیں بی بی نہیں ایسی عورتوں سے مرد صرف ایک چیز کی خواہش کرتا ہے اور وہ ہے؟ یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے مجھے۔“

وہ ساری عورت ذات کو کھینٹ لایا تھا۔ میں نے اس روز اس شخص کے منہ سے وہ بات سنی تھی

میں نے وہ گالیاں دی تھیں جو کوئی شریف عورت تو کیا مرد بھی نہ جانے۔
 ”میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں کچھ کیسے کہتی۔ ایک شخص جو عورت ذات کو ہی عزت نہیں دے سکتا تھا جو عورت کو کبھی کے مترادف جانتا تھا اس کے نزدیک ایک ایسی عورت کی حیثیت کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بننے والی سڑی سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کے خیالات جان چکی تھی۔ اب کسی قسم کی التجا اور آس
 ہوتی تھی۔“

+

سندر خشک ہو جائیں
 تو ساری مچھلیاں بے آبرو ہو کر
 کیلے، بد مزہ کچھڑ کے ڈریوں سے نکل کر
 ساحلوں پر بے رفاقت موت مرجائیں
 کسی دن یہ بھی ہوتا ہے
 کہ سورج اپنی تنہائی کے کرب بے اماں سے ڈر کے
 گھبرا کر سوانیزے پہ آ جائے
 زمین بے آب ہو کر
 خشکی کی موت مرجائے
 ابھی تو جہیز توں کے در کھلے ہیں
 موسموں کا ذائقہ اتنا نہیں بدلا
 ابھی سورج نہیں اترتا
 کہ خود اپنے شخص سے ہی
 بوئے خشکی آئے
 چلو ہم لوٹ جاتے ہیں
 اسی فردوسِ گم گشتہ کو
 جس کو چھوڑ آئے تھے
 اسے تو ڈھونڈنا ہوگا
 مچھلیاں کے پاس اپنا سب کچھ متوا کر آتی تھی۔

میں ہونے کا کام ہے۔
کچھ دنوں بعد میں نے اپنا آپ فروخت کر کے پہلی روزی حاصل کی تھی۔

+

ابا صاحب کا بلاوا ہوتا غیر متوقع تھا رو شانے قمر کا سامنا اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ جب اس کی لڑکھوڑی کے ذرا تھوڑے میں داخل ہوئی تھی تبھی حویلی کی غیر معمولی چہل پہل نے اسے چونکا یا تھا مگر بعد میں ایک لمحے کے لیے ہوا تھا۔

ابا صاحب ہمیشہ سے بلاوجہ ہنگامی دعوتیں کرنے کے شوقین رہے تھے۔ ہر دوسرے ہفتے گاؤں کے عزیز اور درگرد کے چودھری اکٹھے کر کے اچھے خاصے پر تکلف طعام کا بندوبست کر لیا کرتے تھے۔ وہ بچپن سے ایسا ہی دیکھتا آیا تھا لہذا اسے یہ سب معمول کا حصہ لگا تھا۔ مگر جو کچھ وہاں ہونے جا رہا تھا وہ معمول کا حصہ نہیں تھا۔

ان چار مہینوں میں اس نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اگر کبھی اتفاق سے رو شانے قمر سے ملاقات ہوگئی توہ کس طرح ری ایکٹ کرے گا۔

جب عام ملاقات کے بارے میں نہیں سوچا تھا تو ایسی ملاقات کے متعلق سوچنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

اس کے تو سامان و گمان کی حدود سے بھی دور تھا کہ جس لڑکی کو اتنی نفرت و حقارت سے دھتکار چکا ہے وہ اس کی زندگی میں اتنی اہم حیثیت اختیار کر جائے گی۔

قدرت اس کے ساتھ ڈبل گیم کھیل چکی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو آگے کھینچے کھائی ہال میں حائل میں پایا تھا اور اب ہمیشہ اسے اسی درمیان میں اٹکے رہنا تھا۔ وہ کبھی آ رہا نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کی یعنی رو شانے قمر کی اصلیت سے بھی آگاہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس صحت میں خود اس کی اصلیت سے پردے اٹھ سکتے تھے۔

قلم سے پہلے اور کالج کے بعد بھی اس نے فرزانہ کو ٹھونسنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بار اس کا رد عمل ایک سالہ اس کے کسی بھی انداز سے یہ نہیں پتا چل سکا تھا کہ وہ ناخوش ہے یا اسے یہ بات ناگوار گزری ہے۔ حقیقت یہ کہ وہ حرف اعتراض اٹھا ہی نہیں سکتی تھی وہ اس سب کی عادی تھی خود اس کے باپ نے دو ٹوک جواب دیے تھے۔ پھر کچھ عرصہ قبل ہی اس کے بھائی نے دوسری بیوی کو طلاق دے کر تیسری شادی کی تھی۔ فرزانہ اس سے خاصی پرسکون اور مسرور دکھائی دی تھی۔

باکیر دلائے طرز حیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شادیوں کا تناسب چاہے زیادہ نہ ہو مگر بیویوں کا

اور پتا نہیں کیسے بناتے ہی وہ سب کچھ جان گئی تھیں۔ شاید سبھی مائیں جان جاتی ہیں۔ شاید خوشی، اپنی اولاد کا غم..... اور اس جذبے کی تقسیم نے عورت اور طوائف کا فرق روا نہیں رکھا۔ اس روز آج جان اچانک میرے سامنے آ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے صرف چند لمحے مجھے نوازش سے دیکھا تھا اور پھر جیتابی سے مجھے اپنی ہانہوں میں بھر لیا تھا۔

نجانے انہیں کس نے بتایا تھا۔ میری آنکھوں کی دھشت نے، میرے وجود کے انکھال نے، میرے لفظوں کی کیا بیانی یا جھکی پلکوں پر لکھی بے بسی کی تحریر نے۔

”میں نے تم سے کہا تھا..... کتنی بار سمجھایا تھا کچھ بھی ہو جائے مگر مرد کی بات کا یقین مت کر۔“ میں نے انہیں کہتے سنا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ سکندر مبین حیات کی جانب سے ملنے والے شادی شدہ ترین جھکے کے بعد مجھے ایسے ہی سہارے کی ضرورت تھی..... میں بے تحاشا روٹی تھی اتنا ہٹا کہ کھد سکتی تھی۔

عزت حاصل کرنے کے چکر میں، میں نے ایسی چوٹ کھائی تھی کہ اب زخم کا بھرنا مشکل تھا۔ لیکن زخم کو بھر دینا میرے لیے ضروری تھا۔ کیونکہ قطرہ قطرہ ملنے والی موت بے حد خوفناک ہوتی ہے اور میں بے بزدل تھی لہذا ایک جھکے کی موت بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

میں اور میری ماں عزت کی ”موت“ پر بین کر رہے تھے۔ عزت ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو معتبر کرتی ہے۔ اس سے قبل کم سے کم میں اپنی نگاہوں میں فخر تھی۔

میں زندگی میں پہلی بار اس طرح روٹی تھی۔

میں زندگی میں پہلی بار کسی مرد کے لیے روٹی تھی۔

کچھ دیر بعد میں اپنی ماں سے علیحدہ ہو گئی تھی۔

میں زندگی میں آخری بار اس طرح رو چکی تھی۔

میں زندگی میں آخری بار کسی مرد کے لیے رو چکی تھی۔

”میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گی میں وہ سب کام کرنے کے لیے تیار ہوں جو آپ کرتی رہی ہیں۔“

میں نے مردنی سے کہا تھا۔ ہم جیسی عورتوں کے پاس ناکامی کی صورت میں اور کوئی راستہ نہیں تھا ہمیں وہی کام کرنے پڑتے ہیں جنہیں دھتکار چکے ہوتے ہیں کہ بہر حال پیٹ کا دوڑنا ہر جگہ سے زیادہ سفاک ہوتا ہے۔

میرا فیصلہ سن کر آج جان نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ بھی مجھے عزت کی زندگی دینا چاہتی تھی مگر اپنی کوشش

تناسب ہمیشہ زیادہ رہتا ہے اور پھر بیویاں جائز ہوں یا ناجائز..... اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔ سکندر زمین حیات کی پوزیشن کو اس جائز بیوی کی وجہ سے خاصا فرق پڑنے والا تھا۔

آج شادی ہوئی تھی۔ کل کو بچے بھی ہوں گے پھر جائیداد کی تقسیم، مربعوں کا بتواہ اور کئی دیگر چاہتا تھا۔ مگر اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا وقت اس کے ہاتھ سے بچنی چھلی کی طرح نکل چکا تھا۔ سدھار کی حیثیت حویلی میں بے حد مضبوط ہو چکی تھی۔

وہ جانتا تھا دعوتوں کی طرح بابا صاحب کا ایک اور شوق بھی ہے اور وہ ہے شادیاں کرنا۔ وہ ان کے کئی کنوارے کنواریوں کو رشتہ ازدواج میں بندھوا چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں شادیاں کروانے کا شوق ہے مگر یہ نہیں پتا تھا کہ شادی کرنے کا بھی شوق ہے۔ نکاح سے کچھ دیر قبل ہی عقدہ خلا کا کرٹائی نو بابا صاحب کی ہے۔

باپ کے نکاح پر لوگوں نے اسے گلے مل کر مبارک دی تھی۔ ان سب کے انداز میں طرح طرح غالب تھا۔ دبی دبی ہنسی میں تسخر صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

یہاں تک بھی سب ٹھیک تھا اصل ہوش تو ب اڑے تھے جب وہ اپنی نئی ماں سے ملے خوب غم کیا تھا۔

اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔

+

کوئی ”بھی“ مرد کسی بھی عورت کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا جب کہ عورت خود نہ چاہے۔ سکندر نے حیات نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا اس میں میری رضا بھی شامل تھی۔ اگر آپ کو میری بات سمجھ نہیں آتی اس سطر کو تین بار پڑھیے آپ کو میری بات کا مفہوم سمجھ آ جائے گا۔

اس ”بھی“ سے پہلے میں نے ایک اور مرد کا ذکر کیا ہے اور وہ انسان سکندر زمین حیات ہے۔ شاید نادانستہ طور پر میرے نزدیک عزت کا ثانی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ میں نے دولت اور وجاہت کو غیر معمولی اہمیت دی اور سزا بھی پالی۔ تو غلطی صرف میری ہی تو نہیں تھی سکندر زمین حیات اس میں برابر کا شریک تھا۔ جب مجھے سزا ملی تو کچھ تو اسے بھی ملنا چاہیے تھا۔

ملک زمین حیات..... میری دنیا میں آنے والا دوسرا شخص اور زندگی میں آنے والا سلاخیں تھا۔ وہ میرا پہلا اور آخری گاہک بھی تھا۔ زمین حیات تک رسائی حاصل کرنے اور اسے سچا کرانے تک لانے کے لیے میں نے اور میری ماں نے کیا کیا پاپڑ بیلے وہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں جانتی تھی کہ بہت خوب صورت ہوں اور یہاں میں نے اسی خوب صورتی کو استعمال کیا تھا۔

ماں! اگر جوان ہو تو وہ یا خود کو لٹاتا ہے یا دولت کو..... کسی بھی صورت میں وہ یہ دونوں چیزیں داؤ پر نہیں لگاتا۔ عینا اگر بوڑھا ہو تو وہ اپنا آپ بھی لٹاتا ہے اور دولت بھی اور فائدہ مند صرف اس کی دولت جلتی ہے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو سونے کا دل بنا کر پیش کرتا ہے۔

میں نے زمین حیات کے سامنے خوب صورتی کا سیکول رکھا تھا۔ وہ سونے کا دل کیسے نہ دان کرتا۔

میں نے زمین حیات کے ساتھ گزار کر جب میں واپس جانے لگی تو اس نے مجھے روک دیا۔ میری ہر کوشش کا میاں

ایک ہفتہ اس کے ساتھ گزار کر جب میں واپس جانے لگی تو اس نے مجھے روک دیا۔ میری ہر کوشش کا میاں

رہی تھی۔ وہ مجھ پر اس حد تک فریفتہ ہو چکا تھا کہ نکاح کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا اور یہ میری منزل تھی

میری منزل تھی۔

مگر اب کی بار میں نے پہلے کی طرح حماقت نہیں کی تھی، ایک اچھے مستقبل کے لیے کچھ حفاظتی

اقدامات ضروری تھی۔ حق مہر میں میں نے وہ حویلی وصول کی تھی جس کی اونچی دیواروں اور پر شکوہ چلوؤں پر

سکندر زمین حیات کو مان تھا۔ شہر میں ایک بڑا شاہنگ پلازہ میرا تھا۔ ڈینس میں ایک شاندار کوشی مین

بات نے منہ دکھائی میں مجھے دی تھی۔ زیورات اور بینک بیلنس الگ تھا۔

میں نے اپنی اولاد کے لیے بھی کچھ ضروری اقدامات کیے تھے۔

میں زمین حیات کی بے حد عزت کرتی ہوں وہ حقیقتاً میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے تب عزت دی جب

میں علاقے سے لٹ پٹ تھی اور سکندر زمین حیات سے میں نفرت کرتی ہوں۔ کیوں؟ اس کی وجہ آپ

باتے ہیں۔

یقیناً آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ زمین حیات سے شادی کر کے میں نے کون سا تیر مار لیا۔

تیری تو مارا ہے۔ مجھے یاد ہیں وہ لمحات جب سکندر نے کہا تھا۔

”طوائف کو قبیح طور پر بیڑہوم کی زینت بنایا جاسکتا ہے مگر حویلیوں کی نہیں۔“

قبل اس کے۔ ”طوائف پاؤں کے نیچے رنے والی ریت ہے اسے سر پر نہیں ڈالا جاسکتا۔“ تو اس

کے اپنے نے مجھے حویلی کی زینت بنالیا ہے۔ وہ مجھے اپنے سر کا تاج بنا چکا ہے۔ لیکن اس جیسے لوگوں کو اس

ات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق صرف تب پڑتا ہے جب جائیدادوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اگر

اپنے لگا لگا کر بھلا کر اپنا نام دینے سے خائف ہوتے ہیں تو صرف ایک وجہ سے کہ کہیں جائیداد کی تقسیم کے

وقت ان کا حصہ بھی نہ نکالا پڑ جائے۔

میرے سلسلے میں نہیں ہے کہ سکندر زمین حیات نے مجھے بازاری سمجھا۔ بلکہ اس جیسے کلی کلی منڈلانے والے

بھروسے ہر عورت کو پسینے لگاتے ہیں۔ پھر بھی نبھانے کیوں ہمارے معاشرے نے عورتوں اور طوائف کی الگ

الگ جگہ بنا رکھی ہیں۔

کبھی کسی نے سوچا ہے کہ عورت تو کبھی بھی تذلیل نہیں چاہتی پھر اسے ذلت کیوں دیا جاتا ہے؟ عورت کو عورت کے حلقے سے بچنے کی بجائے بازار کی عورت کو بنانا ہے؟ جب وہ عزت چاہتی ہے تو اسے کیوں نہیں دی جاتی؟

سوال میرا نہیں بلکہ ہر اس روش نے قمر کا ہے جو ایسی ہی آگ میں جل رہی ہے۔ کئی خدا لوگ بازار حسن کی عورت کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے آپ نے کہ عورت تو وہ بھی ہے خدا کا بھی دھڑکتا ہے۔ عزت کی سانس لینا چاہتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہر گلی کے اختتام پر ایک بڑا منظر ہے جو انہیں سجا سجا یاٹین کے ڈبے جیسا مکان تو دے سکتا ہے مگر گھر نہیں۔

پھول میں خوشبو نہ ہو تو پھول کا کیا فائدہ؟ ہوا میں تر اودھ نہ ہو تو کون اسے پسند کرے! طرح انسان مکان نہیں مگر چاہتا ہے جہاں خوشیاں ہوں، محبت ہو اور..... اور عزت ہو۔

میں نے حیات نے مجھے وہ دیا جو مجھے حقیقتاً چاہیے تھا۔ میں بے حد پرسکون ہوں اور اس سکون تب اضافہ ہوگا جب جب میں اس کے سامنے جاؤں گی اور مجھ سے مل کر اس کی وحشتیں بیکر کریں گی۔

مجھے شدت سے اس دن کا انتظار ہے جب میں اس حلی کے نئے وارث کو ختم دوں گی اور حیات کی باری ہوئی شکل دیکھوں گی۔ ظاہر ہے ایک سو بیس مربعوں میں سے صرف سات مربعوں کوئی خوش آئند بات تو نہیں۔

مجھے سکندر بنیں حیات پر توں آ رہا ہے اور خود پر رشک۔ جو میں چاہتی تھی وہ میں نے حاصل کر لیا۔ ہاں مگر ایک ذلت کے بعد..... لیکن میں مطمئن میری ماں پیدا انٹی طوائف تھی۔ میں پیدا انٹی طوائف تھی کیونکہ نہ میری ماں اپنے باپ کے نام سے اور نہ میں۔ مگر میری بیٹی نہیں ہوگی۔ اس کی رگوں میں نہ صرف پاکیزہ خون دوڑے گا بلکہ ایک جھت، بین حیات کی صورت میں اس کے پاس ہوگی۔

لیکن میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ آرزو کی انتہا ہمیشہ انسان کی پاکیزہ روح کو ذلت بھری دہانے پر لے جاتی ہے۔ میں اپنی روح کو اس موت کی سفاکی سے نہیں بچا پائی تھی۔ مگر آپ کے ہاں وقت ہے اور خود مند نگاہ بھی، خود کو اس موت سے بچا لیجئے۔

لایا بھی عمر ہوئی

”آجکے مسلی ہوئی اٹھی تھی۔ کھڑکی کے کھلے پٹ سے سورج کی تر و تازہ کرنیں جیسے اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ نہایت ناگوار شکل بنائے اب وہ کھڑکی میں کھڑی سورج کی ان تر و تازہ کرنوں کو گھور رہی تھی جنہوں نے اب براہ راست اس کے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

”میں تم سے ملتی کرتی بشرطیکہ تم روزانہ نہ آیا کرتے۔ اب بھگتو روز آ جانے کا نتیجہ۔“ وہ سورج سے ہلکے ہلکے پھر دھڑ سے دونوں پٹ بند کر دیئے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس سارے مکان میں اسے ایسا ایک کڑی زہر لگتی تھی جو بد قسمتی سے تھی بھی اسی کمرے میں جو اس کا اور ماندہ کا مشترک مسکن تھا۔ اسے ہلکے ہلکے بہت اچھی لگتی تھی مگر تب زہر لگتی تھی جب وہ بلا اجازت ہی اس کھڑکی سے اندر گھس کر زمین پر بچھا کھٹ اور بیز پر پڑی کتابیں گھلی کر دیتی۔ اٹھلاتی ہوا کتنی دلفریب محسوس ہوتی ہے مگر ذرا اس اٹھلا پٹ لٹا پٹ آتا تو کمرے میں گرد کا ڈھیر لگ جاتا۔ (یہ الگ بات ہے کہ اس گرد کو اس نے کبھی جھاڑنے کی بات نہ کی تھی۔ یہ کام کرنے کی حقدار بلا شرکت غیرے ماندہ ہی تھی) پھر سب سے بڑھ کر یہ بد تمیز سورج دھڑکے ہوئے میں ایک لمبی کی بھی نہ لگتا تھا اور کم چنٹ طلوع بھی تو اسی کھڑکی کے عین سامنے ہوا کرتا تھا کہ ”تمہ“ کو یقین تھا کہ سورج صرف اسی کو چڑانے کے لیے مشرق سے نکلتا ہے۔ ورنہ باقی کی تین سمتیں لگ بھگ ساڑھن قاری رہتی ہیں۔ وہ بوجھل آنکھوں اور ست قدموں سے چلتی چکن میں آگئی۔ ماندہ بزرگ نے کھڑکی پر جاتے کیا فرائی کر رہی تھی۔

”مہلکام علیکم السلام“ ماندہ نے ذرا سا سر موڑ کر اسے دیکھا پھر سلام کا جواب دے کر بولی۔

”مہلکام علیکم السلام“ ماندہ نے ذرا سا سر موڑ کر اسے دیکھا پھر سلام کا جواب دے کر بولی۔

”تمہ“ کو یقین تھا کہ سورج صرف اسی کو چڑانے کے لیے مشرق سے نکلتا ہے۔ ورنہ باقی کی تین سمتیں لگ بھگ ساڑھن قاری رہتی ہیں۔ وہ بوجھل آنکھوں اور ست قدموں سے چلتی چکن میں آگئی۔ ماندہ بزرگ نے کھڑکی پر جاتے کیا فرائی کر رہی تھی۔

”بیات شیر دل کے لیے کئی مئی ہے شیر غلوں کے لیے نہیں۔“ اس کی بات پر منہ بھی تھوڑا سا مسکرائی

”پیارا.....“ مائدہ کی پشت پر نظریں نکائے اس نے پکارا۔

”ہوں.....“

”پیارا! ہم اپنے روم کی کھڑکی بند نہ کروادیں۔“ نیند سے بوجھل آنکھیں موند کر کہا ملک پوچھا تو ہم میں کورا ”نہیں“ سننے کو ملا۔ جھنجھلا کر سر اٹھایا۔

”کیوں بھلا.....؟ وہ آفتاب کا بچہ ہر روز مجھے تنگ کرتا ہے۔“ اس نے الجھن بیان کی تو مائدہ نے اس کے پاس آ بیٹھی۔

”رات کو جلدی سویا کرو آفتاب تنگ نہیں کرے گا۔“ کوئی نئی شکایت تو تھی نہیں پھر رٹی رٹی بات کے جواب میں رٹی رٹائی باتیں ہی سننے کو ملتی ہیں۔ میہ نے چڑ کر بازوؤں میں منہ چھپا پا جاتا تو نہ ٹوک دیا۔

”جلدی سے ناشہ کر لو پھر یونیورسٹی.....“

”جی نہیں! یونیورسٹی نہیں جانا مجھے..... آج چھٹی ہے۔“ اس نے مائدہ کی بات قطع کی۔

”یہ ہفتے میں چار چھٹیاں کب سے ہونے لگیں۔“

اپنی دھیل چیز گھسیٹ کر اندر آتی بی بی نے اس کی آخری بات ہی سنی تھی۔ جب ہی اسے کڑی غور سے گھورا۔

”جب چھٹیاں ہی کرنی تھیں تو ایڈمیشن لیا ہی کیوں تھا خواہ مخواہ اتنے روپے خرچ کر دیے۔“

”یہ یونہی کہہ رہی ہے بی بی!“ مائدہ ان کی چیز ڈائینگ ٹیبل کے قریب لے آئی۔ میہ اب

سے آلیٹ کھا رہی تھی۔ سر اٹھا کر بولی۔

”میں یونہی نہیں کہہ رہی۔ آج واقعی گھر پر آرام کرنے کا ارادہ ہے میرا۔“

”ابھی تو تمہاری کلاسز اشارٹ ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ شروع سال سے ہی اتنی چیزیں گی تو ہو چکا تمہارا بی ایف اے۔“ اس کے شہنشاہی انداز پر مائدہ نے بھی ذرا سختی سے گھر کا وہ منہ بہ منہ لگی۔

”پلیز بیا! صرف آج چھٹی کر لینے دیں تا پھر۔ آج صفائی کون کرے گا جیران بھی تو ہے۔“

”ہے۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ جانے سے قبل میں سب کام نسا کر جاؤں گی۔“ میہ نے گھر اسٹاپ

خاموشی اختیار کی۔ خبر تھی آج کوئی عذر کام نہیں آئے گا۔

”تمہاری فلائٹ کتنے بجے ہے؟“ بی بی نے مائدہ سے پوچھا تو میہ چونک کر دوڑوں کی

تجلی۔

”میں کی فلائٹ؟“

”اس نے پہلے بی بی کو جواب دیا پھر کپ میں چائے انڈیلے ہوئے اس کی

لہجہ بکری بولی۔

”میں آج کراچی جا رہی ہوں۔“

”واپس کب آئیں گی؟“

”دو روز بعد۔“

”کیوں جا رہی ہیں؟“ اس نے یونہی پوچھا تھا مگر خبر نہ تھی کہ بی بی کو اتنا ناگوار گزرے گا، ڈپٹے

ایک انداز میں بولیں۔

”وہاں مگر ہے اس کا۔ جب چاہے جائے جب چاہے واپس آئے تم کو کیا تکلیف ہے جو یوں سوال

پہل کیے جا رہی ہو؟“ مائدہ نے انہیں تھوڑی سی حیرانی سے دیکھا تھا۔ اتنا طویل جملہ، وہ بھی ایک ہی

ماں میں، یہ بی بی کا شیوہ تو قطعاً نہ تھا۔ اس نے میہ کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر شرمندگی کی سرخی

گھڑی ہوئی تھی۔

”ماز کی انجمنٹ ہو رہی ہے میں نے بتایا تھا تا تم کو؟“ مائدہ کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا

باہر کچھ سوچ کر خود ساختہ جوش سے بولی۔

”میں بھی چلوں پھر ہم اکٹھے ہی واپس آ جائیں گے لیکن نہیں، مجھے دیکھتے ہی ماموں ایسی صورت بنا

پڑے ہیں جیسے کڑوا کر بلا نکل لیا ہو۔“ اس کا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھا تھا۔

چند لمحوں کے لیے کچن کی گرم فضا بوجھل خاموشی سے لبریز رہی تھی پھر مائدہ ہی نے ماحول کی کشافیت کو

اگلیا بل دھیر دھیر کو ضروری ہدایات دے رہی تھی۔

”کیس ضرور جانا، بی بی کو کھانا تا تم پر کھلا دینا، میں نے سوپ بنا دیا ہے، بی بی کو تا تم پر دو اٹھلا دینا،

بلکہ کھوتے ہوئے سب کھڑکی دروازے ٹھیک سے چیک کر لیتا اور سب سے اہم بات رات کو جلدی سے

بہت بخیر ہو وغیرہ۔“ میہ چمکتی۔

”آپ دونوں کے لیے جا رہی ہیں یا دوصد یوں کے لیے؟“ مائدہ ہنس دی

”وہ جو تیار ہے، دھیان سے سنو۔ کچھ تمہاری بھی ذمہ داریاں ہیں، آخر کب تک سنبھالے گی

تمہارے گھر کو تنہا ہی چلا جائے گی تو پھر کون کرے گا یہ سب؟“ آج بی بی ان دونوں کو حیران کرنے پر بھند

لگا کر لپٹے پانا ہوتا ہے۔ سودہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن سے نکلتے ہوئے اس نے مائدہ کی آواز

یہ ایک ملوث آپٹ لے بیہ جات بھی موجود تھے۔ ایک دوہرے صوفے کے اوپر ”جہازی ساز“
نے ایک رنگ کی ٹی شرٹ ماربل کے فرش پر دراز تھی۔

[illegible]

ماتھی ساتھ سوس سوس کی دھیمی آواز پر کان لگائے جو دائیں جانب سے کچن سے آرہی تھی، اس نے کچن کی بجائے کچن میں جھانکا، برز پر رکھی کیتلی سے چائے کا سیلاب کنارے توڑ کر آگ بھجائے کی کوشش کیا، اس نے تیزی سے بڑھ کر برز آف کیا پھر پھونکیں مار مار کر چائے کو اس کے اصل مقام تک پہنچا۔

”جہانے سب لوگ کہاں ہیں۔“ اب کی بار ذرا تشویش سے سوچا تھا، ساتھ ہی کمر پر ہاتھ رکھ کر
 دلے کن میں نگاہ جمالی۔ یہاں کی حالت بھی کچھ مختلف تو نہ تھی۔

”جلی جاؤں یا رک جاؤں۔“ بیٹھانی ملتے ہوئے اس نے سوچا پھر لاوارثوں کی طرح ٹھنڈی ہوتی جائے گی حالت پر دم آ گیا۔ اگلے بلہ دو کینٹ میں سے مگ نکال کر کھچال چکی تھی۔ اس نے اطمینان کے ساتھ مگ میں اٹھ جلی سب لے کر دیکھا، چینی سرے سے غائب۔ اب چینی کی تلاش شروع کی تو خیال لگا کہ لاوارث بچ میں رکھی ہے۔ لہذا وہاں آ کر شوگر پوٹ اٹھایا، کچھ تو موجود ہی تھی، ابھی وہ سیدھی ہوئی ہی تھی کہ سب سے آواز آئی۔

”کن ہو تم؟“ وہ مڑی دوسرے بل شوگر پوٹ زمین پر تھا اور میہ کی دلدوز چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔ ایک دادر اور زور پر بنیان پہنے کندھوں پر تویہ ڈالے آدھا چہرہ سفیدی کی زد میں جبکہ باقی آدمے اس کے بالے لکے کھجورے لیے وہ عجیب مخلوق اسے غضب ناک نظروں سے گھور رہی تھی اور وہ آویا ہوا کیے مانتی جو چیخا شروع ہوئی تھی تو اب تک نان اسٹاپ چل رہی تھی اور یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ بیچاری سی عورت کس کی بیوی تھی۔ پہلے اسے خاموش کروانے کی ہلکی سی کوشش کی مگر وہ

اسلام کی کیوں رہی ہو؟“ میہ کا گلا ایک پلٹا کوٹھکھٹا تھا۔
 ”تمہارا غیر فارم دوا رہ چھیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ اس کو پھر سے منہ کھولتا دیکھ کر تنبیہ کی گئی۔
 ”مک ہٹاؤ گدھے کی طرح کیوں چینی ہو؟“ خاصی درشتی سے دریافت کیا گیا اور کوئی وقت ہوتا تو میہ
 ٹھکانا جو کئی کمراب.....

سنی قحطی۔

”مجھے کہاں جانا ہی بی بی! میں تو ہمیشہ آپ ہی کے پاس رہوں گی۔“ میہ کے قدم آدھے میہ میں اٹک گئے، چوٹ پر ہاتھ رکھے اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ماندہ کے بازو بی بی کے گلے میں طرح لٹک رہے تھے۔

”میں نے بھی تو یہی چاہتی ہوں پتا! کہ آپ کہیں نہ جائیں۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ کر گئی۔

✦

ڈرم اسٹیکس سے جی پلیٹ پر پڑا آف وائٹ کڑھائی والا رومال ٹھیک کرتے ہوئے اس نے بچہ کے بل کھڑے ہو کر گیٹ کے دوسری جانب جھانکا، پورچ خالی تھا۔ دائیں طرف چھوٹا سا دلانہ لگی ہوا تھا۔ برآمدے میں رکھا میز اور اس کے گرد پڑی سفید کرسیاں بھی کسی ذی فہم کا چاہنیں دے رہی تھیں۔ نے تھک کر ایڑھیاں بھی نیچے رکھ دیں۔ پچھلے دو منٹ میں اس نے پورے اکیس بار گھنٹی کا بزن دیا تھا۔ ایک بار بھی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ صبر کی ختویوں میں بھی اس میں نہ جتنی نجانے دو منٹ صبر کیسے کر لیا تھا۔

پچھلے ایک سال سے یہ گھر خالی پڑا تھا اور اب جب آباد ہونے لگا تھا تو وہ کافی تو نہیں البرخیزہ تھی کہ نئے نئے لوگوں سے ملنے میں اسے یوں بھی لطف آتا تھا۔ صبح بخیر عرض کی جاتی تو اس نے سامان اترتے دیکھا تھا، وہ جلدی میں نہ ہوتی تو یقیناً کھلے گیٹ کے قریب کھڑی سویری خانوں متعارف ضرور ہوگئی ہوتی لیکن چونکہ صبح و تعارف نہیں کروا سکی تھی اب بی بی سے اجازت لے کر نئے کیمپوں سے ملنے چلی آئی تھی اور گیٹ تھا کہ کھلنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ شاید گھروالے پورا مسئلہ فروخت کر کے سوئے ہیں، اس نے قیاس لگایا۔ ساتھ ہی گیٹ سے منسلک چھوٹے سے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ خوشی کے مارے بس چیخ لیوں سے باہر آتے آتے ہی رو مچی۔ اس نے کندھ پر پڑا پردہ درست کیا اور بے دھڑک اندر گھس گئی۔ گھر کے طول و عرض سے تو واقف ہی تھی، بالکل اتنا۔ اسے گھر کا طرز بننا تھا۔ اسے اوجھڑے پہنچنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اپنے سر پر پہنا ہوا تھا۔ اسے لاؤنج تک پہنچے ہیں کھڑے کون دوڑیں۔ عین وسط میں پہنچ کر اس نے نظر نہ آنے والی مخلوق کو پکارا ”کوئی ہے۔“ جواب اچھا نہیں ہاں۔ سنائے میں اس کی اپنی ہی آواز گونجی تھی۔ اچانک عجیب سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی، اس نے سیکڑ کر بو کی سمت معلوم کرنی چاہی پھر وہ ہم سمجھ کر سر جھٹک دیا۔ ایک بار پھر بار آواز بلند مگر کینوں کی غیر میں پکارا، جواب نادر۔ اس دوران جبکہ بار اس کا دھیان لاؤنج کی اہتر حالت کی طرف مبذول رہا۔ پر ہنوز گرد سے اتنی سفید چادریں پڑی تھیں اور ان کے اوپر کپڑوں کا ڈھیر تھا جو بجانے صاف تھے اپنے سنسنر ٹھیل پر چائے کے تین خالی مگ، الٹا ہوا شوگر باٹ، جس کا چمچ کچھ فاصلے پر ڈالا تھا۔ تھی میں ڈھیر

”دیکھو بھجو..... بھوت بھائی.....“ وہ ابھی بچی کہہ پائی تھی کہ وہ جھجھکا۔

”بھوت..... یعنی کہ میں۔“ اس کی کلائی چھوڑا اپنے سینے پر شہادت کی انگلی رکھ دے آنکھیں پھر کھڑا تھا۔

”جہیں شرم نہیں آتی، ایک حسین و جمیل اور جوان جہان لڑکے کو بھوت کہتے ہوئے۔“ تمہ سناؤ سہلاتے ہوئے اس سفید زدہ چہرے میں سے حسین و جمیل نقوش کو دریافت کرنا چاہا مگر اسے کافی صدمہ پہنچا تھا۔ تو لیے سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا۔ تب میہ سمجھی کہ یہ سفیدی شیوہ یک کر رہی تھی، وہ جوان لڑکا اب لڑکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

”اور یہ تم نے منہ پھاڑ کر بھائی کسے کہا ہے؟“ ایک اور سوال۔ ”دیکھو لڑکی! میں کافی سے زیادہ پرست ثابت ہوا ہوں، بہن بتاتے ہوئے بھی اس نقطے کو سامنے رکھتا ہوں لہذا تم جیسی بمثل قبول ہوں لڑکی کو تو میں بہن بنانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی میں اپنے والدین کا اکوٹا ہونا ہر ہوں۔“

”اور شکل تمہاری بھوت جیسی ہے۔“ ترنت جواب دیا۔ ”وہ بمثل قبول صورت“ جیہی بات میں بچے تیر کی طرح لگی تھی اور سارا خوف بھی اڑ چھو ہو گیا تھا۔

”یہ تم جا کہاں رہی ہو، بیٹھو یہاں۔“ وہ جو دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگی تھی، ایک ہی جھکے کاؤچ پر ڈھیل دی گئی، وہ شخص اب اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوا تھا۔

”اب بتاؤ کون ہو تم! کہاں سے آئی ہو اور ہمارے گھر میں کس ارادے سے کھسی ہو؟“ وہ بچے مجھے قطعاً نہیں چاہیے مال سرودہ تو میں تمہارے ہاتھ میں دیکھ ہی چکا ہوں اور شکل سے تو تم کی بلکہ ورانہ چورنی لگتی ہو۔“

”پہلے جا کر اپنی شکل آئینے میں دیکھو، ڈاکوؤں کے سرغز تو تم لگتے ہو۔“

”میں روز بلا ناغہ آئینہ دیکھتا ہوں اور وہ مجھ سے ایک ہی بات کہتا ہے کہ تیور عارف تم سے بڑا میں کوئی بھی پینڈم اور ڈھنگ نہیں ہے۔“

”اس سے پہلے کہ تمہارے سر پر کلائی ہوئی ایک اور انڈول کی نوکری کرے، جا کر ایک بار بڑا دیکھ لو۔“ میہ نے کافی تسخرانہ انداز میں کہا تھا۔

”اچھا اب مجھے زیادہ باتوں میں مت الجھاؤ۔ خوب سمجھتا ہوں میں تم جیسی جاہل لڑکیوں کو کبھی رہی ہونا تم کہ میں آئینہ دیکھنے اندر جاؤں اور تم سارے ساز و سامان سمیت چپت ہو جاؤ۔ بالی بالی! احمق نہیں ہوں میں۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولا۔

”تم کتنے احمق ہو اور کتنے نہیں، اس بات کا اعلان تو تمہاری شکل ہی جی جی کر رہی ہے۔“

”اور میں بھی خوا خواہ ہی تم سے بحث کرنے بیٹھ گئی، حالانکہ تم تو شکل سے ہی نغزہ نظر اس پر ڈالی گئی تھی۔“ اور میں بھی خوا خواہ ہی تم سے بحث کرنے بیٹھ گئی، حالانکہ تم تو شکل سے ہی نغزہ نظر اس پر ڈالی گئی تھی۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔ ”اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے تمہیں بہت پرہی آتی ہیں جہیں۔“ جلیلا کر کہا۔

”آریو کے مس.....“ مس صاحبہ چونکی، پہلے تو فل پولیس یونیفارم میں سامنے کمر سے غصہ دیکھ کر اس قدر کوٹیک سرورس پر حیران ہوئی اور اگلے ہی پل وہ ہچک ہچک سمجھ کر رونے لگی تھی۔ مہاراجہ جھنجلا کر تیسروں کو دیکھا، قاسم کے تاثرات بھی کچھ مختلف نہ تھے، تیسرا لگ پریشان بلکہ تپا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”کون ہے یہ اور یہ کیا ہو رہا تھا۔“ عباس نے کڑے تیوروں سے تیسروں کو گھور کر اس سے پہلے بولنے لگی۔

”دیکھیے میں نے کچھ بھی نہیں کیا.....“

”اوکے میں مان لیتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں کیا مگر پلیز رونا تو بند کیجئے۔“

”یہ مجھے جیل میں تو بند نہیں کریں گے۔“ اس نے پوچھا عباس سے تھا اور دیکھا قاسم کی جانب ہندو میہ اتنی معصوم تو قطعاً نہ تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی مگر خوف اکثر انسان کو دیا بناتا ہے جیسا کہ وہ بھی ہوتا۔ اس کے سوال پر دھیمی سی مسکان قاسم اور عباس کے ہونٹوں کو چھو گئی تھی۔ کچھ کچھ معاملہ تو سمجھ ہی گئے تھے، عباس نے دیم کو پانی لانے کا اشارہ کیا جبکہ قاسم کہہ رہا تھا۔

”جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر کیوں بند کریں گے؟“

”لو پانی پیو اور آنکھیں صاف کرو۔“ اتنی نرمی سے کہنے پر اسے قدرے سکون ہوا تھا، سو پانی کا گلاز لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ گلاس میز پر رکھتے ہوئے نظر سامنے گئی۔ تیسروں سامنے ہی بیٹا اسے مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا، وہ کھڑی ہو گئی۔

”میں جاؤں، بی بی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ اس نے عباس اور قاسم کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو تیسروں بولا۔

”خواتین جاؤں، ابھی تو تم سے مکمل انکوائری ہوگی اور کتنے ساتھی ہیں تمہارے چورنی۔“

”اب اگر تم نے مجھے چورنی کہا تو میں تمہیں قتل کر دوں گی۔“ وہ بھڑک کر بولی۔ پھر عباس اور قاسم کی طرف پلٹی۔ ”آپ خود بتائیں کیا میں قتل سے چورنی کہتی ہوں۔“

”قتل کی دھمکی وہ بھی ڈی ایس پی کے سامنے۔“ تیسروں نے حیرت سے خود کھائی کی۔ ”کوئی کیونکر اسے تو اس پر لگ جائے گی، کیوں قاسم۔“ تائید چاہی مگر میہ نے اسے غصہ ناک نظروں سے گھورا پھر دم دھپ کرتی باہر نکل گئی۔

+

ہفتے کی رات تو وہ کبھی بھی جلدی سوئے کی غلطی نہیں کرتی تھی، اپنے ساتھ ساتھ مائدہ کو بھی نہ داتا

بہتے پھر کرتی تھی مگر رات وہ جلدی سو گئی تھی اور صبح بھی جلدی آنکھ کھلی تھی، حالانکہ یہ اس کا دوسرا تیرہ نہ تھا، پندرہ کے جنون نے پری بیدار ہوا کرتی تھی۔ رات اس کا فون آیا تھا، کسی وجہ سے اسے مزید تین دن بیٹا نہیں پڑا تھا۔ میہ کی آنکھ چونکہ جلدی کھل گئی تھی اس لیے کچھ وقت پڑھائی میں صرف کیا پھر بی بی کے پاس آ گئی۔

”بی بی اداک کرنے چلیں۔“ اس نے اجازت لینے والے انداز میں پوچھا۔ پھر وہیل چیئر ان کے قریب لے آئی تاکہ بی بی کو اس پر شفٹ کر سکے مگر بی بی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”مجھے ابھی قرآن مجید پڑھنا ہے، تم جانا جاو تو چلی جاؤ مگر جلدی واپس آ جانا۔“ وہ سر ہلا کر باہر نکل آئی۔ اسے کون سا کہیں دور جانا تھا، وہیں کالونی کے پارک میں ایک رائڈنگ کر روڈ پر آ گئی۔ ست روی سے پہلے وہ اندر گھر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ روشنی تو خیر کافی پھیل چکی تھی۔ آسمان پر دل لیل کھرے ہوئے تھے جیسے کسی نے تازہ دھنکی ہوئی روٹی پھیلا دی ہو۔ ٹھنڈی ہوا بھی خاصی خوش کن تھی۔ اکثر گھروں کی بیرونی دیواریں یوگن دیلی اور عشق پچپال کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ تبھی اس نے قدموں کی ہلکی دھمک پر ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا، پیچھے آنے والا شخص اس کے سامنے آن رکھا تھا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے سادگی سے جواب دے کر ٹریک سوٹ میں ملبوس اس شخص کو دیکھا۔

”تم نے شاید مجھے پہچان نہیں۔“ اب کی بار وہ کھل کر مسکرائی۔

”جی نہیں، میں آپ کو پہچان گئی ہوں، آپ.....“ وہ جھجکی۔ ”مگر مجھے آپ کا نام نہیں معلوم۔“

”عباس مصطفیٰ..... خیریت سے ہوں۔“ اس نے پہلے بتایا پھر پوچھا۔

”جی بالکل۔“ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”وہ جو سامنے سی گرین گیٹ والا پیارا سا گھر ہے نا میں وہاں

رہتی ہوں، اس روز میں تو صرف گھر والوں سے ملنے کے لیے گئی تھی مگر وہ گھونچل بچانے کیا سمجھا۔“

”اندروں جو سی گرین گیٹ والے پیارے سے گھر کے ساتھ والا گھر ہے نا، میں وہاں رہتا ہوں۔“ اس

کا انداز تھا۔ ”بہر اثراتی تھا، میہ خوشنوا سی حیرت کے زیر اثر مسکرائی۔

”اس کا مطلب ہے آپ ہمارے نئے بھائی ہیں۔“

”ہاں اور اس گھونچل کی طرف سے میں تم سے ایک سیکیو ذکر رہا ہوں، ایکچو نیکی وہ ذرا اثراتی ہے۔“

”اندروں کی ایس پی؟“ اسے اچانک یاد آیا تھا۔

”وہ قاسم تھا میرا دوست۔“

”اوکی آپ کے ساتھ رہتے ہیں، آئی مین آپ کے گھر میں۔“

”نہیں، میں کبھی تو وہ بس یونہی آیا تھا۔“ عباس ہو لے سے ہنسا، اس کی الجھن سمجھ رہا تھا۔

”ہوں، میں بھی سوچ رہی تھی ہمارے ملک کی پولیس اتنی تیز کب سے ہو گئی۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ عباس نے اسے بڑبڑاتے دیکھا تو پوچھا، وہ سر جھٹک کر بولی۔

”کچھ نہیں، میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ میرا نام میہ طارق ہے۔“

”ٹائٹل نیم..... کیا کرتی ہو، آئی مین پڑھی ہو یا.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادا و ادا چھوڑا۔

”جی بی ایف اے کر رہی ہوں۔“

”بہت خوب۔“ وہ مسکرایا۔ ”جانتی ہو میں نے بھی بی ایف اے کر رکھا ہے اور پھر ماسٹرز بھی کی۔“

آرٹس میں ہی کیا۔“

”رہی۔“ وہ بے طرح خوش ہوئی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے میں اسٹڈیز میں آپ سے مدد لے سکتی ہوں نا۔“

”ضرور۔“ عباس نے خوش دلی سے کہا۔ ”خیر اسٹڈیز کے علاوہ اور کیا ہائیز ہیں تمہاری؟“

وہ اسے مزید بتانے لگی۔ عباس اسے بہت دھیان سے سن رہا تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پہنچ

بھی رہا تھا، حاصل کلام یہ کہ گھر پہنچنے تک وہ دونوں بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ تیمور کافی دیر سے ہمار

کا منتظر تھا تبھی گیٹ پر ہی اس کا انتظار کر رہا تھا، اسے دیکھتے ہی باہر آ گیا۔

”کتنی دیر کر دی یا رامے۔“ وہ عباس کو دیکھتے ہی بولا۔ میہ نے الجھ کر عباس کو دیکھا۔

”مائے؟“ عباس ہنس دیا پھر دونوں کا تعارف کروایا۔

”یہ تیمور ہے، میری اکلوتی بیجا کا اکلوتا بیٹا اور تیمور! یہ میہ ہے میری نئی فریڈ۔“

”ایسا..... کچھ عجیب سا نام نہیں ہے۔“ تیمور نے براہ راست اسے دیکھا تو وہ چڑھی گئی۔ کتنی ہلکا

طرح اس کا نام بگاڑ دیا تھا اور یہ شخص تو ابے اول روز سے ہی زہر لگا تھا، لہذا نظر انداز کر کے ہمال سے

مخاطب ہوئی۔

”اس کا مطلب میں بھی آپ کو ماموں کہہ سکتی ہوں نا۔“ وہ شرارت سے دریافت کر رہی تھی، نیچے

جھٹ سے بولا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

میہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”کیوں؟ آپ بھی تو کہتے ہیں۔“

”ہاں تو میرا ماما ہے، میں چاہوں تو ماما کہوں، چاہوں تو چاچا۔ خالو یا چچا کہنے کی بھی قید نہیں ہے عزیز

نہیں کہو گی۔“ بڑی سنجیدگی سے وہ لڑنے بھڑنے کو تیار تھا۔ شرارت سے لبریز آنکھیں صرف عباس کو کھڑا

رہی تھیں اور میہ کی سڑی شکل بھی۔

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”میں بھی لڑکی، اتم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔“ ٹائٹل نے نرمی سے میہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں

”کافی دلچسپ شخصیت کا مالک ہوا پھر تو۔“ میہ نے نہایت ناگواری سے سر جھٹکا۔
 ”مجھے تو زہر لگتا ہے دیکھنے میں، بالکل عباس بھائی کا ہم عمری لگتا ہے اور پتا ہے اسے مزہ ملے
 ان کا نام لیتا ہے۔“ نجمانے اسے کس بات پر اعتراض تھا ہم عمر لگنے پر یا نام لینے پر۔
 ”اور یہ دیکھو وہ کیا چیز ہے؟“

”جیسے ہماری جیراں ہے، ویسے ہی دیکھو وہ ہے۔“

”ہاں مگر نام کچھ عجیب سا نہیں؟“ میہ ہنس دی۔

”دراصل اس کا نام دیکھو باری ہے مگر تیمور اسے دیکھو وہ تو کبھی دیکھ کر کہہ کر بلاتا ہے۔ مجھے بھی
 اسے چڑانے میں مزہ آتا تھا، بس اسی لیے یہ نام زبان پر چڑھ گیا۔“
 ”ہوں، اسے چڑانے میں مزہ آتا ہے تو پھر جب تیمور تمہیں ”امیا خانم“ کہتا ہے تو غصہ کیوں آتا
 ہے۔“ نامدہ نے اسے غلطی کا احساس دلایا تو وہ غلج سی ہو کر ہنس دی۔

”اچھا اب تم جاؤ، مجھے کچھ دیر آرام کرنا ہے۔“ وہ نکیہ درست کر کے لیٹ گئی۔ میہ کو احساس تھا بھی
 اٹھ گئی پھر دروازے میں رک رک پٹی۔

”کل کالج جائیں گی آپ؟“

”ہوں، پہلے ہی کافی خرچ ہو چکا ہے۔“ پل بھر میں اس کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔ میہ نے لائن
 آف کی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ بی بی کمرے میں کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، سودہ نہیں
 پر آ گئی۔ آسمان پر اودے اودے بادل منڈلا رہے تھے۔ ابھی تو بہار کی مہک نے پہلی انگڑائی ہی لی تھی اور
 دھرتی کا رنگ ہی بدل گیا تھا، وہ عقیبی دیوار سے کمر نکا کر آسمان پر اڑتے بگلوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ پولی
 دائیں طرف جھانکا، ان میں عباس نہ صرف موجود تھے بلکہ اتفاق سے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ
 ہلا کروش کیا۔ جواباً انہوں نے اسے اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی تھی، وہ معترض تھی مگر اصرار پر اچھا
 کہہ کر نیچے اتر آئی۔ بی بی کے کمرے میں جھانکا، وہ سو رہی تھیں۔ اس نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا
 اور کچن میں برتن دھوتی جیراں کو بتا کر ان کی طرف آ گئی۔ گیٹ دیکھ کر باری نے کھولا تھا، وہ اس کی بیٹی دیکھ کر
 مسکرائی۔

”کیسے ہو دیکھو باری!“ اس سے پیشتر وہ خفا ہو کر بیٹی چھپا لیتا تھا مگر آج حیران ہو کر چھپائی تھی۔

جواب نہ تب ملتا تھا اور نہ اب ملتا تھا، وہ لان میں رکھی چیز پر براجمان عباس کی طرف آ گئی۔

”آؤ میں تمہیں اپنے پودے دکھاؤں۔“ کچھ دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد عباس نے اس سے کہا
 وہ اٹھ کر پودے دیکھنے لگی جو عباس نے بڑی محبت سے لگائے تھے۔ کچھ دیر بعد وہم چائے لے آیا پیچھے
 تیمور بھی تھا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ ہمارے گھر میں اتنا اندھیرا کیوں ہو رہا ہے، وہ تو اب پتا چلا کہ امیا
 مہتابی ہیں۔“ میہ کوخت تاؤ آیا مگر خاموش رہی، جواب دینے کی صورت میں وہ بات سے بات نکالتا ہی
 چلا ہوا وہ بھی نہیں جانتی تھی۔
 ”سب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ عباس نے تیمور کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ یکدم چونک کر
 اسے دیکھنے لگی، جبکہ تیمور ہنسنے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”نہیک ہوں ماما! تم تو خواہنا وہی گھبرا جاتے ہو۔“

”خواہنا نہیں گھبراتا، جب اتنا تیز بخار تھا تو کیوں گئے تھے آفس، وہ تو شکر ہے مجھے دیکھنے نے فون کر
 دیا۔“ عباس کی جھڑکیوں میں بھی بے حد اپنائیت تھی، جیسی تو تیمور مسکرائے ہی جا رہا تھا۔ میہ نے پہلی بار اس
 کی طرف غور سے دیکھا اور یہی دیکھنا حقیقتاً مصیبت بن گیا۔ چہرے پر کھنڈی زدہ، آنکھوں میں پڑے
 سرخ زورے، گلچے پڑے، الجھے بال، جنہیں وہ انگلیوں سے سنوار رہا تھا، ہلکی سی بڑھی ہوئی شیوہ..... اس کا
 چائے پاتا ہاتھ یکدم لرزنے لگا۔ عجیب سے احساس نے اسے نگاہ جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے حیرت
 سے اپنے دل کو ڈنڈا اور پوری کی پوری عباس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”بیاوا پس آ گئی ہیں۔“

”بیاوا ہی ہیں نا جو بہت اچھی ہیں اور جن کے بغیر تمہارا دل بالکل نہیں لگتا، جنہوں نے کیمسٹری میں
 ماسٹر کیا ہے اور آج کل ایک پرائیویٹ کالج میں ایذا لے لیکچرار جاب کر رہی ہیں اور جو بے حد انٹیلی جنٹ
 ہیں، وغیرہ وغیرہ۔“ عباس نے بہت شرارت سے کہا تو وہ بجائے خفا ہونے کے کھلکھلانے لگی۔
 ”تمی ہاں، وہی ہیں۔“

”ہوں، کافی بریلیٹ خاتون معلوم ہوتی ہیں، ضرور مضبوط اعصاب کی مالک بھی ہوں گی۔ ظاہر ہے
 کمزور اعصاب والوں کا تمہارے ساتھ گزارا رامشکل ہی ہے۔ خیر پھر کب ملواری ہو ہمیں اس عظیم ہستی
 سے۔“ تیمور کے غشیدہ سے انداز پر وہ جل بھن کر کونکھ ہو گئی، تریخ کر بولی۔

”تمہیں تو ہرگز نہیں ملواری گی۔“ پھر عباس سے بولی۔ ”میں آپ سے مشورہ کرنے آئی تھی۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے عباس!“

”کیا کا رتھ ڈے آ رہا ہے نیکسٹ ویک..... میں انہیں کیا گفت دوں۔“

”میں سمجھا محترمہ لعل ناؤ خریدنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ تیمور کا آسودہ سانس کافی بلند آواز میں باہر
 آیا تھا۔

”مجھے کیا معلوم، انفلکٹ میں تمہاری بیا کی نیچر سے قطعی واقف نہیں ہوں اور گفتگو تو نیچر کے مطابق
 عمل دینے جاتے ہیں۔“ میہ کو مایوسی ہو گئی۔

”پھر بھی کچھ تو مشورہ دیجئے۔“ عباس نے ایک پل کو سوچا پھر بولا۔
”تم نے کہا تھا کہ پیا کو لڑ پیچ سے دلچسپی ہے تو کوئی بک ہی گفت کر دو۔“
”اوہوں، وہ تو پچھلی بار دی تھی۔“ اس نے تجویز رد کی۔
”پرفیوم۔“

”وہ اس سے پچھلی بار دیا تھا۔“

”پھر۔“ ممیہ نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ”خواتین کو جیولری پسند ہوتی ہے۔“

”جیولری اس سے پچھلی سا لگرہ پردی ہوگی۔“ تیمور نے قیاس آرائی کی، یوں بھی اس لڑکی کے سامنے زیادہ دیر وہ خاموش نہیں رہ پاتا تھا۔

”پیا کو جیولری سرے سے پسند ہی نہیں ہے۔“ اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

”پھر یوں کرو بادشاہی مسجد گفت کر دو۔“ تیمور نے بروقت لقمہ دیا۔ اس نے عباس کی جانب دیکھا۔
”بے بسی سے کندھے اچکا رہا تھا۔“

”یہ تیمور کا حلقہ احباب مجھ سے زیادہ وسیع ہے۔ گفتش لینا اور دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے، اکیس پوچھو، یہی بہتر مشورہ دے سکتا ہے تمہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مڑی تو وہ بولا۔

”ٹھہر، مجھے سوچنے دو۔“ دائیں ٹانگ اضطراری انداز میں ہلاتے ہوئے وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، گویا گفت دین سے برآمد کرنا ہو۔ ممیہ بڑی شدت سے جواب کی منتظر تھی، تیمور کی نگاہ پیچھے پلٹی۔

”کتاب اور پرفیوم تم دے چکی ہو جیولری انہیں پسند نہیں ہے۔“ ترجمہ نگاہ ممیہ پر ڈالی۔

”یوں کرو امیبا خاتون!“ ممیہ نے دانت کچکپائے، بولی کچھ نہیں اس وقت مشورہ جو ردگار تھا۔
”گھوڑا گفت کر دو۔“

”لعنت ہو۔“ بالاجت بل بھر میں غائب ہوئی، اس شخص سے عقلمندانہ بات کی توقع ہی فضول تھی۔
”گھوڑے کی بجائے گدھا نہ گفت کر دو۔“ اس کی نظر نے پوری سنجیدگی سے تیمور عارف کا گہرا

کر لیا تو وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولا۔

”نہیں بھئی، گدھا آج کل ٹرینڈ میں نہیں ہے پھر تم خود سوچو بھلا تمہاری پیا گدھا کا زلی پر ہوا کی گلیں گی، ٹانگے کی تو خیر ایک گریں ہوتی ہے۔“ وہ مزید چڑھتی مگر ہار نہ مانی۔

”اورالو کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ایک دم بوگس، نہایت ہی بکواس۔ الو کے پیچھے تو چنگ چلی بھی نہیں لگوائی جاسکتی۔ دیے ہوئے ہڈیاں ہے چکا ڈر زیادہ موزوں رہے گی۔“ مجسم و شریعہ انداز میں صاف اسے چوٹ کی مٹی تھی، ”وہ کپڑا کھڑا کرنا

”میں نے تمہیں کوئی نظریہ نہیں دیا۔“ تیمور نے جواب دیا۔

”اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔“ پھر تو وہ صاف منع کر دیں گی۔ کیونکہ انہیں بچوں سے گفت نہیں۔“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”پہنہ نہیں ہے اور وہ مجھے اب تک بچہ ہی سمجھتی ہیں۔“
”طلعتی غلط فہمی تو دور ہوئی ورنہ میں تو واقعی انہیں عقلمند خاتون سمجھا تھا۔“ اب کی بار وہ واقعی پاؤں شیخ کرکڑی ہوئی تھی اور پھر عباس کے روکنے پر بھی نہیں رکی تھی۔
+

آج وہ بہت اصرار سے بی بی کو کمر سے باہر لائی تھی۔ معذوری انسان کو کیسے زچ کر کے رکھ دیتی ہے اس کا انداز وہ بی بی کو دیکھ کر ہی کرتی تھی۔ معمولی سے روڈ ایکسیڈنٹ نے ان کی ٹانگیں جھین لی تھیں مگر گھر میں بند ہو جانے پر انہیں اس بات نے مجبور نہیں کیا تھا، وہ بات کیا تھی؟ بلاشبہ بی بی سمیت وہ دونوں ہی واقع میں مگر ایک خاموش معاہدہ پچھلے پانچ برسوں سے ان کے درمیان چلا آ رہا تھا اور اس معاہدے کی پاسداری ان تینوں کو ہی کرتی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں بی بی؟“ ایک طویل خاموشی آج بھی ماندہ نے ہی توڑی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ بی بی نے مختصر کہا، حالانکہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دلی حالات سے واقف تھیں۔
”ماندہ نے کل جیسر روڈ کے ایک جانب روک دی اور خود سامنے بنی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھ گئی۔“

”شجاعت کہا ہے۔“ بی بی نے جیسے کچھ قاصد پر کھیلنے بچوں سے سوال کیا تھا۔

”پاپا ٹھیک ہیں۔“ ماندہ نے جواب دیتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔ جھریوں بھرے چہرے پر وہ رگڑاٹھیں لگی تھیں، بے حد روشن اور چمکدار تھیں مگر کان زدہ، جن پر پچھتاوے کا پردہ پڑا ہوا تھا، کسی غلط فیصلے کا غم، کچھ کھوینے کا پچھتاوا۔ ماندہ کو لگا تھا کہ وہ سرمئی بدلیاں ایک دم برسنے لگیں گی، تبھی ان کا ہاتھ قاپا ہلایا۔

”پاپا آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔“ بی بی ہنس دیں، یہ تسلی عجیب بچکانہ سی لگی تھی۔

”ہاں کرتا ہی ہوگا، اس کا خزانہ جو میرے پاس ہے۔“ ان کی ہنسی ٹوٹی چھوٹی سی، اپنا تسخیراڑتی ہوئی لڑکھائی تھی۔ ماندہ نے ان کا غم اپنے اندر بھی محسوس کیا تھا۔ تسلی کے دو حرف آج بھی اس کے پاس نہیں تھے۔ کہہ کر ہم کی مزا کا بار بہت زیادہ تھا اور بی بی بے حد کمزور۔ تبھی تو اب تک اس بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ کتا پاپا تھا ماندہ نے کہہ دیا یہ بوجھ سر کا دے مگر.....
”پاپا کے دوست ہیں اطہر مین، انہی کی بیٹی سے ماڑہ کی مگنی ہوئی ہے۔“ وہ ان کا دھیان بٹانے کی

غرض سے بولی تھی۔ ”بی بی! میں چاہ رہی تھی کہ ہم میہ کی معافی کر دیں، اگلے سال جب اس کا گھر بن جائے گا تو شادی کر دیں گے۔“ اس نے رائے لینے والے انداز میں انہیں دیکھا تو وہ ہنس کر ”میہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔ ”پھر معافی کر دینے میں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ دراصل میری کوئی ایک اپنے بھائی کا پرپوزل لانا چاہ رہی ہے میہ کے لیے، اگر آپ کہیں تو۔“

”تم جو مناسب سمجھو۔“ انہوں نے پاور آف اٹارنی ہی اسے سونپ دی پھر آٹھویں منزل پر گئے۔

”اب گھر چلو، مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔“ مائدہ نے ڈھیل جیٹر کا رخ موڑ دیا۔ ایک سے دوسرا قدم ہی اٹھا جب اپنے پیچھے آواز سنی۔

”اب آپ باؤلنگ کروائیں تینور بھائی!“ ذرا سا اشتیاق جاگتا تھا، سوگردن موز کر دیکھا۔

ٹراؤزر کے ساتھ نیوی بلیو شرٹ پہنے وہ اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی، مگر سرسری۔ اچھا خاصا انڈین فرینچ کٹ داڑھی چہرے پر سجائے ان بہت سارے بچوں میں بس ذرا بڑا بچہ ہی لگ رہا تھا۔ مائدہ کو عباس مصطفیٰ کی تعریف میں قلابے ملا تا یاد آ گیا تھا۔ ”کیا وہ شخص اس سے بھی زیادہ شاندار شخصیت کا ہو سکتا ہے؟“ اسے اپنے اس احقانہ خیال پر خود ہی ہنسی آگئی تھی تبھی ان بہت سارے بچوں کے درمیان موجود بڑے بچے نے یوں ہی غیر ارادی طور پر نظر اس پر ڈال کر ہٹائی تھی۔

+

میہ کی فرینڈ کی منگنی تھی اور وہ تیار ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”کیسی لگ رہی ہوں۔“ ایئرنگز پہنتے ہوئے اس نے پوچھا تھا، وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے سادگی سے کہا اور ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا

”جاؤ بی بی کو بتاؤ اور میرے کمرے میں بک شیفٹ پر کار کی چابی رکھی ہوگی وہ بھی لے آؤ۔“

دونوں کام نہ بنا کر پورچ میں آئی تو مائدہ کا سر سے ٹیک لگائے منتظر تھی۔

”ویسے اپنی کنونینس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔“ چابی مائدہ کو تھماتے ہوئے اس نے بڑے پلہ وائٹ انسان کو دیکھا تھا جو کچھ عرصہ قبل ہی ان لوگوں نے لی تھی۔ مائدہ ہنس کر کار اشارت کرنے لگی۔

”نہ گیت کھولا۔ کار باہر نکل چکی تو گیت بند کرتے ہوئے اس کی نظر عباس اور تینور پر پڑ گئی۔ اس نے بے بند کیا پھر فرنٹ سیٹ کی کھڑکی میں جھک کر ”دومنٹ“ کہہ کر ان کی طرف آگئی۔ عباس نے اس کا ہاتھ مسکرا کر کیا۔ جبکہ تینور نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اچھی خاصی حیرانگی کا اظہار کیا تھا۔

”یہ آج کہاں قیامت ڈھانے کا ارادہ ہے امیبا خانم!“ میہ نے کھا جانے والی نظروں سے لے کر

اب ہلکے دیکھنے کا کیا فائدہ ہم تو پہلے ہی اس قیامت کی زد میں آ چکے ہیں (اسے دیکھتے ہی یوں بھی بلا بدھتائے لگتا تھا پھر اس کی آگ لگانے والی باتیں۔

”میرا بس پلے تو تم پر ہی چلا دوں۔“ اس نے دانت کچکپائے، آپ جناب کا تکلف تو یوں بھی نہیں

رہی تھی۔

”بس نہیں چلتی تو فرک ہی چلا دو۔“ بڑی جاندار مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھری تھی مگر میہ غصے میں کسی بات کی طرف دھیان دے ہی نہ پاتی تھی۔

”کیسی ہے ہماری گڑیا!“ عباس جو کار کا دروازہ کھول رہا تھا، رک کر پوچھنے لگا۔ جواباً وہ غصگی سے

ہل۔

”آپ تو بات ہی مت کریں مجھ سے۔“

”ارے کیوں بھی؟“

”کہاں تھے پچھلے ایک ہفتے سے۔“ وہ باقاعدہ کمر پر ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ مائدہ کا سرے باہر آ گئی۔ تینور کے ساتھ دوسرا شخص عباس مصطفیٰ ہی ہو سکتا تھا اور میہ کب سے اسے عباس سے ملوانا چاہ رہی تھی۔ مائدہ ان کے قریب آئی تو میہ نے اپنی ناراضی بھول کر کافی پر جوش انداز میں تعارف کر دیا تھا۔

”میر میری بی بی، آئی مین مائدہ حسین۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ”اور بی بی! یہ عباس بھائی ہیں۔“

”بہت خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ رسم نبھائی تھی اور ساتھ ہی کمال خوبصورتی سے اپنی حیرانی چھپا گیا تھا اپنے اندر کا موسم بدوقت چھپا لینے میں اسے یوں بھی ملکہ حاصل تھا جس طرح سے میہ ”بی بی“ کا ذکر کیا کرتی تھی، ان لوگوں کے ذہن میں کسی بڑی سی عمر کی خاتون کا خاکہ ہی بن سکا تھا اور اس وقت ان کے سامنے ایک دھماکا پان ہی لڑکی کھڑی تھی۔

”اور میں تینور ہوں، دشمنوں کی تو زبان جلتی ہے ہمارا نام لیتے ہوئے۔“ اس نے جتاتے ہوئے کہا

مائدہ ہنس دی۔ جبکہ میہ نے حسب معمول اسے گھورا تھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی ٹانگوں کے ساتھ ہنسی مائدہ پر کئی تھیں۔ وہ نگاہوں کی زبان کبھی بھی سمجھ نہیں پاتی تھی مگر اس پل ان نگاہوں میں ایک قہقہہ سنائی دینا لگا۔ یا کچھ بھی نہیں۔ عباس مائدہ سے رسمی گفتگو کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں سا لگوت گیا ہوا تھا۔ اچھو ٹٹلی بچا کچھ بیمار تھیں، بس اسی لیے..... تمہیں تینور نے نہیں بتایا۔“

”میں نے کہہ کر تینور کی جانب دیکھا تو وہ یکدم چونکا۔

”بھول گیا کیا؟“ اس کے کچھ دیر بعد وہ لوگ اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے تھے لیکن جو کچھ

مائدہ میہ سے محسوس کیا تھا وہ شاید یقیناً مائدہ نہیں کر پاتی تھی۔ عباس کو تو بس سرسری سی حیرت ہوئی

تھی جبکہ میہ کو عجب سی بے کلی نے گھیر لیا تھا، وہ خود بھی سمجھ نہیں پاری تھی کہ اسے کیا بات ملے گی۔
 ”تیور“ کا ”ماندہ“ کو دیکھنا یا ”تیور“ کو ماندہ کا دیکھنا اور وہ رات تیور عارف نے ملے ہوئے
 جاتے ہوئے اور دانستہ اس عام سے چلیے والی لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزاری تھی۔

+

وہ اگرچہ تھک گئی تھی مگر موسم کی دلفریبی نے آدمی سے زیادہ تکان کھینچ لی تھی۔ آج اس کی کارڈ
 آصفہ نے اسے اپنی ادبی محفل میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی، اسے لڑیج سے اسکی کچھ خاص لکچریں
 بس یوں ہی وقت گزاری کے لیے پڑھ لیتی تھی اور اسی وقت گزاری کے مصروفی نے اس کے کمرے
 ایک پورا ریک کتابوں سے بھر دیا تھا، اب بھی وہ بس آصفہ کے اصرار پر چلی گئی، محض دو گھنٹے ہی پہلے
 سکی تھی کہ میہ نے اسے جلدی واپس آنے کے لیے کہا تھا، وہ اسے اپنا بیک کیا ہوا ایک کھانا پانی
 ٹارل اسپینڈ سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بیٹا ثانی کو سن رہی تھی کہ یکدم کار بچکولے لکھا کر رک گئی۔ اس
 ناگواری سے گیسٹر لگایا پھر باہر نکل آئی۔ ٹائر تو سلامت ہی تھے، بونٹ کھول کر دیکھا، یہاں وہاں ہاتھ لہلہ
 پر سمجھ نہ آیا کہ خرابی کدھر ہے۔ سیکنڈ ہینڈ چیزیں یوں ہی عین وقت پر داغ مفارقت دے دیا کرتی ہیں
 سڑک طویل اور سنسان تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر بے سود۔ دو ایک طویل الجیڈ ٹرک ہی گزرے تھے
 تھک کر فریٹ ڈور سے کمرنگا کر کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر بکھری بدلیوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ابھی ہی کہ
 طرف جل تھل کر دیں گی۔ پریشانی سے زیادہ کوفت اور جھلاہٹ ہوئی تھی، تبھی ایک ریڈ سوک اس
 سامنے سے گزری تھی پھر کچھ آگے جا کر ٹھہری اور ریورس ہو کر اس تک آئی، وہ جتنا سے انداز میں کلا
 ہوئی تھی۔ کاری چھٹی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آنے والی شخصیت تیور عارف کی تھی۔

”ہیلو۔“ وہ اس کے قریب آ کر مسکرایا۔

”السلام علیکم۔“ وہ جتنا نہیں چاہتی تھی، بس عادتاً ایسا کہا تھا۔ تیور غل سا ہو کر سر کی پٹ کہاں

”وعلیکم السلام کیسی ہیں آپ؟“

”بہت اچھی ہوں۔“ اس لڑکے کو دیکھتے ہی میہ کے دیے ہوئے کمنٹس یاد آ گئے تھے، وہ اس کی

سن کر مسکرایا۔

”وہ تو میں جانتا ہوں لیکن آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں۔“ اس نے کلائی پر ہندی لکھی

کر پوچھا تھا۔ ظاہر ہے شام جب رات کے دورا ہے پر کھڑی ہو تو ایک تنہا لڑکی کا سنسان سڑک پر کھڑے
 کیا جواز رکھتا ہے۔ ماندہ نے اسے مختصر آکاری خرابی کے متعلق بتایا۔

”میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں، لیکن میرے فرینڈز میرے ساتھ ہیں۔“ اس نے یوں کہا کہ

”حرف بنو آجائیں، وہ یوں۔“
 اس کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر تم میری کار ٹھیک کر دو تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“
 ”ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بونٹ کی طرف آ گیا۔ ماندہ اسے ہاتھ چلاتا دیکھتی رہی، چند لمحے بعد وہ بونٹ
 بند کر کے اس کی طرف آ گیا۔

”معمولی سا فٹ تھا، میں نے ٹھیک کر دیا ہے۔“

”جیک ہوسو۔“ ماندہ نے ٹشو پیپر ز اسے تھمائے۔

”آپ گھر جا رہی ہیں۔“ انگلیاں پونچھتے ہوئے تیور نے پوچھا پھر مثبت جواب پا کر بولا۔

”مجھے لفٹ دے سکتی ہیں۔“

”ضرور۔“ اب شکر یہ ادا کرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا اور وہ کافی سے زیادہ بامروت واقع ہوئی
 فی وہ سر ہلا کر سوک کی طرف چلا گیا۔ جبکہ کردوستوں سے کچھ کہا پھر اس کے جانے کے بعد اس کی
 زلف آ گیا۔ ماندہ نے اس کے بیٹھے ہی کار اسٹارٹ کر دی تھی، بلکی پھلکی گفتگو کے دوران سفر کٹنے لگا۔

”بکھرے قتل ہی امی اور بابا سا لکھٹ شفت ہوئے ہیں، دراصل وہاں ہمارا آبائی گھر ہے۔ اب وہ

لکھنؤ میں ہیں اور یونس کا سارا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر ہے۔ بابا تو بہت عرصہ پہلے ہی وہاں چلے

ہوا ہے مگر برنس کی وجہ سے نہیں جاسکتے تھے، اب جون ہی میرا ایم بی ای کپیٹ ہوادہ بوریا بستر

بن کر سا لکھٹ روانہ ہو گئے۔ اب خود تو سارا دن بیٹھ کر اخبار کھنگالتے ہیں اور امی ایک

orphanage (قیم خانہ) چلا رہی ہیں۔ ویسی میری ماں انتہائی ظالم خاتون ہیں۔ orphanage

بوجھ بھاریوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے متعلق سوچتی رہتی ہیں، کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ بیٹے کے ہاتھ بھی

پیلے کر دیں۔“ اس کے یوں مایوسی بھرے انداز پر ماندہ کو خوب زور سے ہنسی آئی تھی۔ تیور نے بھی مسکراتے

ہوئے ایک زخمی نگاہ اس پر ڈالی۔

”اگر آپ برمانڈ نامیں تو میں ایک کامپلیٹ دینا چاہتا ہوں۔“ وہ اجازت چاہ رہا تھا۔ ماندہ نے کار

آپ کی ہنسی بے حد خوبصورت ہے۔“ اس کا انداز بے حد سادہ تھا۔ ماندہ بس مسکرا دی پھر کار سے

نکلے ہوئے تھیں۔

”مجھے نے بتایا تھا کہ عباس مصطفیٰ بہت ہینڈم اور گریس فل شخص ہیں مگر حیرت ہے کہ اس نے

میں سے اس قدر بات کی تو بتایا ہی نہیں۔“

”کیا کہم بھی بہت ہینڈم ہو۔“

”صرف پیئڈم، مگر بس فل نہیں ہوں؟“ بہت شرارت سے دریافت کیا گیا۔
”میبہ تو تمہیں پیئڈم بھی نہیں مانتی۔“ وہ ہلکھلائی تھی۔

”جی ہاں ہمارے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا، بغیر ہرماٹے۔ ”نہاں“
مجھے پیئڈم کہہ کر بدلہ چکار ہی ہیں۔“
”ارے نہیں بھئی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ مسکرایا، لکڑی
کا پلیٹ تو نہیں تھا، بس دینے والی شخصیت تھی اور انوکھی تھی (اس کے لیے)۔
”میبہ آپ کا بہت ذکر کرتی تھی، میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیا کوئی ایجنڈی خاتون ہوں گی لیکن
تو خاصی کم عمر ہیں اور..... خوبصورت بھی۔ یہ بات میبہ نے بھی ہمیں نہیں بتائی تھی۔“
”تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔“ اس نے بڑی شان بے نیازی سے کہا تھا پھر وہ دونوں ہی فریڈ
تھے۔

”اچھا سنو، یہ کم عمر کہلانے جیسے شوق مجھے قطعاً نہیں ہیں، میں دو چار سال تو ضرور بڑی ہوں مگر
چاہو تو میبہ کی طرح تم بھی مجھے بیا کہہ سکتے ہو یا جی، آ، آ، آ پی جو بھی تم چاہو۔“
”جی نہیں، لڑکیوں کو بہن بنانے والی غلطی میں کبھی نہیں کرتا اور خوبصورت لڑکیوں کو تو ہالو
نہیں۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا مگر شرارت ہر انداز سے عیاں تھی۔
”البتہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم بہت اچھے دوست بن سکتے ہیں۔“ تیمور نے اپنی مضبوط
اس کے سامنے پھیلا دی۔

”آئی جھٹک یہ ایک اچھی دوستی کی شروعات ہوگی۔“ مائدہ نے بغیر کسی جھجک کے اپنا ہاتھ اس
ہاتھ میں دے دیا تھا جس پر تیمور نے خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا پھر اس کا ہاتھ چھوڑے ہوئے بولا۔
”اب تم جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ امبا خاتون مجھے نظروں سے چنگاریاں اڑا اڑا کر ہی مار ڈالے۔“
”ہیں، کیا مطلب؟“

”وہ دیکھو کب سے وہ بندریا کی طرح رینگ سے لٹکی مجھے گھور رہی ہے۔“ مائدہ نے اس
دیکھا۔ میبہ واقعی میسر پر موجود تھی۔ نظر ملتے ہی اسے اشارے کرنے لگی تھی۔ وہ مسکرائی پھر تیمور نے
دیکھ کر بولی۔

”تم اسے بہت تنگ کرتے ہو تبھی وہ تم سے خفا رہتی ہے۔“
”آئی سوئیر میں کبھی اسے تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر نجانے کیوں اس لڑکی کو دیکھتے ہی زبان بے رحم
ہو جاتی ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
”اور جو دل میں کھلبلی جیتی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ یہ آواز دل سے آئی تھی۔

”جی ہاں ہمارے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا، بغیر ہرماٹے۔ ”نہاں“
مجھے پیئڈم کہہ کر بدلہ چکار ہی ہیں۔“
”ارے نہیں بھئی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ مسکرایا، لکڑی
کا پلیٹ تو نہیں تھا، بس دینے والی شخصیت تھی اور انوکھی تھی (اس کے لیے)۔
”میبہ آپ کا بہت ذکر کرتی تھی، میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیا کوئی ایجنڈی خاتون ہوں گی لیکن
تو خاصی کم عمر ہیں اور..... خوبصورت بھی۔ یہ بات میبہ نے بھی ہمیں نہیں بتائی تھی۔“
”تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔“ اس نے بڑی شان بے نیازی سے کہا تھا پھر وہ دونوں ہی فریڈ
تھے۔

”اچھا سنو، یہ کم عمر کہلانے جیسے شوق مجھے قطعاً نہیں ہیں، میں دو چار سال تو ضرور بڑی ہوں مگر
چاہو تو میبہ کی طرح تم بھی مجھے بیا کہہ سکتے ہو یا جی، آ، آ، آ پی جو بھی تم چاہو۔“
”جی نہیں، لڑکیوں کو بہن بنانے والی غلطی میں کبھی نہیں کرتا اور خوبصورت لڑکیوں کو تو ہالو
نہیں۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا مگر شرارت ہر انداز سے عیاں تھی۔
”البتہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم بہت اچھے دوست بن سکتے ہیں۔“ تیمور نے اپنی مضبوط
اس کے سامنے پھیلا دی۔

”آئی جھٹک یہ ایک اچھی دوستی کی شروعات ہوگی۔“ مائدہ نے بغیر کسی جھجک کے اپنا ہاتھ اس
ہاتھ میں دے دیا تھا جس پر تیمور نے خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا پھر اس کا ہاتھ چھوڑے ہوئے بولا۔
”اب تم جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ امبا خاتون مجھے نظروں سے چنگاریاں اڑا اڑا کر ہی مار ڈالے۔“
”ہیں، کیا مطلب؟“

”وہ دیکھو کب سے وہ بندریا کی طرح رینگ سے لٹکی مجھے گھور رہی ہے۔“ مائدہ نے اس
دیکھا۔ میبہ واقعی میسر پر موجود تھی۔ نظر ملتے ہی اسے اشارے کرنے لگی تھی۔ وہ مسکرائی پھر تیمور نے
دیکھ کر بولی۔

”تم اسے بہت تنگ کرتے ہو تبھی وہ تم سے خفا رہتی ہے۔“
”آئی سوئیر میں کبھی اسے تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر نجانے کیوں اس لڑکی کو دیکھتے ہی زبان بے رحم
ہو جاتی ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
”اور جو دل میں کھلبلی جیتی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ یہ آواز دل سے آئی تھی۔

”تم اسے بہت تنگ کرتے ہو تبھی وہ تم سے خفا رہتی ہے۔“
”آئی سوئیر میں کبھی اسے تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر نجانے کیوں اس لڑکی کو دیکھتے ہی زبان بے رحم
ہو جاتی ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
”اور جو دل میں کھلبلی جیتی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ یہ آواز دل سے آئی تھی۔

”میں عباس بھائی کی اچھائی سے انکار نہیں کرتی، وہ ضرور اچھا ہوگا مگر تیسرے بھی بہت اچھا ہے۔“

”انتہائی فضول اور بدتمیز شخص ہے وہ اور آپ شرارتی کہہ رہی ہیں۔“

”میں تمہارے دوست کی برائی نہیں کر رہی، تم میرے دوست کی مت کرو۔“ وہ قہقہے سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس کا ہاتھ بھی پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

”بس اب کوئی فضول بحث نہیں ہوگی، اس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔ ابھی تو فریغ اور کافی ہمارے انتظار میں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔“ میہ منہ بسور کر قدم بڑھانے لگی پھر ٹھٹک کر گئی۔

”آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے۔“ انگلی اٹھا کر پوچھا۔

”کون سا وعدہ؟“

”عباس بھائی والا۔“ مائدہ کو یکدم یاد آیا تو سر ہلا کر بولی۔

”آؤ کوشش کرتے ہیں۔“ وہ دونوں اندر آ گئیں اور کچھ دیر بعد جب وہ بی بی کے سامنے پہنچی رہی تھیں تو میہ اس کے کان میں گھسی ”پوچھیں نا، پوچھیں نا“ کی گردان مستقل کر رہی تھی۔

”وہ بی بی..... آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔“ اس نے تمہید باندھی۔ بی بی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں، دونوں کی من من سے کھٹک تو گئی ہی تھیں۔ ”وہ صبح میں نے آپ کو عباس مصطفیٰ سے ملوایا وہ انہیں یاد دل رہی تھی کہ صبح ہی تو واک پر جاتے ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔ بی بی نے ہولے سے عرصہ دراز سے وہ لفظوں کا استعمال کم کر چکی تھیں۔

”تو ہم لوگ عباس اور تیمور کو کچھ پر بلانا چاہ رہے تھے۔“

”تیمور کو نہیں۔“ میہ نے اعتراض کرنا چاہا۔

”تم مناسب سمجھو تو بلاؤ۔“ وہی ہمیشہ کا ایک جواب۔ میہ نے باقاعدہ یا ہو کا نعرہ لگایا تھا۔

”رات کو واک کرنے جائیں گے تب عباس بھائی کو انوائٹ کریں گے۔ سنڈے کو ٹیکہ دے

بڑی خوشی سے میو سیٹ کرنے لگی تھی۔ اب تو اسے تیمور کے آنے پر بھی اعتراض نہ تھا۔ جب وہ

دونوں بھی ڈنر کے بعد اسٹریٹ میں واک کرنے نکلے تھے۔ عین وسط میں ان دونوں سے ملاقات ہو

”تم اچھی فریڈ ہو، اس دن کے بعد ایسی غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سیٹک۔“

اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا تھا۔

”دراصل یہ بہت مصروف رہتی ہیں، ہر ایرے غیرے سے ملنے کا تاہم یوں بھی ان کے پاس

ہوتا۔“ میہ نے مسکرا کر طنز کیا اور عباس کے ساتھ ہی چلے گئی۔ مائدہ نے تیمور کو اپنی معرفت سے

تینا بالکل غیر ارادی طور پر وہ چاروں ہم قدم ہو گئے تھے۔ مائدہ ہی نے انہیں اپنے ساتھ کھانے کی دعوت

دلائی۔ ”وہ آئی ایم رینلی سوری میہ گڑیا! لیکن اگلا پورا ہفتہ میں بالکل بھی فری نہیں ہوں جبکہ سنڈے کو بھی

بے حد مصروف رہوں گا۔“ عباس نے کہا تو میہ منہ بسور نے لگی۔ تیمور بولا۔

”ڈنٹ وری، میں سنڈے کو بالکل فری ہوں۔“

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔“ میہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے

”وہ دراصل.....“ ماندہ اور عباس اب قریب پہنچ چکے تھے۔ ”میبہ! میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں وہ دھیان سے سننا اور میں اس وقت مذاق بالکل بھی نہیں کر رہا۔ میں..... میں ماندہ کو پسند کرنے لگا ہوں۔“ پتا نہیں کیا ہوا تھا مگر میبہ کو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر دنیا تو دیسے ہی تھی۔ میں اس نظر کی جانب بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

”میبہ! میری بات سنو۔“ تیمور نے پکارا تھا مگر وہ بھاگتی ہی چلی گئی تھی۔

+

ماندہ نے کتاب سے نگاہ ہٹا کر اس پر ڈالی جو تدم آدم آئینے کے سامنے کھڑی پچھلے آدمے کے خود کو ہر زواہی سے دیکھ رہی تھی۔ ”میبہ!“ اس نے کچھ سوچ کر پکارا۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ خاصا رو دکھا جواب ملا، وہ سر جھکا کر کتاب میں گم ہو گئی۔ میبہ نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا پھر ماندہ کے عکس کو۔ سادہ سے بے بی پتک کلر کے کاٹن کے سوٹ میں ڈھیلی چوٹی باندھے ماندہ بہت عام لگ رہی تھی۔

”آخرا کیا ہے ان میں جو مجھ میں نہیں۔“ چڑ کر سوچا۔ ”میں تیمور کو نظر کیوں نہیں آئی۔ یہ پائٹی عام سی تو ہیں۔ رنگت کالی، آنکھیں بھی معمولی سی اور بال..... ہاں بال خوبصورت ہیں مگر میرے بال زیادہ گھنے اور سیاہ ہیں، ان کی طرح چوٹی نہیں ہے تو کیا ہوا۔“ ملبیشن تو زیادہ فیر ہے۔ آنکھیں تو خیر ہیں خوبصورت پھر..... آخر کیوں؟“ وہ جھنجھلا گئی۔

”کچھ بھی نہیں ہے ان میں، بالکل ہی عام سی ہیں..... اگر عام نہ ہوتی تو..... لعنت ہونے والی صورت پر میبہ خاتون! یہ کس قسم کی گھٹیا باتیں سوچ رہی ہو تم..... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تم کو اس قسم سے ملے اور اس کی وجہ سے اپنی پیارے کے متعلق کیسی باتیں سوچنا شروع کر دیں۔“

”ڈوب کر مر جاؤ میبہ طارق!“ وہ آئینے میں اپنے عکس کو غیرت دلا رہی تھی۔ ماندہ نے جرات سے اسے دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میبہ اس کے سامنے آ رہی۔

”پیارا! ذرا میری طرف غور سے دیکھیں اور سچ سچ بتائیں کیا میں ذرا بھی خوبصورت نہیں ہوں۔“

”میبہ!“ ماندہ کتاب ایک طرف رکھ کر سیدھی ہوئی پھر ہاتھ پکڑ کر اسے قریب نکھالیا۔

”بیٹا! آخر بات کیا ہے؟ پچھلے تین دن سے تم احقنا نہ حرکتیں کر رہی ہو۔ میری جان کو پیڑی

ہے تو شیر کرلو۔“ میبہ گود میں رکھے ہاتھ ملنے لگی۔ اپنی سوچ پر شرمندہ ہو رہی تھی۔

”بڑے اسی لیے ہوتے ہیں کہ بچوں کے پرابلز سولو کر سکیں۔“

”صرف چھ برس بڑی ہیں آپ مجھ سے، کوئی ساٹھ برس بڑی نہیں ہیں جو ہر وقت مجھے پکارتی

میبہ نے معذرت منگی سے کہا، اب اس کا دھیان بھی تو ہٹانا تھا۔ کتنا خیال رکھتی ہیں یہ میرا اور میں کتنی پیار ہیں سوچ رہی تھی ان کے بارے میں، انہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں ان کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوں۔ انہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ وہ الوکا پٹھان تیمور ان کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ماندہ کی گود میں سر کے خوردگان زری تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر احمقوں کے سر پر سینک ہوا کرتے تو یقیناً میرا سر بالوں کی بجائے پتھروں سے مبرا ہوتا۔

+

”تم دونوں میں کوئی مسئلہ ہے یا نہیں، پچھلے تین ماہ سے یہاں آ کر بیٹھے ہوئے ہو نہ کوئی خیر نہ کوئی خیر، تم اپنی ہونٹیں لپٹا لپٹا کر لڑاؤ کیوں ہو تم دونوں؟“ عباس نے گردن اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی، محض نظر لگا کر تیمور کو دیکھا وہ بھی بالکل اسی کے انداز میں کھاتے ہوئے اپنی ماں کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

”جیہا! اخلاقت ہوں، اطمینان سے پہلے کھانا کھا لیجئے، آج میں اور تیمور گھر پر ہی ہیں، سارا دن آپ لڑائی میں لگے، کیوں تیمور؟“ اس نے تائید طلب نظروں سے تیمور کو دیکھا تو وہ سر دھنسنے لگا۔

”بالکل بالکل۔“ عائشہ نے قہر زدہ نظروں سے ان دونوں کو گھورا۔

”مجھے باتوں میں مت الجھاؤ عباس! ڈیڑھ ماہ پہلے تم سیالکوٹ آئے تھے، جب میں بیمار تھی، اس کے بعد ان کو بھی نہ ہوسکا تم سے اور یہ میرا ڈالا بیٹا ہے، اتنا نہ ہوا کہ آ کر بیمار ماں کو شکل ہی دکھا جائے اور لڑائی مالت دیکھو ذرا کوئی چیز بھی ٹھکانے پر موجود نہیں۔ عباس کی شرٹ میں نے برتنوں کی کینٹ سے ماندگی اور چھوڑا ڈروپ میں رکھے ہوئے تھے۔ گندگی حد سے زیادہ۔ لان کی صفائی کرنے کی تو شاید کسی نے کبھی زحمت ہی نہیں کی۔ تمہیں کیا میں نے ان دونوں کے ساتھ صرف آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا باری کے لیے۔“ توپ کارن وسم باری کی جانب ہوا۔

”باری کے بچے۔“ تیمور نے انھیں سے سراٹھایا۔ ”باری کے جھولے، باری کا کھانا اور ہاں کرکٹ ٹیم باری کی ٹیم کی تھی۔ یہ بچے بھی کیا باری کے ہونے لگے ہیں۔“ اس نے عباس سے پوچھا تھا جس نے ہنسنے کے بجائے زوردار ٹھوکر اس کے پاؤں کو رسید کی تھی۔ اس کی باتوں سے بچیا کا غصہ سوانیرے پر پھٹکا تھا۔

”تو کبھی میرے بچوں کی بات کر رہی ہیں۔“ وسم باری منمنایا۔

”تو کبھی عطلات کے مطابق تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی پھر بچے کہاں سے آ گئے۔“ حیرانی کی نیند لگ چکی۔ ”میں اوٹ پٹانگ باتیں ہی آتی ہیں، سخریاں کروالو جو کرکی اولاد نہ ہو تو۔“ بچیا غصے میں سر کھینچ کر ہلکی ہلکی تھپتھپاتی تھیں۔ جہاں پانی پیتے عباس کو اچھو لگا تھا وہیں وسم باری نے اپنا سارن جیسا قبضہ

روکنے کے لیے کندھے پر پڑا رومال منہ میں ٹھونس لیا تھا جبکہ تیسور شدت جذبات سے ٹھوکر مارتا تھا۔
 ”مما! میں اپنے والد کی شان میں یہ گستاخی قطعاً برداشت نہیں کر سکتا، آپ کو فوراً سے چتر گڑھ
 الفاظ واپس لینے ہوں گے۔“ بالکل ماڈرن سلطان راہی والا پوز تھا، صرف لاسے کرتے کے مافی
 گنڈا سے کی کمی تھی۔

”کیا کہا۔“ عائشہ نے زور دار دھموکا اس کے شانے پر جڑا۔ ایک ہی جھٹکے میں سارا کلف ہڑکا
 تھا۔ عباس بچا کو ایکسکیوز دینے لگا۔ حقیقتاً ان دونوں نے بڑی لاپرواہی برتی تھی۔ بچا اول تو سنائی نہیں
 چاہتی تھیں پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

”بہت عیش کر لیے تم نے اور بہت دن رہ لیے چترے چھانٹ۔ بس اب میں تمہاری شادی کرنا
 گی۔“ تیسور کا دھیان فوراً میہ کی طرف گیا تھا جسے آج صبح ہی کئی دنوں بعد دیکھا تھا تو خود کو روک نہیں پاتا
 تھا۔

”کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟“ بڑے دھڑلے سے جا کر پوچھا۔ وہ چنبیلی کی کلیاں چن رہی تھی۔
 ”جہیں کیا تکلیف ہے، میں جہاں بھی تھی۔“ وہی ہمیشہ کاٹ کھانے والا انداز۔ تیسور کو لیٹا ہوا
 ہوئی، اسے اس کے اصل روپ میں دیکھ کر دھڑلے سے مسکرایا اور نرمی سے بولا۔

”کبھی نرمی سے بھی بات کر لیا کرو، آخر ہر وقت مرجھیں کیوں چبائے رہتی ہو۔“
 ”میں مرجھیں چباؤں یا تمہا کو، یہ کم سے کم تمہارا درد نہیں ہے۔“ ترخ کر جواب ملا۔ تیسور بکلا
 اسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”میہ..... خفا ہو مجھ سے؟“
 ”میں ہر ایرے غیرے سے خفا نہیں ہوتی۔“
 ”خدا کا شکر ہے کہ میں ایروں غیروں کے زمرے سے تو نکلا۔“ وہ چڑانے والے انداز میں اچھا
 کر بولا پھر بس کر سنجیدہ ہوا۔

”سنو میہ! میں، ماندا.....“
 ”سنو مسٹر تیسور عارف!“ وہ کلیاں پھینک کر بڑے کڑے تیوروں سے اس کی جانب مگولی، ”مما
 صرف آج کہہ رہی ہوں پھر نہیں کہوں گی، اپنے خیالات کا رخ بدل لو تو بہتر ہوگا، اگر تم نے یا کو مہ
 چھیننے کی کوشش کی تو میں تمہارا خون پی لوں گی۔ کچا چا جاؤں گی تمہیں۔“

”وحشی تو تم شکل سے ہی لگتی ہو، آج باتوں سے بھی ثابت ہو گیا۔“ تیسور کے خیر میں ناگواری بھی تھی۔
 ”اگر تم کچھ دیر اور میرے سامنے رہے تو عمل سے بھی ثابت ہو جائے گا۔“ اس نے دانت کلکاتے
 تھے۔ ”بہر حال یہ طے شدہ بات ہے کہ میں بچا کو تمہیں چھیننے نہیں دوں گی۔“

”جہیں گے کیوں؟ ہم تو انیس ڈکنے کی چوٹ پر اپنے گھر لائیں گے، کیوں دسم وڈرا“ کانٹے سے
 ہلکے آہٹ کھاتے ہوئے اسے اب میہ کی بات کا جواب دیا تھا، ساتھ ہی دسم سے نائید چاہی تھی، اس
 بے پارسی کی جانے بلا گھر آکر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا ہی؟“
 ”ہوں..... کچھ نہیں جی..... ممما! میں کہہ رہا تھا شادی میں جب تک بینڈ نہ بجے شادی کا مرہ ہی نہیں
 آتا۔“

”جیسو!“ عائشہ نے حیرت سے سر اٹھایا۔ ”بچے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، یہ عبد اللہ بھائی کے
 پالیس میں بینڈ بجا کہاں سے آ گیا۔“ انہوں نے اپنے دور پار کے کزن کا نام لیا، تب تیسور کو اپنی حماقت
 کا احساس ہوا، بجائے گفتگو کوں سے موڑ پر تھی، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے ان کے قریب آیا۔

”اس! عبد اللہ بھائی کو رہنے دیں، ان کا چالیسواں اگلے سال کروالیں گے، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ
 بچے! میں پورے چوبیس برس کا ہو چکا ہوں اور ساڑھے چھ ماہ بعد یہ اپنا عباس پورے اکتیس کا ہو جائے
 گا۔ مارا زور پورے پر تھا۔“ میری تو پھر بھی خیر ہے مگر یہ میرا مانا بیچارہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ میرے بارے
 میں نہیں تو کچھ کسی کے بارے میں سوچ لیں۔ آخر کو اس کے دل میں بھی تو کچھ رمان ہیں..... کتنا دل چاہتا
 ہوگا اس کا اپنے بھانجے کو دولہا کے روپ میں دیکھنے کا..... ہے نا ماما۔“ اور ماما صاحب لب بھیچے بس
 نگاہت روک رہے تھے۔ عائشہ نے کمر کرسی کی بیک سے ٹکا کر بازو باندھ لیے۔

”کون ہے وہ؟“ ماں تو آخر اسی کی تھیں، اتنی لمبی چوڑی تمہید سے مدعا تو اخذ کر لی تھا۔ تیسور سر
 کھانے لگا، دل ہی دل میں ماں کی عقلمندی کی داد دے رہا تھا۔

”لوکی ہے۔“ عائشہ نے گھورا تو جھٹ بولا۔ ”آئی مین وہ بہت اچھی ہے ماں!“
 ”کی ماں، اس کی اچھائی کا اندازہ آپ اسی بات سے لگا لیں کہ جب وہ ہمارے گھر آتی ہے تو تیسور کو
 ہر طرف بدگئی ہی روشنی نظر آنے لگتی ہے، یعنی اچالا اور اس سے گفتگو کر کے تو اس کے چودہ طبق روشن ہو
 جاتے ہیں۔“ تیسور نے اسے اصل کی داد دے ڈالی۔

”عہ..... عباس!“ تیسور نے دانت کچکا پچائے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مار ڈالنے کی دھمکی دی مگر
 اسے تھوڑے چکانے کا موقع ملا تھا۔

”گھوڑا کچھ کچا ہے بچیا! ایک روز تو یہ اس کے لیے ریڈر روز بھی خرید لایا تھا۔“
 ”گھوڑا معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔“ عائشہ نے خاصی ”توصیلی“ لگا ہوں سے اپنا ہنہار سپوت کو
 دکھاتا تھا جتنا جتنا کھڑا ہوا تھا۔

”کب آپ میری بھی سنیں گی یا نہیں۔“ پھر بیٹہ کران کا ہاتھ تھام لیا۔

”اماں! آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی، یقین کریں اماں..... مائدہ بہت اچھی لکھی ہے۔“ عباس نے ٹھٹھک کر تیور کو دیکھا جس کا چہرہ دے دے دے جوش سے تھم رہا تھا۔

”مائدہ!“ اس کے ہونٹوں نے بلا آواز جنبش کی تھی۔ ”اگر تیور مائدہ میں انٹر سٹل ہے تو میہ کے لیے اس کی بے تابی کیا معنی رکھتی تھی۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

+

صبح یونیورسٹی وہ اب مائدہ کے ساتھ ہی جاتی تھی، یعنی ڈراپ کرنے کی ذمہ داری مائدہ کی تھی بیکہ وہاں میں لوکل دین کام آتی تھی۔ اب بھی وہ سینڈوچ کھاتے ہوئے بجلت میں گیٹ بند کر کے مڑی تھی ساتھ والے گیٹ سے ایک سو برسی خاتون نکل کر ان کی طرف آئی تھیں۔

”السلام علیکم!“ انہوں نے سلام میں پہل کی۔ خاصی متاثر کن شخصیت تھی۔ میہ تو پہلی ہی نظر میں قائل ہونے کے ساتھ ساتھ کھائل ہو گئی لیکن صورت پہلے بھی کہیں دیکھ رکھی تھی۔

”تم مائدہ ہوتا۔“ ان کے پوچھنے پر مائدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ معزز خاتون کی دلکش مسکراہٹ پکے اور گہری ہو گئی۔

”جیسا تیور نے بتایا تھا تم تو اس سے بڑھ کر ہو..... تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔“ صاف لگ رہا تھا کہ یہ لفاظی نہیں، حقیقت ہے۔ ان دونوں نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

”میں تیور کی ماں ہوں۔“

”اوہ!“ میہ کے چہرے سے سارے متاثر کن اثرات اٹھ کر بھر میں غائب ہوئے تھے۔ یہ وہی خاتون تھیں جنہیں اس نے بہت پہلے اس گھر میں دیکھا تھا۔ مائدہ اب مسکراتے ہوئی ان سے گفتگو کر رہی تھی۔

”تو یہ کس قدر گھٹنا ہے وہ گھونچل..... ماں کو بلو اچھی لیا۔“ اسے مائدہ کا انہیں گھر آنے کی دعوت دینا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

”تیور مائدہ کی بہت تعریف کر رہا تھا کہ میری سہیلی بہت اچھی ہے مگر اس نے مجھے یہ بتایا نہیں کہ اس گھر میں ایک اور لڑکی رہتی ہے جو بے حد پیاری ہے۔“ وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

”جی ہاں اس جہاں میں اچھے لوگوں سے جلتے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔“ جل کر مگر بظاہر ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس دیں۔ ”ویسے میں میہ ہوں۔“

”ارے ہاں یاد آیا، وہ بتا رہا تھا کہ مائدہ کے گھر میں ایمیانام کی ایک تک چڑھی، بدخیز اور نہ پٹ لڑکی رہتی ہے۔“ (ادنیہ..... جیسا بیٹا ویسی ماں) وہ مسکرا کر اس کا سر تھپتھپانے لگیں۔ ”لیکن تم تو بہت پیاری اور کیوٹ بچی ہو۔ یقیناً تیور کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”ابھی میں دو تین روز تک یہیں ہوں، تم لوگ ضرور آنا ہماری طرف۔“

”جی ضرور..... آپ بھی ضرور آئے گا۔“ وہ بڑے بھرپور انداز میں مسکرائیں۔

”ہوں، جلد ہی آؤں گی انشاء اللہ۔“ میہ کو ان کی مسکراہٹ بے حد پراسرار لگی۔ چمکی حس چیخنے لگی۔

”جیسا میری کلاس شروع ہو گئی ہوگی جلدی چلیں۔“ وہ جھٹ پٹ کار میں بیٹھ گئی۔ مائدہ کو بھی ”جی“

پھر اس روپے پر اچھی خاصی جھانسی جس کا اس پر پرتی بھر بھی اثر نہ ہوا تھا، البتہ یونیورسٹی میں بیٹھ ہی گئی۔ پھر اس عید اکرم جیسے سخت پروفیسر کی کلاس میں بھی وہ مسلسل تیور کی ماں کو بھگانے کے ایک مادلن خراب گزارا۔ عید اکرم جیسے سخت پروفیسر کی عزت و آبرو کے ساتھ پروفیسر عبید کے ”اقوال زریں“ سننے ایک طریقوں پر غور کرتی رہی۔ نتیجتاً پوری عمرت و آبرو کے ساتھ پروفیسر عبید کے ”اقوال زریں“ سننے ہوئے کلاس سے باہر جانا پڑا۔ آخری دو کلاسز اس نے خود بنک کیس اور گھر آ گئی۔ گھر پہنچنے ہی جو ایک خاص کم کی تصاویر ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، حالانکہ معمول سے جلدی واپس آ گئی تھی، مائدہ تک پہنچنے پہنچنے سے عجیب سے سکوت کا احساس ہوا۔

”جیسا اب کہاں ہیں۔“ اسے وہ لاؤنچ میں ہی نظر آ گئی۔

”بیشک میں۔“ جیساں کا مصروفیت بھرا جواب موصول ہوا وہ اگر تھکی ہوئی نہ ہوتی تو ضرور اس کی کلاس لیتی۔ ہزار بار بیشک کہنے سے منع کیا تھا مگر وہ جیساں ہی کیا جو دو ہزار دو مرتبہ بتائے بغیر سمجھ جائے۔

”کوئی آیا ہوا ہے کیا؟“ سینڈلز سے چھکارا حاصل کرتے ہوئے بس ایک ”گھوڑی“ ہی اسے عنایت لگائی۔ جیساں نے جو بتایا وہ اس کے حواس میں ”گھوٹنا“ پھیرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بھاگتی ہوئے ڈرائنگ روم تک گئی مگر اسے دروازے میں ہی ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔

وہ کیا چیز تھی جس نے اس کے قدموں کو زنجیر کیا تھا؟

وہ کیا بات تھی جس میں اس کے احساسات کیا تھا؟

اور وہ کیا تھا جس نے اسے اگلے ہی پل جھجھوڑا تھا؟

اندسے آتی عائشہ کی آواز، وہ بڑی وضاحت سے سن رہی تھی۔ ہر لفظ اپنے مفہوم سمیت اس پر واضح ہوا تھا مگر خاموشی چھا گئی۔ پن ڈراپ سائینس شاید اسی کو کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن سن رہی تھیں۔

”مائدہ! میری بیٹی نہیں ہے۔“ باقی کے ٹوٹے پھوٹے شرمندگی و آرزو کی بھرے جملے سے وہ واقف تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے عائشہ کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تھا اور ان کے چہرے پر موجود تاثرات ٹھیک سے نمایاں ناامیدی کی تھی۔ اس کا سر ہولے سے تھپتھپا کر وہ باہر نکل گئی تھیں۔ اصولاً اسے حق بخورنا ہوا کرتے ہوئے انہیں باہر تک چھوڑنے جانا چاہیے تھا مگر وہ نہ جاسکتی تھی۔ اندر بی بی خاموشی سے گلاس وال کے اس طرف نظر آتے سبزے کو دیکھ رہی تھیں۔

”بی بی! اس نے پکارا۔ بی بی نے سر اٹھایا۔

”مجھے کمرے میں چھوڑ آؤ میہ!“ ہارا ہوا کھلاڑی کیسا ہوتا ہے، بی بی جیسا۔ وہ خاموشی سے لبکی دھیل چیز کے پیچھے آن رکی تھی۔

+

درختوں کے بیچ گھری نہر کا کنارہ اسے بہت خوبصورت لگتا تھا مگر وہ کبھی بھی ماندہ کے بغیر کھانڈ آئی تھی، بس کبھی کبھار موڑ ہوتا تو اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہر کے ساتھ ساتھ چلتے صاف سرے لفظ کا نظارہ کر لیتی تھی۔ اس کھڑکی کا بھی ایک مصرف اس کی نظر میں بہتر تھا اور آج وہ تھا اس روڈ پر قدم رکھ ہوئے البتاس اور سٹیل کے پیڑوں کو دیکھ رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کھڑکی سے یہاں بیٹھے ”تیر عارف“ کو دیکھ چکی تھی۔ کچھ بل اس کی پشت کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ آگے بڑھی۔ روڈ اور نہر کا درمیانی حصہ خشک چوں اور سوکھی گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے قدموں تلے پتے چر چرائے۔ تیور کے ہم دروازہ وجود میں خفیف سی حرکت ہوئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

”تم!“ وہ حیرت سے اسے دیکھتا، جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ میہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

”اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو، کیا میں یہاں نہیں آ سکتی۔“ انداز بے حد سادہ تھا۔ تیور نے کندھے اچکا کر پہلی پوزیشن اختیار کی۔ میہ نے چند بل خاموشی کی نذر کیے۔ تیور کی بے اعتنائی کچھ بے معنی آواز تھی۔ شام کے کھوجانے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ابتدائی گرمیوں کے اس تیسرے پہر میں کوئل کی کل بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

”کیسے ہو تم؟“ اس نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ خاصی لا پرواہی سے جواب دے کر وہ وسنگ کرنے لگا تھا، ساتھ ساتھ دایاں پاؤں بڑے ترنگ میں حرکت کر رہا تھا۔

”تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟“

”جانا کہاں ہے میرے پاس ہی رہتی ہیں۔“ وسنگ یکدم تھمی مگر پاؤں کی حرکت جاری تھی۔

”تمہاری ناراضی ختم ہو گئی؟“ گردن موڑ کر اسے دیکھا جو دو زانوؤں کے گرد بازو لیے، جھنڈا، ٹھوڑی لٹائے بیٹھی تھی۔ سوال سن کر چہرے پر جھل سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”میری تم سے کوئی ناراضی نہیں ہے۔“ چہرے پر آئی لٹ کان کے پیچھے کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ تیور نے چند بل اسے دیکھنے میں صرف کیے۔ (اور یہ چند بل بہت گہرے تھے)

”تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ ماندہ تمہاری بہن نہیں ہے۔“ اس نے ایک پتھر زور سے پانی میں اچھلا

”بی بی! اس نے پکارا۔ بی بی نے سر اٹھایا۔

”مجھے کمرے میں چھوڑ آؤ میہ!“ ہارا ہوا کھلاڑی کیسا ہوتا ہے، بی بی جیسا۔ وہ خاموشی سے لبکی دھیل چیز کے پیچھے آن رکی تھی۔

”تم نے کہا تھا کہ تم یہاں کو پسند کرنے لگے ہو۔“ میہ نے جلدی سے کہا۔

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب ”تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں ماندہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔“

”اب خواجہ شرمائی کی کوشش مت کرو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم شرمائے ہوئے عام حالات سے بڑی زیادہ بد صورت لگو گی۔“ میہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ آگ لگے محبت کو، جہنم میں جائے ہر احساسِ جگر میں اب بھی شور مچا تھا مگر دیہا جیسا روڈ پر بھائی ٹریفک کا ہوتا ہے۔

”ایسی ہی بد صورت لگتی ہوں تو کر لیتے کسی خوبصورت سے محبت۔“

”میرے اختیار میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا مگر ہائے یہ دعا باز دل۔“ خاصی بے بس اور مایوسی بھری آہ تھی۔ میہ کو ہنسی آگئی جسے رخ موڑ کر چھپایا۔ تیور بھی محظوظ ہو کر ہنسنے لگا۔ نجائے کیا ہے مگر جب بہت دلوں کے اندر تاج محل تعمیر کرتی ہے تو قدرت ایک بل کو مسکاتی ضرور ہے، جیسی ہوا ٹھنکتی ہے، تہی کیاں بچتی ہیں، ان دونوں کے گرد سنبھل کے بہت سے سرخ پھول ہوا کے زور سے زمین کو بوسہ دینے آئے تھے۔

”بیامیرے ماموں کی بیٹی ہے۔ تقریباً پانچ سال پہلے حالات آج سے بہت مختلف تھے۔ ہماری شجاعت ماموں کی فیملی کے درمیان کوئی تناؤ نہ تھا۔ بابا کے انتقال کے بعد اجد بھائی کا دھیان اپنی اسطرح کی طرف سے بالکل ہی ہٹ گیا تھا پھر جن دنوں پیاماسر زکر رہی تھیں ان ہی دنوں اجد بھائی نے بی بی سے اپنی شادی کی بات کی تھی۔ بی بی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ شجاعت ماموں بھی راضی تھے۔ دوسری طرف پیاماسر اجد بھائی کی کافی انڈر اسٹینڈنگ بھی تھی۔ مختصر سے معاملات طے پانے کے بعد دونوں کا نکاح ہو گیا اور رخصتی پیما کی اسٹڈینٹل ہو جانے کے بعد تک ملتوی کر دی گئی۔ ایسا اجد بھائی کے کہنے پر ہوا تھا پھر۔“ خاموش ہو گئی۔ تیور اسے بہت دھیان سے سن رہا تھا۔

”پھر؟“

”پھر۔“ اس کی نگاہوں میں وہ پل گھوم گئے جب اجد بھائی چلے گئے تھے انہیں تنہا چھوڑ کر ”پھر اجد بھائی ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔“ اس کی آنکھ سے ایک قطرہ چمک کر خشک چوں میں آگیا تھا۔ ”نجائے وہ کہاں چلے گئے تھے، یہ بات ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا مگر یہ بات ہمیں کچھ عرصہ بعد پتہ چلی کہ وہ ماموں سے جہیز کے نام پر ایک کثیر رقم بنو کر گئے ہیں۔ یہ بات ماموں نے ہمیں بہت خفا سے بتائی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ انہیں رقم کا غم نہیں ستا رہا تھا بلکہ وہ ان کی بیٹی کا مقدر تھا، وہ خواب تھے جن کی کرچیاں بکھری تھیں۔ ان کے چلے جانے کے تقریباً تین یا چار ماہ بعد بی بی کی ناک میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ضائع ہو گئی تھیں اور پتا ہے تیور! ایسے میں کس نے ہمارا ساتھ دیا؟ بیانیے..... ماموں ہم سے ہر رابطہ ختم کر چکے تھے، ایسے میں بیانیے ہی ہمارے اخراجات کا بار اٹھایا، حالانکہ ماموں ان سے خفا ہو گئے تھے پورے دو سال ماموں جی نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی اور.....“ وہ پھر خاموش ہو گئی کیونکہ اس سے مزید بولا ہی نہیں گیا تھا۔ بہت سارے لینے کے بعد اس نے دوپٹے سے چہرہ خشک کیا۔ تیور نہر کے دھڑکی طرف درختوں کی قطاروں میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔ شام گہری ہو چلی تھی۔

”میرے نے تم نے۔“ میہ نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ”آئی مین مائندہ کے بارے میں کچھ کیا سوچا ہے تم نے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو تیور! میں کبھی نہیں۔“

”واٹ ڈو یو تھنک میہ! جو لوگ اپنی زندگی دوسروں کے لیے تیاگ دیتے ہیں، کیا وہ خواب نہیں دیکھتے کیا ان کے دلوں میں ارمان نہیں ہوتے، کیا ان کے ٹکناں زندہ وجود کسی کے کندھے پر سر رکھ کر سکون دیکھتے کیا ان کے دلوں میں ارمان نہیں ہوتے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ میہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”میں میہ! آنکھوں کو خواب دیکھنے سے روکا نہیں جاسکتا، دلوں میں پنپنے والے ارمانوں پر پہرہ نہیں لگایا جاسکتا اور یہ جو ایک خواہش ہے ناکسی کے کندھے پر سر رکھنے کی، یہ تب تک پوری نہیں ہوتی جب ہی غم بھاندا جائے، جب تک غم کو سیٹ لینے کا یقین نہ ہو۔ کبھی کبھی مضبوط نظر آنے والے لوگ مضبوط نہیں ہوتے میہ! اپنے گرد چڑھایا جانے والا خول انہیں ہر دم اس میں مقید رہنے پر مجبور کرتا ہے۔“

”تم تو بول رہے ہو جیسے بہت تجربہ ہو۔“ اس نے مصنوعی سے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ یہ ہر دم ٹانگ باتیں کرنے والا تیور تو قطعاً نہیں لگ رہا تھا، وہ اس کی بات سے جیسے محظوظ ہوتے ہوئے بٹا تھا۔

”اب ہر کوئی تمہاری طرح احمق نہیں ہوتا کہ تجربے سے ہی عقل حاصل کرے۔ خیر یہ بتاؤ مائندہ کو کب تک خدک محدود رکھنے کا ارادہ ہے؟“

”اے، کیا مطلب۔“ پھر خود ہی بولی۔ ”میں نے تو ایسا کبھی بھی نہیں چاہا کہ وہ مجھ تک محدود ہیں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو تم نے اب تک اس کے بارے میں کچھ سوچا کیوں نہیں؟ آخر کب تک وہ اجد کا غم کرسے گی۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے کبھی ایسا خیال آیا ہی نہیں بلکہ..... بلکہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں۔“ وہ جیسے اپنی عقل پر افسوس کر رہی تھی۔

”تو اب سوچو میہ خاتون!“ وہ ہاتھ جھارتا کھڑا ہوا۔ ”کہ مائندہ اور عباس کی جوڑی کیسی لگے گی۔“

”میرے لیے میہ کچھ کا گیا تھا، وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ سوچ کو ایک نیا رخ ملا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ پسندیدہ ستیوں کا ملاپ۔

”میرے لیے میہ کچھ کا گیا تھا، وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ سوچ کو ایک نیا رخ ملا تھا۔

✦

✦

میبہ۔
 ”جی! وہ اس سے لپٹ گئی اور اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے خودمکمل بنا کر دغا کرنے اور اچھے وقت کی امید دلا سکے۔ میبہ کسی انہونے احساس کی تخت اس سے الگ ہوئی تھی۔ اسے برستی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ ماندہ تو نہ تھی جسے میبہ جانتی تھی۔ تھا کہ ہوا چہرہ، ہر احساس

یہ سچ تھا کہ اس نے ماندہ کو اب تک اس نظر سے نہ دیکھا تھا، کچھ مہر کی بہن کی طبیعت کا یہ
ہمسائیگی کا پاس..... کچھ ایسا شریف بھی نہ تھا، اپنے زمانے میں چھوٹے موٹے فخر تو اس نے بھی
ہی تھے پھر رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کا ادراک، ذاتی حلقہ احباب اور صنف نازک کے درمیان طے کرنے
معمولی اہمیت نے اسے مغرور بنا دیا تھا۔ ڈیٹنگ اور رڈ جیسے القابات تو وہ اب تک مستحق تھا تاہم
دیئے گزر جاتا تھا۔ چند قدم تک ساتھ چلنے والی لڑکی کا انتخاب بھی وہ بہت دیکھ بھال کر کرنے کا غامض
ساری زندگی کسی کو ہم قدم بنانے کا اس نے اب تک نہ سوچا تھا۔ اپنی مردانہ خصلت کے ہاتھوں مجسمہ
ہوئے اس نے پہلی ہی سرسری سی نگاہ میں ماندہ حسین کا تفصیلی جائزہ لے لیا تھا مگر ایک تو یہ کہ وہ کئی
”پہنچی ہوئی“ چیز نہ تھی، دوسرا اس قسم کے معاملات میں اس کی ”انا“ ”ہیشہ“ ”اپوریت“ پر رکتی تھی،
اب بھی یقین تھا کہ اس قسم کا کوئی رپانس ماندہ کی طرف سے ملا ہوتا تو وہ ضرور اب تک دونوں ڈیٹنگ
ہوتا مگر بہر حال بعد کے دنوں میں اس نے کبھی بھی کوئی غلط بات نہ سوچی تھی پھر جب تیور نے اس
ماندہ کے لیے کہا تھا تو وہ ضرور راضی ہو گیا تھا کہ زندگی کسی کے ساتھ تو گزاری ہی تھی پھر تیور مغرور
کو بھی وہ پسند آئی تھی مگر بعد میں سب ختم ہو گیا۔ اس نے اس بات کو کچھ خاص اہمیت نہ دی تھی اور نہ
آنے والے دنوں میں دینے کا ارادہ تھا مگر اب کی بار بھی کچھ اچھل پھسل ہو گیا تھا، جب اس نے ماندہ کو
تھا نو خیز صبح میں وہ عام سی لڑکی، عام سے حلیے میں یکدم بہت خاص کام کر گئی تھی۔ پانی سے لبرزد
آنکھیں..... عباس مصطفیٰ کو ایک پل ہی لگا تھا اپنا آپ ہارنے میں۔ اب تک اس کا سامنا خاموشی
سے ہوتا آیا تھا، یہ پہلی عام لڑکی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ

”عام لوگوں سے بچنے میں ہی عافیت ہے۔“ اس نے گردن کو ذرا ساموڑ کر دیکھا، درمیان کے
پنچ چھوڑ کر وہ سرد پوار سے ٹکائے چھت کو گھور رہی تھی، اس نے نگاہ موڑ لی، جو چیز آپ کی ہے اور نہ آپ
ہو سکتی ہے اسے دیکھ دیکھ کر آج میں بھر نے سے فائدہ۔ اسے یکدم خود پر غصہ آیا تھا کیونکہ وہ اس لڑکی کی طرز
سے دھیان ہٹانہ پار ہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس شخص پر بھی غصہ آیا تھا جو اس لڑکی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
”تیور! میں گھر جا رہا ہوں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”شاور لینے کا ارادہ ہے کچھ
سوؤں گا بھی..... آں کچھ چاہیے ہو تو بتا دیجئے، میں واپسی پر لیتا آؤں گا۔“ اسے یہ نہیں کہہ کر توجہ
کیوں کہہ دیا۔

+

پورے تین ہفتے ہاسپٹل میں گزار کر گھر واپس آئی تھیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ درود پوار ہی مسکرا
ہوں اور مسکراتو رہے تھے، درود پوار انہیں بلکہ تیور اور مہر..... انہیں ان کی کامیابی ایسا کرنے پر مجبور کرنا

صرف تمہاری وجہ سے بی بی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے۔ کاش تیور! تم مجھے پہلے مل گئے
۔ واپس پرواہ سے گٹ تک چھوڑنے آئی تو بڑی شکر گزاری کے سے انداز میں بولی۔
”میں بھی نہ بوا میلی جراب ہو گیا جوتل گیا تھا۔“ وہ ہنس دیا۔ اسے کچھ خیال آیا تو پوچھ لیا۔
”ہاں خیریت سے ہے، کافی دنوں سے میں نے دیکھا نہیں اسے۔“

”ہاں تو خیریت سے ہی ہے، البتہ تمہاری خیریت مجھے کچھ مشکوک لگ رہی ہے۔ یہ یکدم میرے
دیکھنے کا خیال کیسے آ گیا۔“

”اگر جیسا باتیں مت کرو تیور! میں تو یوں ہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ جھینپ سی گئی۔

”تب نہیں کہلی بنایا ہے ماننا تو پڑے گا ہی، خیر عباس کی کچھ طبیعت گڑبڑ ہے، بس اسی لیے۔“

”تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”بھانپتا تو تم کیا کر لیتیں۔“

”تو کبھی تو کم سے کم عیادت ضرور ہی کر لیتی۔ آدمی بیماری تو یوں ہی ختم ہو جاتی ہے۔“

”کیا ہاں، جبکہ عیادت کرنے والا بلکہ والی بھی آپ جیسی ہو۔“ وہ کہہ کر چلا گیا، شام میں وہ ان کی
ہاتھ کا ارادہ کر رہی تھی۔ بی بی کی بیماری میں جتنا ان دونوں نے ساتھ دیا تھا، اب اس طرح سے
شکوک کا فرض بھی ہی تھی مگر پھر فون پر ہی خیریت معلوم کر لی۔ باتوں سے باتیں نکلیں اور وقت
سے کچھ بچے جس چلا پھر ایک روز وہ بی بی کی خیریت معلوم کرنے چلا آیا، کافی دیر بی بی کے پاس بیٹھا
سے کچھ بچا، فرمائش کر کے کافی بھی پی اور اس کے جانے کے بعد وہ واپس کمرے میں آ کر
خیریت کرنے لگی۔

”تو کیا ہو؟“

”بی بی کے پوچھنے پر مصروف سا جواب دیا۔

”تو کبھی کبھار کا ہے عباس! ہے نا۔“ وہ بس مسکرا دی۔ بی بی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر جب وہ
نہایت کفر سے قریب آئی تو وہ دھیرے سے بولیں۔

”اے ہمارے چلہ کا اور دعا کی کہ اے میرے رب! اس پتھر کو سونا بنا دے، ساری رات گزر جانے کے بعد اے چلہ پتھر سونا بنا تو وہ شخص بھی آ کر کہنے لگا کہ اے میرے خدا! اس پتھر کو سونا نہیں بنا تا تو لو ہا ہی بنا کیج۔ پتھر سونا نہیں بن سکا مگر لو ہا ضرور بن گیا..... سنو میہ! میں بھی بچپلے پانچ سالہ اور ہی قنوت کا تھا، پتھر سونا نہیں ہوا، اپنے نفس کی حفاظت کرنا چلہ کا شای تو ہے۔ تم خود ہاں سے ایک پاؤں کے سہارے چلہ کاٹ رہی ہوں، اپنے نفس کی حفاظت کرنا چلہ کا شای تو ہے۔ تم خود پتھر کھینچنے ہا کر لو ہا بننے کی دعا کر لی اور وہی وقت قنوت میں کیا کروں گی۔“

”ابجد الہی نہیں آئیں گے کیا! آپ کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی خراب کر رہی ہیں۔“

”وہ آگاہی دیکھنا میہ! وہ ضرور آئے گا۔ میرے لیے نہ سہی تو تمہارے لیے اور تمہارے لیے نہیں آئے گا۔“

”یہ آپ کی خام خیالی ہے یا؟“ وہ طنز سے ہنسی تھی۔ ”اگر انہیں واپس ہی آنا ہوتا تو وہ جاتے ہی ہوں؟“ جس نے اس کا خیال نہیں آیا یا پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی تو پھر اب.....“ اس نے مڑ کر دیکھا مائدہ میں رہا نہیں تھی۔

یہ کہتے تھے وہ نہیں آئے گا، بی بی کہتی تھیں آگے جانے والے پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو پتھر کے ہو جائے ہیں اور امجد طارق کو ہمیشہ پتھروں سے نفرت رہی ہے اور اب مہیہ بھی یہی کہہ رہی تھی مگر اسے یقین تھا کہ لوٹ آئے گا جمی تو پانچ سال اس کے انتظار میں گزار دیے تھے مگر ضروری تو نہیں کہ جواز بنا پر ہو وہی لڑائی ہو۔ اس کی امید تو تھی ٹوٹ تھی جمی جب امجد طارق فرانس روانہ ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے، سوائے ماندہ کے۔ جانے سے قبل وہ اس کے پاس آیا تھا۔

”مجھے پانڈیاں اچھی نہیں لگتیں اور میں کسی کو پابند رکھنے کا قائل بھی نہیں ہوں، تم جب بھی آزادی ملے گا پانچویں مجھے لکھ دینا۔“ مادہ آئی پراس میں تمہاری خواہش پوری کرنے میں ایک بل بھی نہیں ہے۔ اچھی بہت آگے جا رہے اور پھر رشتے میری راہ میں ایک رکاوٹ ہیں مگر اب نہیں۔۔۔۔۔۔“

”میرے قریبی خاندان کے دوستوں میں کشتی دے کر پتوڑا مرہا لے گیا تھا اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میری خواہش تو ہے پھر طارق اور میں بھی تو تمہاری خواہش تھی پھر یکا کیا ہوا، یہی بتا جاؤ کہ جو رستے تمہاری راہ میں رکاوٹ تھے ان میں سے کون سا تک پہنچنے کی سیر میں کیوں بنایا اور اب کئی سالوں سے وہ سچے چھوڑ میں ڈول رہا ہے۔“

✦

”اور بہت چاہتا بھی ہے تمہیں، ہے نا۔“ اسے لگا تھا کہیں بجلی کڑکی ہے۔ کیا بالی بالی اس پر اثر ہو گا؟
تھیں؟

”کیا..... کیا اس نے آپ سے خود کہا ہے؟“ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔
 ”اوہوں اندازہ ہے میرا۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بی بی۔“ خدا جانے اس نے کس کو جھٹلایا تھا۔ بی بی کو یازہن میں جھٹلایا تھا۔ مصطفیٰ کی آنکھوں کو۔ بی بی ہنس دیں نرمی سے۔

”یہ جو میرے سر پر سفید بال ہیں ناماندہ یہ تجربے کی دھوپ میں سفید ہوئے ہیں۔ عباس کی آنکھ میں جو تحریر ہے نامیں اسے کئی دنوں سے پڑھ رہی ہوں۔“ انہوں نے توقف کیا پھر اس کا سونٹا چروا کر اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”تم میری بیٹی نہیں ہو مگر یقین کرو مجھے تم میری سے بڑھ کر عزیز ہو۔ یہاں ہونا تو بات دوسری تھی پھر میں تمہیں کہیں بھی نہ جانے دیتی مگر..... ناماندہ! جب خوشیاں دوانا کھڑی ہوں تو کسی اور کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ عباس بھی ان ہی خوشیوں کا حصہ ہے انہوں نے کہا کہ آ نکھیں موند لیں تو وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گئی۔

”میں نے تو اپنا آپ سنبھالنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی بی بی! کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر لیے نہیں دیکھا کیونکہ میں نفس سے خوف زدہ تھی، میں تو بس شیطان کو ہی مات دیتی رہی۔ اب۔۔۔ اب وہ ہی میرے بارے میں کچھ اور سوچنے لگا تو۔۔۔۔۔ اس میں میرا کیا قصور۔“ گھر کی پھٹی جانب مومن خاتون آلوچے کے پتے بھی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سارا سفر اکارت جانے کا وقت آگیا غلطی غلطی یہ ہوئی کہ میبہ نے بات کرنے کے لیے غلط وقت چنا۔ وہ پہلے ہی ابھی ہوئی تھی۔ سننے بھڑک اٹھی۔

”خدا کے لیے مہیہ! مجھے اس گاؤں کا رستہ مت دکھاؤ جہاں مجھے جانا ہی نہیں ہے۔“

”آخربرائی کیا ہے عباس بھائی میں؟“

”کوئی برائی نہیں ہے، وہ بلاشبہ ایک اچھا انسان ہے۔“

”جب اچھا انسان ہے تو.....“

”تم کیا چاہتی ہو میہ! میں گناہ کروں، ایک نکاح پر دوسرا نکاح پڑھواؤں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

اجازت دی ہے جو.....“ مائدہ اسے حیرانی سے نکلے گئی۔ یہ لڑکی کب اسی بڑی ہوئی ہوگی؟
دکھانے لگے۔

”تم نے وہ حکایت تو سن رکھی ہوگی نامیبہ! کہ ایک شخص نے پھر سامنے رہ کر...

اور وہ واقعی ڈرتی تھی جی اپنا راستہ بدل گئی، اگرچہ پہلے بھی سامنا کم ہوتا تھا مگر اب تو دھڑکنے کی سہمی مسلسل کی جائے تو سہمی ایک جاتی ہیں اور وہ جو سمجھ رہی تھی کہ رستہ بدلنے سے ہر چیز درست ہو جائے گی، خود ہی سب کچھ بھٹکا بیٹھی۔ وہ عباس مصطفیٰ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر ہر پل نادانستہ اسے سوچنے لگی اور جب کبھی سوچتا تو خائف ہو کر رونے لگتی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے وہ خدا سے پوچھ رہی تھی، جب میرا خدا آئی۔

”تیور کا برتھ ڈے ہے اور اس نے ہمیں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔“
”تم چلی جاؤ، میرا مود نہیں ہے۔“ جائے نماز کو تہ کر کے وہ کھڑی ہوئی۔ میہ نے خاموشی سے اسے دیکھا پھر بڑھ کر اس کے کندھے تھام لیے۔

”مجھے لگتا ہے آپ عباس بھائی سے محبت کرنے لگی ہیں، ان کا سامنا کرنے سے کتر اری ہیں۔“
”بکو اس مت کرو میہ!“ اس نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ ”یہاں محبت کہاں سے لپک پڑی۔“
”اگر میری بات غلط ہے تو کیوں چھتی پھر رہی ہیں، بلکل ہی تیور مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھ تھا۔“

”میہ! تم کبھی کبھی بالکل ہی دماغ خراب کر کے رکھ دیتی ہو، میں بھلا کیوں چھوں گی۔ تم جانی کالج میں کتنا کام ہے ان دنوں، بی اے کے ایگز امز ہو رہے ہیں اور..... ٹھیک ہے میں چلوں گی۔“ اسے رد کرنے کی خاطر تیار ہو گئی۔ میہ نے خوشی سے چیخ ماری پھر قاف تیور کا نمبر ڈائل کیا۔
”پیا آئیں گی..... ارے نہیں..... ہاں بھئی..... اچھا تم ارج کر لو۔“ پھر اس کی طرف بلی۔ ”پاا“
آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ ماندہ نے بڑھ کر ریسور لے لیا۔
”کیسی ہو سکیلی؟“

”زندہ ہوں اور ویسی کی ویسی ہوں۔“

”یعنی نیک چڑھی اور بد مزاج۔“

”ارے میں ماندہ بول رہی ہوں، میہ نہیں۔“

”جانتا ہوں اس کی سریلی آواز کو تو میں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔“
”ا..... اچھا۔“ اس نے میہ کو خواہ معنی خیز انداز میں دیکھا تو وہ اس سے چپک کر باتیں نہ کی۔
”ہوں یہی بات ہے، باقی باتیں تم بھی سوچ لو۔..... یار اب تو میں اپنا ذاتی برنس بھی اٹھانے لگا ہوں۔“

”ننگی۔ تو پھر میں ڈیل ٹریٹ لوں گی۔“
”مہمے میں جنہیں کئی بار ٹریٹ دیئے کو تیار ہوں، بی الحال تم سا لگرہ میں تو آؤ۔“
”مہمے بڑے ہو کر سا لگرہ مناتے ہو شرم نہیں آتی۔“
”بالکل نہیں۔“ وہ ڈھیل ابن ڈھیل تھا، پہاڑ کے نیچے کیسے آتا۔ صبح وقت پر آنے کی تاکید کر کے بند کر دیا۔

من آگن میں شہر بسا ہے

شہر میں اک دریا بہتا ہے

دریا کی لہروں میں رہتے

رستوں میں ان دیکھے سنے کھلے ہوئے ہیں

خواب، دھنک، خوشبو اور چہرے ملے ہوئے ہیں

تیز ہوا میں دیپ سے کے جلے ہوئے ہیں

لیکن شہر کے دروازے پر

بے خوابی کے دکھ سکھ اڑھے

جانے کس کی آس میں آکھیں

نیندوں کا پہرہ دیتی ہیں

کبھی کبھی زندگی میں کڑے امتحان بھی دینے پڑتے ہیں جو بظاہر بہت آسان مگر بے حد سخت ہوتے ہیں وہ بھی ایک ایسا ہی امتحان دینے جاری تھی۔

”کیا معیت ہے، آخر میں اتنا گھبرا کیوں رہی ہوں۔“ اس نے خود کو گھر کا اور گھر اسانس بھر کر چوٹی کے بل کھل کر کے میز چڑھایا۔ شیشے میں اپنا جائزہ لیا پھر کچھ سوچ کر براؤن شیز کی لپ اسٹک بھی لگالی۔
”تمنا بھی مٹی سے چڑھی تھی، آخر ایئر رنکز بھی پہن لیے۔ اپنی طرف سے اس نے بہت نارمل سی تیاری کی تھی بالکل ویسی ہی جیسی ہر روز کالج جاتے ہوئے کرتی تھی۔ میہ کو چلنے کے لیے کہا تو وہ فوراً کمرے سے نکل آئی اور ماندہ کو لگتا تھا کہ اس نے تنقیدی سی نگاہ اس پر ڈالی ہے۔ میہ نے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر تیور تو خیر بلی بھی لگی لگتی نہ رکھتا تھا، بڑے پر جوش انداز میں استقبال کیا گیا مگر جوں ہی اس پر نگاہ پڑی نہایت ناگوار محسوس ہو کر بھاگ گیا۔“

”تمنا نے تمہیں اپنی سا لگرہ پر انوائٹ کیا تھا، رسم چہلم میں نہیں۔“

”مصلحت تو خیر تمہاری بری ہے مگر کم سے کم باتیں تو اچھی کر لیا کرو۔“ یہ جواب میہ کی طرف سے آیا تھا۔
”مہمے بڑے ہو کر سا لگرہ مناتے ہو شرم نہیں آتی۔“ یہ جواب میہ کی طرف سے آیا تھا۔

”دیکھو لینی ہے تو لو ورنہ واپس کر دو۔“ منیبہ چڑھائی تو وہ اسے دیکھتے ہوئے نہ دیا۔
 ”محترمہ! جو چیز ہم ایک بار لے لیتے ہیں اسے واپس نہیں کیا کرتے۔“ منیبہ شہناز کو مہاسے بانٹا
 کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد تیور نے ہی تجویز دی تھی۔

ایک بات بتاؤں مانگہ؟“ اس سادہ منہ زبانی بندہ بغیر اجازت کے تو کوئی بات کر ہی نہ سکتا تھا۔
 فیصلہ کر کے کہیں چلتا ہے، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ۔
 ”چھوڑو اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پتھر کو تو آپ ایک ٹھوکرے سے ہٹا سکتی ہو مگر انسان کو نہیں۔“

اور میں پتھر نہیں ہوں۔“ ایک گہری دلفریب مسکراہٹ ان کھوں کی نذر کر کے وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار پلٹی، عباس مصطفیٰ سینے پر بازو باندھ کر کھڑا تھا اور نگاہیں اس پر تھیں۔ سنجیدہ سے چہرے پر نکھر اُبھرتے ہوئے احساس سے لبریز تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

+

کبھی مصروفیت کی تیز آندھی

کبھی حالات کے جھٹکے

کبھی کھائے ہوئے سارے فریبوں کی جھلکتی یاد کی

اور کبھی اپنی گزشتہ بے وفائی کے ندامت خیز منظر

کبھی خوں کی حرارت، جسم کی حدت، خیالوں کی تمازت کو

خیال و خواب کرتی

سال و سن کی برف باری

کبھی کچھ تملاتی خواہشوں کا رقص و دشت

مجھے مجبور کرتے ہیں

کہ میں اندر کی جانب کھلنے والے سارے دروازے مقفل کر کے

خود کو صورت حالات میں محصور کر لوں

مفاد و مصلحت کو ذات کا منشور کر لوں

زمانے کی شرائط جو بھی ہیں منظور کر لوں

مجھے بھی وقت کے فرمان سے انکار تو شاید نہیں لیکن

محبت کا در پچھ بند ہونے میں نہیں آتا

کھڑکی کے کھلے پٹ سے تروتازہ ہوا کا جھونکا جس بل اس کے چہرے کو چھو کر کے کی ناسواں

میں نکھرا، وہ کھل کر مسکرا دی۔

”ٹھیک ہے میری زندگی ہے، میں جس کے ساتھ چاہے گزار دوں..... جس طرح سے مرضی گزارا

مگر اب مجھے اجد طارق کا مزید انتظار نہیں کرنا۔“ فیصلہ ہو چکا تھا اور اب وہ خود کو بے حد ہلکا چھلکا محسوس

رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ وہیں کھڑی آسودہ سانس لیتی رہی۔ فیصلہ کرنا اگرچہ مشکل ہوتا ہے مگر جب وہ

ہے تو اس طمانیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے بالوں میں برش پھیرا پھر ڈھیلی سی چوٹی باندھ کر

سیدہ بی بی لوگ روم میں تھیں۔

”سیدہ! کون سے چلیں۔“ اس نے جیساں کا اسی طرح بھاتی میہ سے پوچھا۔ میہ نے قدرے حیرت سے

دیکھا، کچھ ہی قسم کا رد عمل بی بی کا تھا۔ اس قسم کی فرمائشیں عام طور سے میہ کیا کرتی تھی اور ماندہ ہمیشہ

دیکھا، کچھ ہی قسم کا رد عمل بی بی کا تھا۔

اس کے کہنے پر راضی ہو جاتی تھی۔

”میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گی۔“ میہ کو پھر جھٹکا لگا۔ بی بی نے بھی ایسی بات پہلی بار کی تھی۔

”میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گی۔“ میہ کو پھر جھٹکا لگا۔ بی بی نے بھی ایسی بات پہلی بار کی تھی۔

بل جب وہ لوگ تیار تھے تو وہ کیوں انکار کرتی اور وہ ان کی زندگی کی ایک بہترین شام تھی۔ کالونی کا

ایک نہر کا کنارہ۔ جہاں رک کر انہوں نے خوب ہی قہقہے لگائے تھے۔ ماندہ خوش تھی کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی

تھی کہ بی بی کو اس کے چہرے پر نکھری مسکان بنی سی لگ رہی تھی جس میں خود ساختگی نہیں بلکہ بے ساختگی

ہو آج تو اس کی آنکھیں بھی اس کے ساتھ ہی مسکرا رہی تھیں۔ نہر کے کنارے بیٹھ کر انہوں نے تالیاں

بجا کر گونے لگائے تھے۔ بی بی نے انہیں اپنے دور کا مشہور گانا سنایا تھا پھر پھر مار کر آم توڑے گئے اور

اس کا سفر ہی خوشگواریت میں ہوا تھا۔

عباس مصطفیٰ نے ٹیس کی گرل پر کہیاں نکائے کافی کی چکیاں بھرتے ہوئے کسی قدر حیرانگی سے

دیکھا کہ وہ کھاتا پھر خفیف سا مسکرا دیا تھا۔ ”ہنستی مسکراتی زندگیاں۔“

ای اٹھا میہ نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر ماندہ کو بتا کر بی بی کو ادھر متوجہ کیا تھا۔ عباس نے وہیں سے

نہ ہٹا کر انہیں دس کیا، اگرچہ اس کا ارادہ ان کے پاس جانے کا نہیں تھا مگر میہ کے بلانے پر چلا گیا۔

اور ازلہ سلام کرتے ہوئے اس نے ویل چیر پر بیٹھی بی بی کے آگے سر جھکا دیا۔

”جیتے رہو۔“ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے دعا دی۔ وقت چاہے کتنا بھی آگے

رک جائے مگر سر پر پیار لینے میں الگ ہی مزہ ہے پھر اس نے تو یوں بھی بچپن میں ماں باپ کے پر شفقت

انہوں کا کس محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلے ماں جنم دیتے ہی چلی گئی، پھر باپ بھی..... بچا اس سے کم و بیش اشارہ

ملنے لگی تھی۔ باپا کو شاید اپنی موت نزدیک نظر آ رہی تھی تبھی ان کی شادی کم عمری میں کر دی۔ عارف لالہ

نے اسے بالکل باپ کا سایا یاد کیا تھا اور اس بات کا اسے احساس تھا جو بہت کم عمری میں ہی ہو گیا تھا۔ جوں

تھا تو بچہ میاں چڑھتا گیا، یہ بوجھ کم سے کم ترک کرنے کی تمنا نے اسے ہر مقام پر کامیاب کیا تھا۔ ماندہ

نے تھوکی بات پوچھا تو وہ بولا۔

”سہرا ہے۔“

”میں ہوں۔“ میہ کو ہی اعتراض ہوا تھا۔

”مگر تم نے کہا تھا اور پتا نہیں کیوں ماندہ مسکراتی تھی۔“

”تم کئی دن سے مگر نہیں آئے عباس! حالانکہ میں نے تمہارا انتظار کیا تھا۔“

”میرے پاس میری کار ہے۔“ عباس نے خاصی ناگواری سے گیٹ کے اندر رکھڑی منہ چراتی سفید

”جاسی کھارا ہو چکی ہے۔“ بالکل رقیب لگی تھی۔
 ”کھارا ہے، ناکارہ تو نہیں۔“ اس نے اپنی ہنسی روکی بھر ایک ستائشی نظراس پر ڈالی۔
 ”یہی بی بی ٹھیک کہتی ہیں۔“
 ”سکا؟“ وہ تجسس ہوا۔

”یہاں آپ کرتا شلوار میں بہت اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے سادگی سے کہا کہ بی بی واقعی ایسا کہتی تھی۔ عباس نے اس کی بات کو کافی انجوائے کیا تھا، ساتھ ہی پھنوس اچکا کر اسے دیکھا۔

”کھانا صرف بی بی ایسا کہتی ہیں۔“ تبسم و شرارت بھرا لہجہ حد درجہ معنی خیز تھا۔

”نہیں، مہیہ بھی ایسا ہی کتنی ہے اور۔“ وہ کار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ”اور میں ان دونوں سے یقیناً متفق ہوں۔“ اس نے وہی کہا تھا جو عباس سنا چاہا رہا تھا، اس کا قبہ تہ زبردست تھا۔

”حسین لڑکیاں اس وقت اور بھی حسین لگنے لگتی ہیں جب وہ سچ بولتی ہیں۔“

”میں چلتی ہوں..... دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا مگر عباس حد درجہ تنجید گئی سے بولا۔
 ”اور اس وقت زہر گہتری میں جب گھبرا کر بھاگ جاتی ہیں۔“ اب ماندہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا اور شاید نہیں، یقیناً عباس نے پہلی بار اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا اور کافی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ وہ شیشا کر ادھر ادھر کیسے گئی۔ اس بے ساختہ قہقہہ کو بریک بھی بے ساختہ ہی لگا تھا۔

”تمہاری ہنسی بے حد خوبصورت ہے مائدہ؟“ وہ کہے بیٹا نہیں رہ سکا پھر اسے انگلیاں مروڑتے دیکھ کر لڑا۔ ”میں تمہیں بچے پر لے جا رہا ہوں، چلو گی۔“ عجیب دھونس جمانا سا انداز تھا۔

”تاکر پوچھ رہا ہوں۔“
 ”آں..... سوچوں گی۔“ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھی، تب وہ پیچھے سے پکار کر بولا۔
 ”تم سوچتے میں پہلے ہی کافی تاہم لے چکی ہو۔“ معنی خیزی سی تھی۔

”جی بالکل کیونکہ عقل سے کیا گیا فیصلہ ہی دیر پا ہوتا ہے۔“ وہ کیوں پیچھے رہتی، وہ ہنس دیا۔

”سوری بی بی! لیکن آج کل آفس میں کام بہت ہے۔“ عباس نے کہا۔ ”لیکن آپ کبھی ہمسفر نہیں آئیں، لہذا آج آپ میرے گھر چلیے۔۔۔۔۔۔ رینگی میں بہت اچھی کافی بنا رہا ہوں۔“ اس نے تانینٹر نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا پھر وہیل چیئر کے ہینڈلز کو قدم بٹھانے لگا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، مسکرا کر بولیں۔

”میں کافی نہیں پیتی۔ وہ جلی ہوئی روٹی جیسی چیز مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔“

”بی بی! آپ چلیے تو جو کہیں گی وہ بنا کر کھلاؤں گا۔ بلیوسی، میں بہت اچھی کوکنگ کرتا ہوں، تمہی کو فوجا مجھے سکھ کر بتی ہیں۔“ انداز تبسم و شیر تھا۔

”پھر تو آپ کی بیوی بہت خوش رہے گی۔“ میبہ نے پیشین گوئی کی۔ اس نے بے اختیار اندھا کو دیکھ کر جو جوتے سے زمین کرید رہی تھی۔ ایسا کیا تھا وہاں جس نے اسے چونکا یا تھا۔ وہ دل ہی دل میں حیرت و ہوتا۔ بی بی کی جانب متوجہ ہوا جو کہہ رہی تھیں۔

”میں آؤں گی مگر ابھی نہیں اور سنو، تم اپنی بجیا کو لے کر ضرور آنا۔“

”جی ضرور۔“

”او کے عباس بھائی! ہم چلتے ہیں۔ ابھی مجھے اور پیا کو مار کیت بھی جاتا ہے۔“ منہ اسے خدا حافظ کر بی بی کی ہنسل چیر دھکیلنے لگی۔ اصولاً تو ماندہ کو بھی جانا چاہیے تھا مگر وہ وہیں کھڑی انہیں جانا دیکھ کر رہا اور اسے حیران کر رہی تھی۔

”ایک بات بتاؤں عباس!“ وہ بھی اس ہی کے جیسی ویل میز ڈبندی تھی، سوا اجازت لیے بیٹھا کیسے کرتی۔ ”پتھر بہت معصوم ہوتے ہیں، ایک ٹھوکرا سے راستے سے ہٹاے جاسکتے ہیں مگر انسان تو اپنا چوٹی کا زور لگا دینے سے بھی نہیں ہٹتے۔ آں..... ڈھیٹ جو ہوئے۔“ ہونٹ دانتوں سے تڑا کر دھواٹا ہوئی اور پلٹ گئی۔ عباس مصطفیٰ نے اسے تب تک دیکھا تھا جب تک وہی گرین گیٹ کے پیچھے گم نہیں تھی۔ اس کے کہنے ہوئے جیلے کا مفہوم کچھ اور بھی ہو سکتا تھا مگر بعض ”مفہوم“ واضح کرنے کے لیے لفظ کی ضرورت نہیں پڑتی اور بعض معاملات صرف مسکراہٹوں کے ذریعے طے پا جاتے ہیں۔ نامہ منبر مسکراہٹ نے اس سے وہ کہا تھا جو اس کے لفظوں نے نہیں کہا تھا، اس نے بے اختیار پایا، ”کاغزوہ نگاہ جھینپ کر ادھر ادھر دیکھا۔ شکر ہے یہ حرکت کرتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔“

ذرا مشکل سے ہی سنبھال پایا تھا۔

ہوں گی۔“ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔ اسے خبر تھی کہ بچیاں ان کے ساتھ کیوں آئیں گی۔ یہ ان کی زندگی کا ایک اور خوشگوار دن تھا، جب سی سرشاری تھی، کتنا خوش کن احساس ہوتا ہے ناک کوئی آپ کی تکرار رہا ہے، آپ کو چاہ رہا ہے، بس وہ بھی اسی احساس کے زیر اثر تھی۔ اتنا عرصہ کسی کے انتقال میں گزارا تو اب کوئی اس کا منتظر تھا، بس اب ”اجد طارق“ کو چند لفظ ہی لکھنے تھے مگر قسمت کبھی کبھی عجیب کھیل کھیل ہے، اس کے ساتھ بھی کھیل چکا جا تھا، اب جبکہ وہ دوسری کشتی میں سوار ہونے لگی تھی تو چار خور و ہلکار اس کے پاس آ گئے تھے۔ اجد طارق کو ایک لفظ بھی لکھنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

وہ ساکت کھڑی احمد کو بی بی کے بیڈ پر براہِ جان دیکھ رہی تھی، اس بل بوتہ سے خود بھی غریبہ بن چکی تھی۔

”دیکھو مانندہ! میرا سجدہ! گلیا تم ٹھیک کہتی تھیں مانندہ! یہ لوٹ آیا ہے۔“

بی بی دایاں بازو پھیلائے اسے پر جوش انداز میں بتا رہی تھیں۔ مائدہ کی چتر آنکھوں میں خفیفی حرکت ہوئی۔ بی بی کا بازو اجد کے کندھوں پر یوں رکھا ہوا تھا گویا وہ خود بھی یقین کرنا چاہ رہی تھیں اسے ہر کر..... آنکھوں میں چمکتے ڈھیر دن ڈھیر آنسو، جوش سے مسکراتے لب اور متاسفہ لبریز چہرہ۔ مائدہ کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر جھول گیا بھی اجد طارق بی بی کا ہاتھ نرمی سے ہٹا کر اٹھا اور مسکراتا ہوا اس کے منہ سامنے آن رکھا۔

”کیسی ہو مائدہ؟“ کوئی شرمندگی نہیں، کوئی پچھتاوا نہیں، ان آنکھوں میں ایک جہان آباد تھا۔
مائدہ حسین اپنے بے حس و حرکت وجود سمیت ان آنکھوں کی گہرائیوں میں کھڑی تھی۔

بی بی نے کہا وہ نہیں آئے گا، شجاعت حسین نے کہا وہ نہیں آئے گا، میہ نے کہا وہ نہیں آئے گا۔ مگر اس نے کہا وہ آئے گا اور وہ سچ سچ آ گیا۔ ”کیوں، کب، کیسے؟“ قسم کے سوال ہی بے معنی تھے، بلکہ ٹوٹ آیا تھا اور سب کے لیے یہی کافی تھا۔ کہتے ہیں صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اجد طارق وہ بھولا تھا جس کی شام پانچ برسوں میں ہوئی تھی اور اس طرح جا کر ٹوٹ آنے والوں کے پاس بہت سی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ مجبوری کی، بے بسی کی..... اپنی مصدیت کی ہر دلیل ان کی شبلیہ میں ہر دم موجود رہتی ہے..... امیسی کے چکر میں پھنس گئے، کسی ناکر وہ جرم کی سزا کے طور پر جیل میں رہے، روپوں کی کمی نے واپسی سے روکا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اجد طارق نے کسی ایسے بہانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، اس نے سب کے بیچ بیٹھ کر میر لین نامی لڑکی سے شادی اور پھر طلاق کا اعتراف کیا تھا اور وہ جو کم حاصل کرنے گیا تھا وہ حاصل کر کے ہی لوٹا تھا، یعنی بہت ڈھیر ساری دولت اور اس ملک کی شبلیہ اس

[illegible]

”جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔“ وہ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے اور پھر محض دو ہفتوں بعد اسجد طاریق اس پرانے بھرے سوالی بنا کھڑا تھا۔

”مجبور نہیں کروں گا میں تمہیں، بس اتنا کہوں گا کہ تم ہی میرا اول ہو اور تم ہی میرا آخر..... میں تمہارا جانا کہ ایسا کہ ہوا مگر ماندہ! آئی رنکلی لوہو..... ایسا لگتا ہے اب زندگی تمہارے بغیر بے معنی اور پھینکی ہوا کی قدم بھی میں تمہارے بغیر نہیں چل سکوں گا۔ تمہیں اب بھی حق حاصل ہے، چاہو تو ہاتھ تھام لو ورنہ“۔

تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے

شب غم بری بلا ہے

ہمیں یہ بھی تھا غنیمت

جو کوئی شمار ہوتا

ہمیں کیا برا تھا مرنا

اگر ایک بار ہوتا

پہچاننے کی تمنا اسے یہاں تک لے آئی، مگر میں ہونے کے لیے کونا کھدرا نہیں ملا تو سارا غم منہر
منہ ہڈیا۔

”تمہیں اس لذت کو نہیں بھول سکتی! جہاد طارق! جوان پانچ برسوں میں، میں نے برداشت کی ہے مگر لڑائی میں تمہارا ساتھ دوں گی کیونکہ بی بی اور مہیہ کے چہروں پر موجود خوشی اور امید کی کرنوں کو میں نہیں نڈھال کر سکتی۔“

فیصلہ کر لیا تھا، صرف یہی نہیں اپنا ہر ارمان، ہر خواب، ہر آرزو وہ اسی منہ کے پانی میں بہا آئی تھی۔
فیصلہ تھا ”اپنی زندگی کو اپنی مرضی“ سے گزارنے کا وہ کہیں کھو گیا تھا یا اس نے دانستہ گموا دیا تھا کہ ہمارا
بی اور میہ سے بڑھ کر اسے کوئی بھی عزیز نہ رہا تھا۔

+

وہ آخری بار کالج جاری تھی، اپنا ریزگنیشن دینے اور گریٹ پر کھڑے عباس کو دیکھ کر دل ہلکا
کو چاہ رہا تھا۔
”کیسی ہو۔“ وہی ہمیشہ کی سی دلربا مسکراہٹ، ماندہ نے بڑی دقت سے سر ہلایا مگر نظر اٹھا کر
آنکھوں میں جلتی قدیلوں کو بجھا دینے کے واسطے۔ عباس نے یکدم گردن موڑ کر دیکھا۔ وہی ہمیشہ
ساحلیہ، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ اور وہی عام مگر بہت خاص سراپا۔
”کب آیا اجہ؟“ اور اب کی بار ماندہ کا سر جھٹکے سے اٹھا تھا، اتنا غیر متوقع سوال تھا اور اتنا۔
..... ماندہ کو اپنے سینے میں کہیں سانس کے انک جانے کا احساس ہوا تھا۔
”جہیں میہ نے بتایا ہے۔“ قیاس کو سوال میں ڈھالا گیا۔
”نہیں۔“

”تو پھر..... کس نے بتایا۔“ اس کی آنکھوں میں استفہام سمٹ آیا اور تب فقط ہی ہمار
نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں فقط استفہام ہی نہیں، استعجاب بھی تھا۔ وہ ہولے سے سانس دیا۔
”تمہاری آنکھوں نے۔“ عجیب بے بسی تھی۔ ماندہ کے اندر کوئی چیخ ابھری۔
”ک..... کب عباس..... تم نے کب میری آنکھوں کے رنگوں سے واقفیت حاصل کی؟“
”پتا نہیں کب مگر سب کچھ خود یہ خود ہی ہوتا چلا گیا۔“ خاموشیوں نے سرگوشی کی تھی جو کم
نہیں سن پاتی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہیں پاتی تھی اور عباس بتانا چاہتا تھا مگر بتا نہیں پاتا تھا۔
کبھی بھی اس کی آنکھوں کو پڑھ کر سمجھنا نہیں چاہا تھا مگر وہی ناکہ سب کچھ خود سے شروع ہو کر
ہو گیا تھا۔

”میں چلتی ہوں عباس! ابھی تو اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔“ وہ کار بیگ لے لیتی اور اتر
ایسا نہ کیا ہوتا تو یقیناً بار جاتی۔ ذہن میں میہ کے لفظ گھوم رہے تھے۔ ”اب مجھے یقین ہو گیا ہے
صرف میری ہی بھابی ہیں۔“ صبح جب اجہ نے اس کے ہاتھ سے چائے کا گک لے کر ہونٹوں سے
تجسبی میہ نے کہا تھا۔ وہ تب خاموش رہی تھی مگر اجہ کا ہتھہ کانی دیر تک گونجتا رہا تھا۔
تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر

کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر
بچے بستے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
مگر اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں
کسی دن اول کی لوح منتظر پر
اچانک رات اترے گی
میری بے نور آنکھوں کے خزانے میں چھپے
ہر خواب کی تکمیل کر دے گی
مجھے بھی خواب میں تبدیل کر دے گی
ایک ایسا خواب جس کے دامن صد چاک میں
کوئی روشن، مبارک دن نہیں ہوگا

+

دور در کوئی احساس نہیں دلانا چاہتی تھی کہ عباس مصطفیٰ اس کے لیے اہمیت رکھتا ہے اور جس نے اس
کا ہر لمحہ اپنے چند لمحوں بعد بڑی بے بسی اور غصے سے ہاتھ میں پکڑا پتھر دور در فضا میں کسی ان دیکھے
ہلے کو لے مارا تھا۔ تیزی سے بھاگتی نشان جھٹکے سے رکی تھی اور اس نے نہایت تھک کر کمر پشت سے ٹکا
لٹائیں موٹی تھیں۔ آنکھوں میں چھائی دھند کو بارش بننے میں لحو بھی نہیں لگا تھا اور اب وہ دھند اس کی
پٹلی پر گہرے چھوڑ رہی تھی۔ ”آئی ایم سوری عباس..... پلیز مجھے معاف کر دینا۔“ بندیشوں میں اس کی روتی
تھی کہ کبھی حقیقت سے نگاہ چرانا آسان نہیں ہوتا اور یہ حقیقت ہی تھی کہ عباس مصطفیٰ اس
کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

مارا سمندر خاموش تھا، کہیں کوئی بے چین لہر نہیں تھی، کہیں کوئی اضطراب نہیں تھا، بس ایک الجھی ہوئی
کی ٹانہ تھی، مہیب سا سکوت تھا اور عین اس کی نگاہوں کے سامنے سورج آدھے سے زیادہ پانی
مکھڑپ چکا تھا۔ آج کراچی میں اس کی سترہویں شام تھی جو رات میں ڈوب رہی تھی۔ گھر میں اس کی
دیکھ کر کچھ ایسا شروع ہو چکی تھیں، اگرچہ اس کی کچھ ایسی ضرورت نہیں تھی مگر دنیا والوں کو بھی تو بتانا تھا کہ
اپنے ہاتھ سے باندھنے کے لیے۔ پاپا نے خاموشی اوڑھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے ذہن میں بھی وہی

سوال کھلا رہا ہے۔ کیا اجد طارق اسے عزت دے سکے گا؟ وہ شخص جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہٹھکرا کر چلا گیا تھا، کیا اب اسے وہی مان دے سکے گا جو اس کا حق ہے۔ ہر بار جب بھی وہ پاپا کے سامنے جاتی تو وہ اسے دیکھ جاتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں پھر عباس مصطفیٰ قاضی سے اس نے کوئی عہدہ و بیان نہیں کیے تھے، ان دونوں کا ساتھ بھی بے حد مختصر تھا مگر پھر بھی کہیں کوئی غلط فہمی نہ لگ سکے جو اسے ہر روز نئے سرے سے اپنے حصار میں لے لیتی تھی۔ بی بی نے کہا تھا۔

”تم میری بیٹی نہیں ہو مگر یقین کرو مجھے میہ سے بڑھ کر عزیز ہو۔ اجد یہاں ہوتا تو بات دوسری کی ہوتی تھی میں تمہیں کہیں بھی نہ جانے دیتی مگر ماندہ! جب خوشیاں دروازے پر کھڑی ہوں تو کسی اور کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ عباس بھی ان ہی خوشیوں کا حصہ ہے۔“ اب ہر چیز پس منظر میں گھوم گئی تھی۔ مگر منظر صرف اجد طارق تھا اور بی بی کی خوشی۔ اجد لوٹ آیا تھا تو پھر وہ کون سی خوشیوں کے لیے دروازے کھولتی۔ گھر آئی تو بی بی کی کال اس کی منتظر تھی۔

”بس بہت دن رہ لیا وہاں، اب لوٹ آؤ۔“ چھوٹے ہی انہوں نے حکم دیا تھا۔ وہ بھلا کیا کچھ خاموشی سے ریسیور پاپا کو تھما دیا۔ وہ بی بی سے کچھ خاص بات کرنا چاہ رہے تھے۔

”آپا! میں چاہ رہا تھا کہ رخصتی کی ڈیٹ طے کر لی جائے۔“ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے پاپا کو کہتے سنا تھا اور کمرے میں پہنچنے تک اس کی آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔ ”کاش میں مصطفیٰ میری زندگی میں آئے ہی نہ ہوتے۔“ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ ایسی تنہا کیوں کر رہی ہے۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ وہ اجد کی منتظر تھی تو اب یہ بے کلی کیوں ہے۔ نجانے وہ کتنی دیر روئی رہی تھی مگر کتنے ہی چھینٹے منہ پر مارے مگر یہ پانی بھی سکون دینے سے قاصر تھا۔ مازہ نے اسے کھانا کھانے کے لیے پارک اس نے انکار کر دیا پھر ساری رات گزر گئی۔ صبح کو اس نے چائے کے ایک کپ سے پیٹ بھر لیا۔ جب صبح اللہ ہی کیفیت میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، محض سوچ کا رخ بدلنے کی غرض سے یوں ہی کوئی سی ڈی پلے کر گئی تھی۔ فل والیم میں جانے کون سا سنگرا اپنا گلا بھاڑ رہا تھا جب دروازہ چرچا پھر کھٹ سے پلیر آف ہوا۔ اتنا سکون چھایا تھا اور باہر کے سکون نے اندر پھیل چادی تھی۔

”پاپا! وہ ایک دم اٹھ بیٹھی، بند دروازے کے عین سامنے میہ کھڑی تھی۔“

”تم کب آئیں۔“ وہ اس کو گلے لگانا چاہتی تھی مگر میہ نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور ماندے باقی لفظ منہ میں ہی انکھ گئے۔

”کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو۔۔۔۔۔ ہیں کیا آپ۔۔۔۔۔ آخر۔۔۔۔۔ آخر کیوں کر رہی ہیں آپ ایسا۔“ اندھا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

”ککھ۔۔۔۔۔ کیا کیا ہے میں نے؟“

”ہاں آپ کو کچھ خبر ہی نہیں۔“ وہ تسخیر سے ہنسی۔

”پس مجھے میں بات کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ کیا بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں رہی۔“

”میں یہاں چھوٹوں یا بڑوں پر بحث کرنے نہیں آئی، صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آپ اجد بھائی ہاتھ کیوں جاری ہیں؟“ اس کے تیر بڑے جاز حانہ تھے۔

”نمیدہ! وہ بھی کہہ پائی۔“

”کیا آپ بھول گئی ہیں پاپا! کہ وہ آپ کو ٹھکرا کر چلے گئے تھے۔ کیا آپ کی کوئی عزت نفس باقی نہیں بچا؟ اور خود سوچئے اگر اجد بھائی آپ کی جگہ ہوتے تو کیا وہ پھر سے آپ کا ہاتھ تھام لیتے، نہیں قطعاً! ماندہ بھلا کیا کتنی دھپ سے بیڈ پر گر گئی۔ آنکھیں پھر سے بھر گئی تھیں۔“

”میں نے تو صرف تمہاری اور بی بی کی وجہ سے۔۔۔۔۔“

”میری اور بی بی کی وجہ سے۔“ نمیدہ جیسے تھک کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”میں نے جی ہی کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے اور آج پتا چل گیا کہ بی بی سے بھی نہیں۔“

”بہت کم میہ!“ وہ روتی ہی جا رہی تھی۔

”مگر محبت ہوتی تو آپ ہمارے چہروں سے دل کا حال جان لیتیں، بالکل ویسے ہی جیسے ہم آپ کے مال جان گئے تھے۔“ ماندہ نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپانا چاہا مگر میہ نے اس کی کلائیاں تھام

”اجد بھائی نے دولت کی خاطر اپنی ماں اور بہن کو چھوڑ دیا۔ آپ نے ان کی ماں بہن کے لیے اپنے ہاتھ چھوڑ دیاتو۔۔۔۔۔“ ماندہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جس کے ہر انداز میں تاسف ہی

”تو کیا میں اور بی بی آپ کی خاطر اجد بھائی کو نہیں چھوڑ سکتے؟“ وہ پوچھ رہی تھی اور ماندہ پھٹی پھٹی لہجے سے کہہ رہی تھی، تب میہ نے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔

”خوش ہوئے آپ کو عباس بھائی دے سکتے ہیں، وہ اجد بھائی کبھی بھی نہ دے پاتے اور۔۔۔۔۔ اور ہمیں کوئی دیکھا ہے انہیں چھوڑ دیئے گا۔ دولت ان کے لیے ہم سے زیادہ اہم ہے تو رہیں اسی کے ساتھ، ہمیں اس کی دولت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں اور بی بی صرف آپ سے محبت کرتے ہیں پاپا! صرف اسے کسی کی سکیاں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں، جب ماندہ نے اپنے بازو اس کے گرد دھانک لیے۔ وہ دونوں رو رہی تھیں، حتیٰ کہ بادل چھٹ گئے اور آسمان صاف ہو گیا۔“ آنسوؤں کا باقی

”میں نے کبھی اس کی سکیاں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں، حتیٰ کہ بادل چھٹ گئے اور آسمان صاف ہو گیا۔“ آنسوؤں کا باقی

”وہ مسکراتے

ہوئے الگ ہوئی اور شرارت سے کہا۔ "مائدہ بھی مسکرا دی پھر چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔
"اجد کہاں ہے؟"

"وہیں لاہور میں ہی ہیں اور بی بی نے ان سے کہہ دیا ہے۔ چاہے تو واپس جا کر کسی میرٹھی بجائے شیر لین سے شادی کر لیں پر ہم اپنی مائدہ کو اس کے ساتھ نہیں بھیجیں گے اور اب آپ کمر سے باہر نکلیں عائشہ آئی ہیں آپ کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے۔"
"کیا....." وہ دنگ رہ گئی تو میہ زور سے ہنس دی۔

اہل نہ جائے

"جی جناب! سارے معاملات طے کرنے کے لیے ہی تو کل بی بی نے فون کیا تھا۔ شامت مقرر فوراً ہی مان گئے، اب اگر آپ بھی....."

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے بے اختیار ہی تیزی سے کہا پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ نے اسے پھر ساتھ لپٹا لیا۔

"مجھے پتا تھا۔" پھر کھڑی ہوتے ہوئی بولی۔ "اب اپنا بہترین سوٹ پہنیں، بال وال بنائیں اور باہر جائیں۔ آخر کو نکد کا سامنا کرنا ہے۔" اس کا اشارہ عائشہ کی جانب تھا، وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔" میہ سر ہلا کر باہر کی طرف بڑھی پھر رک کر پلٹی۔
"گھونچل بھی آیا ہے، وہ آپ سے برائیڈل ڈریس کا کلر پوچھے گا۔ پلیز میرون ہی کہیے گا۔" یہاں

کا پسندیدہ کھڑا تھا۔ مائدہ نے سعادت مندی سے سر ہلایا، وہ دروازے کی طرف جا کر پھر لوٹ آئی۔
"وہ آپ کے پاس میرون کا شن کا سوٹ ہے نا۔ سندھی کڑھائی والا..... ابھی وہی پہن لیں۔"

"اچھا..... اور کچھ۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ میہ تجل سی ہو کر پلٹ گئی۔
"نہیں، کچھ نہیں۔" مائدہ ہنسنے لگی۔ "ارے ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔" اسے دروازے تک جا کر

کچھ یاد آیا۔
"اب کیا ہے؟"

"ہنستی رہا کریں یہاں! بہت اچھی لگتی ہیں۔" اور اب کی بار وہ واقعی باہر نکل گئی۔ مائدہ ہندو دروازے کی دیکھتی رہی۔ خوشیاں ابھی بھی اس کی منتظر تھیں اور وہ دیر نہیں کرنا چاہتی تھی، جیسی وارڈروب کی طرف بڑھنا۔
میرون سوٹ بھی تو نکالنا تھا۔

۷۷

میں بارش کو بھی آج ہی برساتا تھا۔
اس نے کوئی تیری بار کھڑکی کے بلاسٹڈز بٹا کر دیکھا تھا۔ ایک تو اتر سے برستی بوندوں کی سرمئی چادر ہے زمین تک تھی ہوئی تھی جس کے عقب سے خوبانی کے درختوں کا ہر رنگ جھاٹک رہا تھا میلا میلا ملاکلا سا..... اسے لگا آسمان نے زمین سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے اور اسے اس رشتے سے چڑھتی۔
آسمان تو پانی برسا کر اطمینان سے ہو جاتا جبکہ زمین پانی سے لت پت..... وہ اکتا کر بند مٹھی ششے اڑنے لگا۔ "نکلان بیزاریت اور نیند....." ان تینوں چیزوں نے اس کے گرد ایک واضح حصار باندھ ڈیا۔

اں کے ہاتھ کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو ڈوری ہاتھ سے نکلتی چلی گئی بلاسٹڈز کے برابر ہونے کی خفیف ہلکے کی خاموشی میں مدغم ہوئی تھی وہ کچھ بلر پڑا لونگ جیئر کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے ادھر ادھر دیکھنا چاہیے ڈھالے سے انداز میں وہیں ٹک گیا۔

آج کا سارا دن ہی بے تحاشا مصروف گیا تھا۔ صبح جب ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی بلکہ مساجد میں اذان نہ رہا ابھی بلند نہیں ہوئی تھی تب ڈاکٹر رضوی نے اسے فون کر کے ہاسپٹل آنے کا کہا تھا۔ وہ آنکھیں ملکی کوٹھنے کے ذریعے ہاسپٹل پہنچا تھا کیونکہ اس کی کار تو رپہ رنگ کے سلسلے میں پچھلے ایک روز سے کھانڈھنت بنی ہوئی تھی۔

ہاسپٹل میں بڑا افوازا تھی کہ سا کا عالم تھا۔ مری کے قریب برف باری دیکھنے آئے ہوئے بچوں کی ٹھنڈی آنکھوں کا عاقل ہوا تھا۔ اگرچہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی زخموں کی تعداد خاصی تھی۔ ڈاکٹر رضوی نے ہاسپٹل میں آنے کے بعد ڈاکٹر صاحبہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے بھی انہوں نے اسے ایمر جنسی کال ملنے پر ہاسپٹل میں ان تینوں کے علاوہ چار مزید ڈاکٹر ز موجود تھے جو پاکستان کے مختلف میڈیکل کالجز سے تھے۔ فرق سے پاس آؤٹ ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر شجاعت اور ڈاکٹر شمن کی تو ڈاکٹر

رضوی کے ساتھ ہی ٹائٹ ڈیوٹی تھی مگر اس کے باوجود اکثر رضوی نے اسے بلوایا تھا گو کہ اس کا ٹیگور نام رضوی سے زیادہ نہیں تھا مگر پچھلے سات آٹھ سال سے اس فیلڈ میں ہونے کی بناء پر اس کا نام خاصا معروف پھر ایک کے بعد ایک دشمنی کو پنڈل کرتے خاصا وقت نکل گیا۔ ہاسپٹل کی ساری عمارت کراہوں اور لکھی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ کچھ بچے واقعی تکلیف سے رو رہے تھے باقیوں کو خوف آہ و زاری کرنے پر مجبور کیے دے رہا تھا۔

شام کے چار بج جانے کے باوجود سارا اسٹاف خاصا مستعد اور چاک و چوبند تھا کیونکہ بہر حال ایکڑ معاملے کی نوعیت سنگین تھی پھر اسود کی موجودگی میں یوں بھی سب مستعد رہتے تھے کہ بہر حال وہ اس ہاسپٹل کے مالک کا بیٹا تھا اور ان سے کئی گنا زیادہ سخت مزاج تھا۔ ذرا سی لاپرواہی یا بے اعتدالی اس کی طبیعت گراں گزرتی تھی کام کے معاملے میں وہ کسی قسم کی مروت یا لحاظ کا قائل نہ تھا۔

اور ابراہیم احمد آج کل کسی میڈیکل کنونشن کے سلسلے میں بیجنگ گئے ہوئے تھے تو ان کی غیر موجودگی میں وہی بگ باس تھا۔

اس حادثے کی وجہ سے سارے میں تھر تھری مچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ز، نرسز اور وارڈ بوائز تک نے بھاگتے دوڑتے ناشتا، لچ نہنایا تھا جبکہ کچھ تو اب تک چائے کافی پر ہی قناعت کئے ہوئے تھے اور انیٹر ڈاکٹر رضوی بھی شامل تھے۔ کچھ مریضوں کو گھر روانہ کیا گیا جو شدید دشمنی تھے انہیں ایڈمٹ کر لینے کے لیے اسود نے ڈاکٹر رضوی سے بھی گھر جا کر آرام کرنے کے لیے کہا۔ پچھلی پوری رات اور اب دن کے دہا تک بھی وہ مسلسل کام کر رہے تھے اسود کو وہ خامسے مضمل لگے تھے۔

”ڈونٹ وری انکل! آپ چلے جائیے گھر..... یہاں کوئی ایمرجنسی ہوئی تو میں پنڈل کر لوں گا۔“ انہیں معترض دیکھ کر اس نے زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ ڈاکٹر رضوی اس کے پاپا کے بہت اچھے دوست تھے اور اس ہاسپٹل کے معیار کو بلند کرنے میں ان کی بھی اتنی ہی کڑی محنت شامل تھی جتنی کہ ابراہیم احمد کی۔ اس نے کارڈیالوجی میں اسپیشلائزیشن انہی کے کہنے پر کی تھی۔

”تمہیں تو آدمی رات کو بچایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ اچھا یہ کرتے ہیں کہ ہم وقت تقسیم کر لیتے ہیں میں سات بجے تک واپس آ جاؤں گا پھر تم گھر چلے جانا۔“ انہوں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر اور کندھے ہلا دیے۔ یقیناً وہ زیادہ ہی تھکان محسوس کر رہے تھے جسمانی تھک جلدی راضی ہو گئے تھے۔ پھر جس وقت وہ گئے تھے موسم اس قدر رابر آلود نہیں تھا بس آسمان کے کناروں پر ہلکا سرخی سا دھواں چھایا ہوا تھا پھر کب یہ دھندلا کا لے سفید بادلوں میں ڈھل کر مینہ برساتے لگا پانی چلا۔ رات ڈھلنے سے پہلے تاریکی چھا گئی جبکہ ہاسپٹل کے پچھلی جانب موجود خوبانوں کا بارغ باغی اور با کی چادر کے عقب میں گم ہو گیا اور اسے بارش سے سخت چڑھتی۔

”کھیلنا بیٹھو سکوپ سے کھیلنا رکھو کچھ بل بی بی آپریشن سے بھی دل بہلایا۔ پھر بیون کو اسٹرونگ سی ڈانے کا کردہ پیچہ وٹ سمھانے لگا۔ کافی آنے تک وہ اس کام سے بھی بیزار ہو چکا تھا۔ نرم سی ہانک جیڑی کی گود میں اپنے بستر کی خوانش کچھ اور شدت سے ابھر رہی تھی۔

ان نے کافی کے دو بڑے سپ لیے اور دونوں انگلیاں ملا کر پیشانی مسلتے ہوئے کسی قدر نیند کو ان کی کوشش کی لیکن سرکسی کی پشت سے نکلا ہوا پچھلیں خود بخود آپس میں لپٹے جا رہی تھیں۔

اور ابھی تو وہ غالباً پوری طرح سے غافل بھی نہ ہو پایا تھا جب ایک نسوانی آواز نے اس کے اعصاب کو زلزلہ کے جواں زور دار انگڑائی لے کر بیدار ہوئے تھے۔

”نر آپ ابھی تک گئے نہیں؟“

ان نے بڑے غیر محسوس سے انداز میں اپنی نشست درست کرتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے جیڑی اور قدرے تشویش سے اس کی جانب استغفہائی انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کو کوئی کام تھا؟“ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اسود نے پوچھا۔

علینہ اندر تک بد مزہ ہوئی۔ ”اس شخص کی شکل اور پرسنلٹی کتنی اچھی ہے ذرا مسکرا کر تھوڑی نرمی سے بول کر کہ تو بھلا کون سی قیامت ٹوٹ پڑے۔“

اس شاندار پرسنلٹی والے بگ باس کو دیکھتے ہوئے علینہ نے بد مزگی سے سوچا تھا۔

”ڈاکٹر علینہ“ اسود نے اس کی خاموش کو تحیر سے نوٹ کرتے ہوئے اسے پکارا۔

”مرہ وہ آپ کے آفس سے میں ڈاکٹر رضوی کو فون کرنے آئی تھی۔ دراصل بارش کی وجہ سے باقی ہنگاموں کنکشن میں کچھ ڈسٹربنس ہے۔“

”اتنی بارش میں تو ڈاکٹر رضوی شاید نہ آ سکیں۔“ اپنی نیند سے لبالب بھری آنکھوں کو ذرا سا مسلتے اس نے اسے کہا۔ اس کا انداز سوچنا ہوا سا تھا۔

”لیکن بارش تو اب خاصی ہلکی ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر رضوی کا آنا بہت ضروری ہے! انکچھ نیلی ایک ٹیگور کسی ہے۔ کوئی ہرینڈ اینڈ وائف ہیں لڑکی کو تو نسبتاً معمولی چوٹیں آئی ہیں البتہ آدمی کی حالت خطرناک ہے۔“

علینہ نے خاصی تفصیل سے بتایا اور یہ تو ہر سال ہی ہوتا تھا کہ ان دنوں میں حادثات کی شرح معمول سے زیادہ جاتی تھی۔

اسود نے چند لمحوں سوچا اور کافی کا آخری سپ حلق میں اتارتا کھڑا ہو گیا۔

”آپ چلے میں دیکھتا ہوں۔“

الہ آباد کی حالت واقعی خاصی خراب تھی۔

اس کے سر سے بے تحاشا خون رس رہا تھا۔ دائیں ٹانگ کا گھٹنا بھی شدید زخمی تھا۔ اس کے منہ اندرونی چوٹیں شدید تھیں اور انہی اندرونی زخموں کی وجہ سے اس کی حالت مزید خراب ہوتی جاتی تھی۔ جب تک اسے آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا ڈاکٹر رضوی بھی آ گئے۔ وہ انہیں تفصیلات بتاتا کرسمے باہر نکل رہا تھا۔ کوریڈور کے دوسری طرف کھڑی اس شخص کی بیوی بڑی بیتابی سے ان دونوں کی طرف آتی تھی۔

اسود نے نظر اٹھائی اور پھر جیسے نظر نے پلٹنے سے انکار کر دیا۔

اس چہرے کو وہ بخوبی پہچان سکتا تھا۔

ذہانت سے چمکی آنکھوں میں پہلے تجرے بغیر چوڑا کی کشتی کی طرح ڈولا تھا مگر دوسرے ہی لمبے لمبے ہوئی۔ وہاں صرف سمندر رہ گیا جس کی سطح پر غصے اور سردہری کی لہریں زور زور سے سرخ رہی تھیں۔

اسود نے اس کے چہرے پر بھی پہلے حیرانی اور پھر بے بسی کو ابھرتے دیکھا تھا۔ اسے اس کے بڑے بالوں، بھیکے لباس، روٹی ہوئی آنکھوں، بینڈج شدہ متھک چہرے، حیرانی اور بے بسی پر بے تحاشا غصہ تھا۔ اس کی پیشانی پر کئی لمبے نمودار ہوئے تھے جبکہ خود کو کچھ بھی کہنے سے روکنے کے لیے اس نے جڑے بچے لیے تھے۔

اگلے ہی لمحے وہ لمبے لمبے ڈمک بھرتا اپنے کیمین میں آ گیا تھا۔

اسے اپنا آپ بھڑ بھڑ جلتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک الاؤ آتش دان میں جل رہا تھا جبکہ ایک الاؤ اس کے اندر سلگنے لگا تھا۔ اس کی کپٹی پر ایک رگ پھڑک رہی تھی غصے کی حالت میں اس کی یہ رگ ہمیشہ نمایاں ہوتی تھی۔

وہ آتش دان کے الاؤ سے آشتی لال لال چنگاریوں کو دیکھ رہا تھا جب عقب میں دروازہ کھول کر کمر اندر داخل ہوا تھا۔

”سرجس پیسٹ کو ابھی لایا گیا ہے اس کا بلڈ گروپ او نیکیو ہے ہاسپٹل کے بلڈ بینک میں اس بلڈ گروپ کا سیکل موجود نہیں ہے ڈاکٹر رضوی کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ.....“

”ڈاکٹر رضوی سے کہو میں نے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی بلڈ ڈونٹ کیا ہے۔ اس لیے ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔“

اس نے بڑی بے حسی سے جھوٹ بولا اسے بلڈ ڈونٹ کے کم و بیش چار ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا مگر.....

آنے والا اس کا جواب سن کر واپس چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں آن رکا۔ ڈوری کھینچ کر ایک آؤٹ

کے ساتھ بلاسٹڈ زاپر کوسٹ گئے۔ باہر کی تاریکی اور اندر کی دودھیا روشنی کے درمیان گلاس وال جاگتی تھی۔

ہوا میں تندی آچکی تھی۔ بارش پھر سے برسا شروع ہو چکی تھی۔ غضبناک ہوا کے ساتھ بارش کے قطرے پتھروں کی طرح گلاس وال سے ٹکراتے اور بنا اسے نقصان پہنچانے کا محسوس ہی کیے ہوئے چھوڑ کر چلی

جاتی تھی۔ دل میں خفگی جبکہ کپٹی کی رگ نمایاں تھی اور نگاہیں دور اس تاریکی کی چوٹیاں پہنچتی لکیریں تھیں۔

اس کی چوٹیاں پہنچتی تھیں، اس کے ارد گرد دیند جاگ رہی تھی۔

مگر یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی بے بسی کی وجہ سے اس کے پاس کھڑی تھی پھر اس نے گردن موڑ کر اس سمت

دیکھا جہاں اس نے اسود کو جاتے دیکھا تھا۔

”کیا زندگی کے اس مقام پر اسود براہیم سے ملاقات ہونا ضروری تھی۔“

اس نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی آنکھیں جلتے لگی تھیں۔ اس نے

اسود کے کمرے کی دروازے پر اس کے ذریعے سانس لینے کی وجہ سے دیکھا تھا۔ اس

کا آنسو ٹپکے ہوئے بند دالی ندی کے تیز بہاؤ کی طرح بہہ نکلے تھے۔

+

آسان کا رنگ بدل چکا تھا۔ رات بھر بارش برسا کر بادل ہلکے پھلکے سے ہو گئے تھے۔ البتہ سرمئی رنگ

لاہی کی چادر اب بھی سورج کی کرنوں کو زمین تک آنے کا راستہ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دیکھا لان

کا پتھر پر عیاض احاطے میں گھاس پر کھراجا ہوا تھا۔ اس ہاسپٹل کی بلڈنگ چار اطراف میں بنی ہوئی تھی۔

وہ ان کی قبر کا بہترین نمونہ پیش کرتے اس ہاسپٹل پر مکمل طور پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ لان میں پودوں کی

نایاب ترتیب و تزئین بھی شاندار تھی کونوں میں پیلے، نارنجی اور سرخ پھولوں کی لمبی لمبی ٹہنیوں کے ساتھ

لمبے پودے لگائے گئے تھے۔ عین وسط میں چتر کا بڑا سادہ تخت تھا جس کے چاروں طرف سرخ و سفید

لیلی کاریاں موجود تھیں۔ کوریڈور سے لان کو متصل کرنے والی میزھیوں کے اطراف میں موتیا کے جھاڑ

تھے وہ لان کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی کوریڈور کی بے تحاشا ٹھنڈی میزھیوں میں بیٹھی بڑی عجیب سی

حالت میں تھی۔

”جس کو آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ اب خطرے سے باہر تھا مگر بیوشی کی

حالت میں تھا۔“

ملکی رات اس نے آئی سی یو کے باہر خدا سے منتیں ماننے گزاری تھی۔ اس نے اپنی ساری زندگی

میں یہی دعا مانگی تھی کہ اس کی رات میں پکارا تھا جتنا کہ اس ایک رات میں پکارا تھا۔ اس نے ساری زندگی اتنی دعائیں نہیں کی

تھیں کہ اس رات کی تھیں۔

سکندر کیٹ میں لمبوس لڑکی خدا سے شکرانے کے نواخل ادا کرنے کا عہد کرتی رہی تھی مگر شرط تھی

سکندر کیٹ..... داؤد حسن کی زندگی۔

”اگر داؤد حسن کو کچھ ہو گیا تو.....؟“

”سب اسے مورد الزام ٹھہرائیں گے۔“

”وہ کیسے سب کو یقین دلانے لگی کہ اس نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔“

”یہ تو بس..... یہ تو بس ایک حادثہ تھا۔ مگر شاید وہ کسی کو بھی یقین نہ دلا پائے۔“

یہ سوال، یہ اندیشے بڑی بڑی کالی چنگاڑوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتے رہے۔ اسے ڈراتے رہے تھے۔

پھر نجانے اس کی دعائیں مستجاب ہوئی تھیں یا داؤد حسن اپنے کھاتے میں زندگی کے کچھ حیرت آمیز لکھوا کر لایا تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ ”موت کا فرشتہ“ ان دونوں کے سر ہانے آ کر پلٹ گیا ہے۔ وہ مصیبت کے ٹٹلے پر بھی رونے لگی ایک نظر داؤد حسن کے بیٹوں میں لپٹے چہرے کو دیکھ کر کچھ توڑنے نے اس سے کہا۔

”آپ یہاں بیٹر کے پاس آ جائیں۔“ اور وہ بیٹر کے پاس کر سی گھسٹ کر بیٹھ گئی۔ شاید زس اس کے وہ بھیکے کپڑے دیکھ چکی تھی جن کی اسے پروا نہیں تھی۔ بیٹر کی پیش میں کچھ بدن میں حرارت ازراۃ معطل حواس چوکنے لگے۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی سات سے کچھ پہلے کا ہی وقت تھا اسے پہلا خیال مہوش کا ہی آیا تھا وہ خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

ریسپشن پر موجود کرخت چہرے والی ریسپنشن سے اجازت لے کر اس نے کال ملائی۔ پہلی ہی بیل پرفون بڑی عجلت میں اٹھایا گیا تھا۔

”مہوش..... میں فارحہ.....“ بڑی گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔

”فری اتم..... تم ہو کہاں؟ جانتی ہو، ہم سب کتنے پریشان ہیں۔“ مہوش کی بے حد پریشان آواز سننے ہی اس کے سینے سے سکیاں برآمد ہوئی تھیں۔ جنہیں روکنے کے لیے اس نے بڑی مضبوطی سے لہلہ ہاتھ رکھ لیا۔ البتہ آنسو بڑی روانی سے بہہ نکلے تھے۔

”اوہ میرے خدا..... تم..... تم رورہی ہو نا فری۔“ اس نے جیسے اندازہ لگایا جبکہ فارحہ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بری طرح بلکنے لگی تھی۔

”رونا تو بند کرو اتنی لڑکی..... مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ اس کی آواز میں سراسیمگی تھی۔

”فارحہ..... فری پلیز رونا بند کرو..... اس طرح تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“ اچھا یہ بتاؤ کہ اس

وقت تم کہاں ہو؟“

”ہاسپٹل میں۔“

”واٹ..... ہاسپٹل؟“ فارحہ کی آواز مشکل سے نکلی تھی جبکہ مہوش کی آواز بندی ہو چکی تھی۔

”تم ٹھیک ہو نا فری۔“ کچھ دیر بعد اس نے متشکر سے لہجے میں پوچھا۔ جواب میں فارحہ نے مدلی بات بتانے لگی۔ اچانک بارش تیز ہو گئی تھی..... وہ تو پوری احتیاط سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہڈی مضبوطی سے اسٹیرنگ کو قابو کئے ہوئے تھے۔ پھر نجانے کہاں سے ایک بڑا اسٹریکٹر اس کے درمیان آ گیا اور..... گاڑی ایک ذرخت سے جا ٹکرائی.....

ہارٹ کے درمیان آ گیا اور..... گاڑی ایک ذرخت سے جا ٹکرائی..... وہ ایک ہاتھ سر پر رکھے سسک رہی تھی۔ پھر اس نے گال اس کے آنسو ڈیک پر گر رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سر پر رکھے سسک رہی تھی۔ پھر اس نے گال

پٹنے ہوئے کہا تھا۔

”مہوش..... میں نے جان بوجھ کر داؤد حسن کے ساتھ ایسا نہیں کیا وہ.....“

”داؤد حسن..... وہ اب کیسا ہے؟“

”جیک گاڑ۔“ فارحہ کا تسلی آمیز جواب سن کر اس نے بے اختیار کہا تھا۔

”اچھا تم ہو کہاں..... میرا مطلب مجھے ہاسپٹل کا نام بتاؤ؟“

”ہاسپٹل کا نام.....“ اس نے متلاشی نظروں سے ریسپنشن کے عقب میں اس کرخت چہرے والی پرسنل کو دیکھا۔ نجانے وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ”مہوش! ہاسپٹل کا نام تو مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے باہاری سے کہا اور اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتی ایک مضبوط ہاتھ نے اس سے ریسیور لے لیا تھا۔ اس نے زت سے دیکھا مگر حیرت یکدم ختم ہو گئی۔

دراؤد مضبوط جسم، سیاہ شرٹ اور سیاہ ہی جینز، واٹ اور آل، گلے میں اسٹیشو سکوپ اور ریم لیس لگا پٹہ..... وہ تفصیل سے ہاسپٹل کا نام، مقام سمجھا رہا تھا۔

اس کے چہرے پر وہی ازلی تہ بر سجھا تھا۔ ظاہری شخصیت میں تو صرف اس فریم کی تبدیلی آئی تھی پہلے وہ ایک نوجوان فریم والا چشمہ استعمال کرتا تھا۔ یہ تبدیلی اتنی بڑی نہیں تھی مگر کچھ تو تھا..... کچھ ایسا جو بہت زیادہ نمایاں ہوا تھا۔

اسو نے بات مکمل کر کے ریسیور اسے تھمایا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے فارحہ پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ فارحہ وہاں دیکھنے لگی پھر جیسے چونک کر ریسیور کان سے لگا لیا۔

”مہوش! اسے تسلیاں دے رہی تھی۔“

”میں اور ہارون بس ابھی پہنچ رہے ہیں تمہیں بالکل بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اور پھر وہ واقعی فکر مند نہیں ہوئی۔ لیکن وہ خود کو حد درجہ بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اور یہ واقعی ضروری نہیں تھا کہ زندگی کے اس مقام پر وہ ایک بار پھر اسودا براہیم کا سامنا کرتی مگر یہ نہایت غیر ضروری بات، زندگی کا بے حد ضروری لمحہ بن کر خود بخود اس کے سامنے آن رکھی تھی۔ جس کا نہ صرف اسے سامنا کرنا تھا بلکہ اسے قسطنطنیہ کے ساتھ مقابلہ بھی کرنا تھا۔

چنار کے بلند پھٹنے سے اتر کر سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے ارد گرد بکھر گیا تھا۔ اس نے فطرت کا خاصہ تھا اور آج بھی.....
 فطرت کر رہا تھا۔ گویا یہ کل بھی اس کی فطرت کا خاصہ تھا اور آج بھی.....
 ہو۔ اس عرصے میں..... تم نے کبھی مجھے یاد کیا؟“

مرحمت پوری رغبت سے سینڈ وچ کھاتے ہوئے اس نے یہ سوال کر کے خود کو ہی حیران کر دیا تھا۔
 ملای دل میں شرمندہ بھی ہوئی تھی شاید اسی لیے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی مگر سماعت دل و جان
 جان کا جواب سننے کی خاطر تھی حالانکہ اسے اسود کا حال احوال دریافت کرنا چاہیے تھا۔
 ”جانتاؤں فارحہ؟“

فرد نے نوالہ چنار رو کر اسے دیکھا۔ اس کا دل من پسند جواب سننے کے لیے بے تاب تھا۔ اسود
 ہٹا کر کہاں نکالے نچلاب دانٹوں تلے دبائے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں
 پڑھنے والی کو دیکھ رہی تھیں جبکہ فارحہ کی نگاہیں اسے.....

”میں نے جہیں کبھی یاد نہیں کیا۔ انفیکٹ زندگی اتنی بیکلک ہو گئی تھی بلکہ ہے کبھی فرصت ہی نہیں ملی کہ
 یاد کرے۔“ اس کی مسکراہٹ میں کسی قدر شرمندگی بھی تھی۔ وہ جھینپے ہوئے لیکن صاف گوانداز
 بدل رہا تھا۔ فارحہ کے سینے سے ایک قیدی سانس آزاد ہوئی تھی۔ اس کے لبوں نے اپنے خوش فہم دل
 کی آواز دی تھی۔ اس نے اگلا نوالہ لیتے ہوئے خود کو کپڑا کیا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔
 ”چرا کیسویں صدی ہے نا اس نے انسان کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا فرصت تو سمجھو عائب ہی ہو گئی
 ہڈیوں سے۔“

”آں اسود اب کم سے کم اس بے چاری سی مسکین سی اکیسویں صدی کو تو الزام مت دوساری دنیا
 بیاہم کر رہی ہے۔ اپنی لا پرواہی سے جو کام نہیں ہو پاتے اسے اکیسویں صدی کے زمرے میں ڈال کر
 نیکو اللہ ہو جاتی ہے۔“ اس نے اعتداس کہا۔

”سمت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اسی اکیسویں صدی میں سے فرصت کے لمحے نکال کر دوستوں کو یاد
 کرتے ہیں کہ تم نہیں کر پائے تو اور بات ہے۔“ اس نے آرام سے اسود پر چوٹ کی تھی۔

”اچھا تو وہ بہت سے.....“ وہ رکا۔ ”یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس عرصے میں تم نے کئی بار مجھے یاد
 کیا۔“

”جانتاؤں نہیں البتہ یاد ضرور کیا تھا۔“ اس نے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

”تو اس میں تمہارا کمال ہے اور نہ ہی اکیسویں صدی کا۔ اصل میں میری شخصیت ہی ایسی ہے کہ
 تمہارا کمال مجھے بھول نہیں پاتے۔“ فارحہ کا منہ کھلا رہ گیا اسود کا انداز تو ایسا نہیں تھا کہ جس سے یہ
 لگتا تھا کہ وہ اسے جبار ہے مگر اگلے ہی پل اس کے اعصاب کچھ جھنجھٹا سے گئے تھے۔

”البتہ ایک ترجیحی سی نظر اسود پر ڈالی۔“

پوروں کے ساتھ ناک کو ہولے سے مسلا۔ پھر دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر چہرے پر آئے بالوں
 کانوں کے پیچھے اڑنے لگی اس کے پاس فی الوقت ربر بینڈ یا کچر وغیرہ جیسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے
 اپنے بالوں کو قید کر سکتی۔ بارش کے پانی اور سرد ہواؤں کے پے در پے تجیڑوں کی وجہ سے اس کے بال
 خاصے روکھے ہو رہے تھے اور حالت ابتر ہو رہی تھی وہ دونوں ہاتھوں سے بال سینے کی کوشش کر رہی تھی۔
 جب اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا پھر کھٹکھٹارنے کی آواز پر اس نے سر اٹھایا مگر پھر جھکا لیا۔

اسود اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا اور ہاتھ میں پکڑی ڈش میں سے ایک گٹھا کر ڈش اس کی
 طرف بڑھا دی تھی جسے اس نے بنا کسی تردد کے تمام لیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کئی کاش سر اٹھانے لگے
 تھے جن میں ”کاش! او، رات کی طرح ابھی ہی رہتا۔“ اول الذکر تھا۔

وہ رات کا منظر نہیں بھلا پائی تھی۔ اتنی اجنبیت و سرد مہری تو اس سے پہلی ملاقات میں بھی تھی مگر
 اس نے بڑے دکھ سے خود کو تسلی دے دی تھی کہ اسے تو فارحہ ان فحار کا نام بھی یاد نہیں ہوگا۔

اور ٹھیک ہی تو ہے ایسے لوگ بھلا کب یاد رکھتے ہیں کہ کس کا کیا نام تھا کس سے کس وقت کیا کیا تھا اور
 یہ تو سامنے والے کی سمجھ بوجھ پر منحصر تھا کہ وہ اس ”کس“ اور ”کیا“ سے کیا مطلب اخذ کرتے ہیں۔

”کسی ہو فارحہ؟“ (اوہ) اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا پھر خود ہی بولا۔ ”میں نے تو کبھی سوچا
 بھی نہیں تھا کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہو پائے گی اور وہ بھی اس پجوشن میں..... خیر تمہیں پڑیاں ہونے کی
 بالکل بھی ضرورت نہیں ہے وہ اب خطرے سے بالکل باہر ہے۔“

فارحہ کل رات اس کی اجنبیت دیکھ کر خیر ان ہوئی تھی جبکہ اب..... اجنبیت کا تو جیسے کہیں نام و نشان
 بھی نہ تھا۔ اس کی آواز، اس کے انداز اس کی آنکھوں میں وہی اپنا پین جھلک رہا تھا۔ فارحہ کو یونہی مکان سا
 گزرا کہ شاید ان کے درمیان یہ ساڑھے پانچ سال آئے بیانی گزر گئے تھے۔

”اور یہ میں تمہارے کھانے کے لیے لایا ہوں صرف دیکھنے کے لیے نہیں۔“
 وہ کچھ پٹ کر ڈش کی طرف اشارہ کر کے بولا تھا جس میں ٹرانسپیرنٹ پیکٹ میں لپٹا ایک سینڈ وچ
 ایک بسکٹ کا ہاف رول اور کافی گالگ رکھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سینڈ وچ کھانے لگی۔

”مجھے لگ رہا ہے غریب تمہارے لیے بھی مجھے اس ہسپتال میں ایک بیہ خصوص کرنا پڑے گا۔ زنا
 آئینے میں شکل دیکھو اپنی۔ کبھی انڈے کی زردی دیکھی ہے؟ بلیوئی بالکل ویسی ہی رنگت ہو رہی ہے تمہاری
 اچھا ایک بات بتاؤ فارحہ! تم کھا نا نا بھی کھاتی ہو یا صرف سوکھے کر گزراہ کر لیتی ہو؟“

وہ بڑی سنجیدگی سے استفسار کر رہا تھا مگر اس کے لہجے میں رچا تبسم اور اسے چلانے والی غصوں
 اپنائیت اور غلوں کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ پہلے بھی یونہی بات کیا کرتا تھا۔ وہ اب بھی

”تم آج بھی اتنے ہی خوش فہم ہو جتنا کہ پہلے تھے۔“ وہ اپنی پرانی ٹون میں بولی۔
”اور تم آج بھی گرامر میں اتنی ہی غلطیاں کرتی ہو جتنی کہ پہلے کرتی تھیں۔“ فارحہ کے ٹوکے جواب

میں اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا وہ تیزی سے نظر کا زاویہ بدل کر کافی کے بڑے بیٹے
سپ لینے لگی۔

”بہر حال درست فقرہ کچھ یوں ہوتا کہ اسود تم آج بھی اتنے ہی خود آگاہ ہو جتنا کہ پہلے تھے۔“ اہر
کا انداز ہنوز تھا۔

”میرے فقرے کی درستی کا اندازہ تم اپنے اسی بیان سے لگا سکتے ہو۔“

اسود ہنسنے لگا تھا وہ بھی مسکرا دی پھر جب وہ ہاف رول کھول رہی تھی۔ اس نے اسود کو اپنی جینس ٹولے
دیکھا تھا پھر جو چیز اس نے برآمد کی اسے دیکھ کر فارحہ کو دھچکا لگا تھا۔

وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ فارحہ نے ناگواری سے اسے کش لگاتے دیکھا۔

”تم تو چائے کافی تک کونشہ کہا کرتے تھے۔“ وہ ہاتھ سے دھواں اڑا رہی تھی۔

”اب بھی کہتا ہوں۔“

”تو یہ کیا ہے؟“

”یہ سگریٹ ہے۔“ اس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان سگریٹ پکڑ کر گویا اعلان بم
پہنچائی۔ ساتھ ہی اسے یوں دیکھا گویا اس کے شناخت نہ کرنے پر متعجب ہو۔

”مجھے بھی نظر آتا ہے مگر اسود مت پیا کرو زنی لعنت ہے یہ۔“

”ایک ڈاکٹر کو مت سمجھاؤ۔“

”ڈاکٹر خود نہ سمجھے تو پھر بھی۔“ اس نے ناگواری سے سگریٹ اس کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لیا۔

بے اعتیاری میں وہ استحقاق جتا گئی تھی اور آنے والے لمحے میں یہ استحقاق اسے خاصا مہنگا پڑا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ سگریٹ بجھاتی اس کی کلائی اسود کے مضبوط ہاتھ میں قید ہو گئی تھی۔

”میری بیوی کی طرح بی ہیومت کرو فارحہ۔“ اس نے سگریٹ لے کر اس کی کلائی زور سے پکڑ

دھکیل دی۔

”میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی دوسرے کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔“ اس کا لہجہ بے حد درشت

اور سرد تھا۔

فارحہ سن ہی رہ گئی۔ دوسرے پل سبکی کے شدید ترین احساس نے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

”آئی ایم سوری! مجھے اس طرح سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تمہیں ایک سیکورڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے دراصل میں ہی۔“ وہ کہہ نہیں پایا کہ اس کی طبیعت

جھلکنا مضرب ذمہ گیا ہے۔ وہ بات بے بات بھڑک اٹھا ہے۔ ”آئی ایم سوری فارحہ!“ بہر حال اس

جھلکنا ایمن بھی مجھے نوکسی رہتی ہے تو مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”ہاں؟“

”میرے بیوی۔“

پاسکر نے لگا تھا۔ ”سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

”میرے“ فارحہ کے لبوں سے سکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹنے ہوئے آنکھیں

ہوئی تھی۔ اس قدر رشخہ میں بھی اس کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے چپکنے لگے تھے۔
 ”تمہارے پاس تو میرے کانٹیکٹ نمبرز موجود تھے بلاتین سکتی تھیں.....“
 ”وہ دراصل سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں کسی کو بھی نہیں بلاتا پاتا۔“

گردن موڑ کر اس نے نظریں موتیا کے پودے پر نکا دیں۔ پتے ہوا سے لرز رہے تھے جبکہ ہلکا آواز کی لرزش کو اس نے خود ہی محسوس کیا تھا۔

”اس بات پر تمہیں معاف کیا لیکن ٹریٹ بہر حال ڈیو ہے تم پر۔ داؤد حسن محبت یاب ہو جائے گا۔“

وہ کہہ رہا تھا۔ فارحہ نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ البتہ اس کا دامغ بہت تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اپنی ہی سوچ میں مگن وہ اس ماحول سے کچھ دیر کے لیے کٹ گئی تھی۔ بادلوں کی مہین چادر میں چھید کر سورج کی سنہری کرنیں لان میں ٹپکنے لگی تھیں۔

اسود کے زور سے پکارنے پر وہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

اسودا سے دیکھتا رہا پھر دھیمے سے بولا۔

”داؤد کے بارے میں سوچ رہی ہو؟“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ اس کا سر ہولے سے خنجر

کر بولا۔

”میں نے کہا تا کہ وہ ٹھیک ہے بس ابھی ٹریکولائزرز کے زیر اثر ہے اور یہ بھی صرف اس لیے کہ تکلیف کا اثر نہ لے پائے۔“ فارحہ نے سر جھکا کر اس کی تسلی بھری باتیں سنی تھیں پھر اس کے ایک مینڈن سے متعلق استفسار کرنے پر وہ تفصیل بتانے لگی کہ کیسے اس کا ہاتھ پھسل گیا..... گاڑی درخت سے ٹکرائی اور۔۔۔

”میرا تو صرف سر ہی اسٹیرنگ سے ٹکرایا تھا لیکن داؤد کی طرف کا دروازہ کھل گیا اور وہ کھائی میں گر گئے۔ شکر ہے کہ کھائی زیادہ گہری نہیں تھی۔ وہاں سڑک پر موجود لوگوں کی مدد سے میں نے داؤد کو نکال دیا اور یہاں لے آئی۔“

وہ کچھ مل خاموش رہا پھر گھٹنوں پر وباؤ ڈال کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

”ہاسپٹل کے ساتھ ہی فی میل ڈاکٹرز اور نرسز کے لیے ایک ہاسٹل ہے تم کچھ دیر وہاں آرام کرو۔“

راؤنڈ کے لیے جانا تھا۔ فارحہ وہں بیٹھی رہی اسے اپنے دل میں بڑا خالی پن محسوس ہوا تھا۔

بھرم قائم رکھنے کے لیے کچھ جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ٹھوڑی سی تلافی رکھتے ہوئے اس نے سہا

ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی۔

اہل میں ہوا کیا تھا؟

جائے می ۳۶ لے جانے کا وعدہ کر کے حفیظ سینئر لائی تھی اس کے لیپ ٹاپ میں وائرس آ گیا تھا وہ نہ جانتے تھے میں ہچکچا رہی تھی۔ چاہے سو منٹوں کے بعد ہی مگر فارحہ اس کے ساتھ آنے پر راضی ہو گئی تھی۔ وائرس ریموڈ کروانے اور چند دیگر کاموں میں انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔ پھر جب وہ یہ علم ہوا کہ آسان کروٹ لے کر رنگ بدل چکا تھا۔

”ایسا جیسے موسم میں ہاٹل کے کمرے میں جا کر جل مرنا حماقت ہی ہوگی۔“ ثنائے دھیمے سروں میں

”میرا اس سڑک پر جلنے مرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔“

”ایما۔“ ثنائے بس ملی بھر کو سوچا پھر اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے آگے چلنے لگی۔

”اب کہاں۔“ اس کے استفسار پر ثناء نے کندھے اچکا دیے۔

”جہاں قسمت لے چلے۔“

”میری طرف سے تم قسمت کے ساتھ جاؤ یا بد قسمت کے ساتھ بس اتنا یاد رکھو کہ میں اب ڈبل کی لڑائی لڑ رہی ہوں۔“

”سُکھو“۔ ”مٹانے اس کا ہاتھ پکڑ اور قریبی شاہجہ سنز میں گھس گئی۔ گھسی تو دونوں اتفاقاً تھیں مگر اندر سے ہی کانٹا نہیں یاد آگئیں جبکہ فارحہ کو تحریم..... چند روز میں اس کی منتفی کی تقریب متوقع تھی اور اسی کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ لینا چاہ رہی تھی مگر بہت تلاش کے بعد بھی وہ تحریم کی پسند کے مطابق ملے نہ کہیں کوئی ٹوٹا کے پاس آگئی وہ کاؤنٹر پر کھڑی ایک کرشل کا شوپس بیک کروار ہی تھی۔

”محبہ پسند آیا۔“

”نہ“ اس نے بری سی شکل بنا کر جواب دیا۔

یہاں چلے اور اپنی گفٹ شاپس بھی ہیں وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ ثنائی نے کہا۔

میں نے کارڈز بھی لینے ہیں اور وفا کے لئے حاکلیٹس بھی۔“ اس نے انہی بہن کا نام لیا۔

ایہ گفت پیک کرواؤ میں تب تک یہ کام نہ منشا کرتی ہوں۔“

یہاں ایک ہے لیکن تم ٹریل آؤ گے کہ یہ ہم مل کر اس کا انکار کر لے۔“

مہمان اے کھڑ کر دیکھا۔ ”مرد تم پیٹ ہے یا کنواں۔“

”جو بھی سمجھو پر میں کھاؤں گی ضرور۔“

”ہاں میری گالیاں۔“ وہ منہ کے زاویے لگاڑتی چلی گئی۔ فارحہ مطمئن سی گفٹ پیک کدوانے لگا کر ارادہ بدل چکا تھا۔ وہ اب ڈیکوریشن پیس سے زیادہ تحریم کے لیے لیدر کا پرس خریدنے میں دلچسپی رکھتی تھی مگر دکان دار اسے سنت جی چیزیں دکھا کر گویا لالچ دے رہا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھی قابل دیدہ لگے قابل سماعت و قابل ستائش تھی جس رفتار سے زبان چل رہی تھی اسی رفتار سے کاؤنٹر پر مختلف چیزوں کا ڈیمو لگتا رہا تھا۔ وہ فارحہ کو کچھ نہ کچھ فروخت کرنے پر بضد تھا۔ مجبوراً اس نے مٹی کی بنی ہوئی نمشی سی بیٹھیس پسند کر لی۔ اس پر دکان دار نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ بہت سی خوب صورت چیزوں کو رد کر کے اس نے فرمایا بھی تو کیا یہ بیٹھیس۔

”آپ کی چوڑی بہت اچھی ہے۔“ اس نے دانت نکال کر پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ فارحہ ہنسنے لگی روک پائی۔ بہر حال قیمت پر زبردست بحث ہوئی پھر درمیانہ راست اختیار کر کے آدمی کی بجائے تین فیڈ قیمت ادا کر کے جب وہ باہر نکلی تو شاہی بی گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکی تھیں۔ اس نے سب طرف دیکھا شاہ پنگ سنٹر کے اوپر والے حصے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے تحریم اور اپنی خریدی ہوئی بیٹھیس کے متعلق سوچ رہی تھی تجریم تحفے لے کر کیا محسوس کرے گی۔

ممکن ہے کہ مٹی کا کھلونا ہی میرے سر پر دے مارے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا پھر بجائے غلطی کس کی تھی مگر قصاصم زور دار تھا اور شکر ہے کہ ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم ہی رکھا تھا ورنہ جو دو تین سیڑھیاں عبور کی ہوتیں تو اس ٹکر کے نتیجے میں منہ کے بل گرنا لازمی امر تھا۔ بچت تو بہر حال اب بھی لگتی ہوئی تھی وہ سنبھلنے کے چکر میں پوری قوت سے دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔

”آ نکھیں نہیں ہیں؟“ ناک کی پھٹنگ پر ہاتھ رکھے وہ کراہی تھی۔ ہاتھ سے شاہ پنگ بیک پھل گیا تھا دونوں گفٹ پیک یہاں وہاں لڑھک گئے۔

”ہیں..... آنکھیں نہیں ہیں۔“ اس نے مقابل کی پریشان سی آواز سنی مگر پروا صرف اپنی اگلی ٹپاک کی تھی۔

”دیکھیے..... سوری۔“ وہ بوکھلایا..... ”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ سنے میں اس حادثے کے لیے شرمنا ہوں مگر آپ کو بھی ایسی کنڈیشن میں تنہا باہر نہیں نکلنا چاہیے اور بلیک گلاسز اور وائٹ اسٹک بھی ضرور ساتھ رکھنی چاہیے۔“

اس نے تحیر سے قدرے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا، گہری سیاہ آنکھوں میں فقط ایک رنگ لگایا تھا، ترجمہ کا وہ چونکی پھر کبھی اور جھنجھلا گئی۔

”جانب امی آپ کی آنکھوں کی بات کر رہی تھی۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”جانب کے چہرے پر پہلے حیرانی چمکی اور دوسرے ہی پل لمحوں کے گونے پھیل گئے وہ خفت لگ رہا تھا۔

”اس سوال پر وہ جی جان سے جل ہی تو گئی۔

”جانب امی آپ کی آنکھوں کی بات کر رہی تھی۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”جانب کے چہرے پر پہلے حیرانی چمکی اور دوسرے ہی پل لمحوں کے گونے پھیل گئے وہ خفت لگ رہا تھا۔

”اس سوال پر وہ جی جان سے جل ہی تو گئی۔

ہی زور سے ٹکرماری ہوتی تو آپ بنا کسی تردد کے اوپر پہنچ چکے ہوتے۔ ”وہ ٹھک گئی۔

”کوئی ہوتا تو کیا میں ٹکراتا۔“ اس نے شاید خود کلامی کی تھی نجانے اسے سنا ہوا مقصود تھا یا نہیں بہر حال فارحہ نے سن لیا تھا اور دل تو چاہا تھا کہ اس کا سر ہی پھاڑ ڈالے۔

”یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے جان بوجھ کر ٹکرماری تھی۔“ اس کے تیز کڑے تھے۔

”میں تسلیم تو نہیں کرتا البتہ آخر میں ضرور کہتا ہوں آپ کی ذہانت پر۔ بات کو کھما پھرا کر وہیں لٹاؤں ہیں اور اپنے موقف پر بھی ڈٹی ہوئی ہیں۔ بانی داوے آپ کرتی کیا ہیں؟“ خاصے دوستانہ انداز میں دریافت کیا۔

”آپ سے مطلب؟“ وہ اوپر پہنچ کر بیڑھوں کے ایک طرف کھڑے تھے۔

”آپ سے مطلب تو آپ ہی جانیں میں تو صرف ایک مشورہ دے رہا ہوں جو بھی کر رہی ہیں اے فی الفور ترک کر کے لاء کی فیلڈ اپنالیں۔ انشاء اللہ ایک دن اس فیلڈ میں بہت نام پیدا کریں گی۔ بے گناہ سے بے گناہ شخص بھی ہاتھ جوڑ کر آپ کے سامنے اقبال جرم کر لے گا۔“

”اپنے یہ بے شکے مشورے سنبھال کر رکھیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن آپ کے ہی کام آئیں گے۔“

الحال میرا نقصان پورا کیجئے۔ اچھے خاصے کرٹل کا کپڑا کیا ہے نکال لے چار سو بہتر روپے۔“

”دیکھا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گی۔“ وہ اپنے اعزاز کے سو فیصدی درستی پر خاصا مسرور نظر آیا تھا۔ فارحہ نے بنا کچھ کہے ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔

”چار سو بہتر روپے۔“ انداز دو ٹوک تھا مخاطب نے سینے پر بازو باندھتے ہوئے اسے نظروں کے حصار میں مقید کیا تھا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ چار سو بہتر روپے میں اصل نقصان پورا ہو جائے گا؟“

”بالکل۔“ فارحہ پر یقین تھی۔

”اچھا۔“ اس نے پل بھر کو سوچا پھر جینز کی جیب سے والٹ نکال کر مطلوبہ رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اصل نقصان اس رقم سے پورا نہیں ہوگا۔“ وہ اس قدر یقین تھا کہ پل بھر کو فارحہ کا یقین بھی ڈگمگا گیا۔ اس نے سوچتے ہوئے رقم کو دیکھا پھر اسے..... محروم مٹھے غائب ہو چکا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے گردن کھما کر ادھر ادھر دیکھا بیڑھوں سے متعلق رہش سے نیچے بھی جھانکا۔

”ایویں بول رہا تھا چنڈ..... نقصان بھلا کیوں پورا نہ ہوگا۔ تین سو بہتر کا تو آنے کا نیا ڈیکوریشن تھا اور باقی سو روپے کی ہم آئیں کریم اور گول مپے کھالیں گے۔“ اس نے پورا پورا حساب لگا کر لاپرواہی سے

بہت جی بٹا آتی تھی۔

”وہ اس پر الٹ پڑی۔“

+

فہ کی دوسری ملاقات ایک بک فیئر میں ہوئی تھی۔

یہ اس بار اسے کسی قسم کا لالچ دے کر نہیں لایا گیا تھا۔ کتابوں میں اس کی دلچسپی اتنی تو بہر حال تھی کہ مذاہن وقت میں وہ کسی اچھی کتاب کے مطالعے کو ترجیح دیتی۔

ایک مشہور اشاعتی ادارے کے اسٹال پر print media کے ریسرچ سے متعلق ایک کتاب نظر آنے پر وہ بہت ایکساٹینڈ ہو گئی تھی۔ اس مصنف کی یہ کتاب بے حد مشہور تھی اور ابتدائی کتابوں میں سے نہیں تھی تاہم بہت تلاش کے بعد بھی نہیں مل سکی تھی اور دیکھا جاتا تو اس بک فیئر میں آنے کی زیادہ وجہ یہی تھی۔ وہ کتاب خرید کر بڑی خوش خوشی ٹا اور ٹوپہ کرتا نہ جاری تھی۔

ایہ ایکسٹنٹ میں اسے آگے موجود دو بیڑھیاں دکھائی نہیں دی تھیں۔ وہ عین زمین پر ہوتی جو ایک ٹیبلہ اٹھانے سے اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔ اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے اور کچھ شرمندگی کے احساس سے غلبہ ہوتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔

”یقیناً آج بھی آپ ٹینس کھیل رہی ہوں گی۔“

آٹھوں میں ڈھیر ساری شرارت سموتے ہوئے وہ جسم سے لہجے و انداز میں پوچھ رہا تھا۔ فارحہ کو لکھ لائیں لگا سے پچھاننے میں۔ پھر اس نے حوالہ بھی تو لیا دیا تھا۔ دو دن پہلے کا وہ واقعہ اس کی آنکھوں میں لہوئے بنا ہی دم توڑ گیا۔ خفت تو اپنے یوں لڑکھڑا جانے پر ہوئی تھی جھنجھلا اس کی بات پر گئی۔

”تم ٹینس آج میں باسکٹ بال کھیل رہی ہوں۔“

اس نے بڑی خوشگوار صیت سے ہونٹوں کے کنارے یہاں سے وہاں تک پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

”سچ ہوگا۔“ آئی ایم بائیکلی امپر بے سنڈ۔“ فی الحال اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا پھر اس نے نظر اٹھا کر

تھیں غراؤں سے فارحہ کو دیکھا تھا۔

”عجب دیتا ہے تو چمپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ یہ فلاں میں نے آج تک صرف سنا تھا۔ مگر محاورے کی ان کے نزدیک موقع بس آج ہی ملا ہے۔ اب دیکھتے ٹانڈا نے آپ کو اس قدر ٹینٹ دے دیا ہے کہاں ان کے ٹک کرٹ میں جا کر رہی کھیلتے ہیں جبکہ آپ کسی بھی شاہجگ سنٹر میں اپنا شوق با آسانی پورا کر لیتی تھیں۔“

لکھنؤ اور اب باسکٹ بال بھی۔“ اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں انداز کچھ اور جبکہ الفاظ ان سب سے

بھی کچھ اور فارحہ نے بیچ و تاب کھاتے دل کو مشکل سے سنبھالا تھا۔

”ماشاء اللہ بھی کہہ لیں۔“ بڑے مصنوعی سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے ٹوکھرو صاحب کی ”دراصل مجھے نظر دراز جلدی لگ جاتی ہے۔“

اور اب کی بار وہ اپنا بے ساختہ اور بے قابو قبضہ روک نہیں پایا تھا۔ فارحہ کے چہرے سے معمولی مسکراہٹ بھی اڑ چھو ہو گئی۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر اسٹال کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی اس سے دو قدم کے فاصلے پر آن رکھا۔ یہاں سے وہاں تک انگریزی کلاسیکل ادب کی بھرمار تھی۔ وہ صرف خود کو لاپرواہا کر کے لیے ایک ناول دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں ٹاڈ اور ٹیبیہ کو خوب ہی گالیں سے نواز رہی تھی جو عین ضرورت کے وقت میں غائب تھیں۔

”آپ کو لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے؟“ وہ اسی سے مخاطب تھا۔

”جی بہت۔“ ناچاچے ہوئے بھی اس نے اختصار سے بہر حال جواب دے ہی دیا۔

”لیکن اردو لٹریچر کا اسٹال تو وہاں ہے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔“

فارحہ کے سر پر لگی تلوؤں میں بھی یا شاید تلوؤں میں لگی اور سر پر بھی دراصل غصے کی شدت میں اسے خود بھی خبر نہ ہو سکی تھی۔

”مجھے اردو اور انگلش دونوں طرح کے لٹریچر میں دلچسپی ہے۔“ اس نے ہر لفظ تقریباً چابی ڈالا تاہم اس پر تو جیسے کوئی اثر ہی نہیں تھا۔

”ریٹیلی؟ پھر تو آپ نے وہ کتاب ضرور پڑھی ہوگی؟“

”کون سی؟“ اس نے بھی بے ساختگی میں پوچھ لیا پھر اپنے دعوے کو دلیل سے ثابت بھی تو کرنا تھا۔

”ممتاز مفتی ان لو۔“ وہ استفسار نہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ فارحہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں نا۔“

”میں قدرت کے کاموں میں دخل دے کر بھلا اپنی عاقبت کیوں بگاڑوں۔“

وہ بولا۔ فارحہ نے خفا سی ہو کر رخ بدلا۔ پتا نہیں کیوں بار بار بے دھیانی میں اس کے سوالوں کے جواب دیے جا رہی تھی۔

”اچھا کم سے کم کلیات درؤ زور تھ کے بارے میں تو اظہار رائے کیجئے یا پھر کیس کی رہا عبات کے متعلق ہی کچھ کہہ دیں۔“

”اس معاملے میں تو آپ بازی لے گئے۔“ وہ مسکرا کر حساب چکانے میدان میں اتری تھی۔ ”میں تو

ابھی تک یہ معرکہ آرا کتابیں نہیں پڑھ سکی مگر مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔“ وہ بے پروا

آپ نے وہ کتاب بھی پڑھی ہوگی؟“ وہ بالکل اس کے سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

”کون سی؟“ اس نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا تو وہ اطمینان سے بولی۔

”میری بیٹل اس کا سر۔“ اس کی طنزیہ نظریں اسے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ بد مزہ ہونے کی

لہجہ۔ جب عنوان اس قدر خوب صورت ہے تو اصل مواد کتنا خوب صورت ہوگا۔“ وہ غالباً ذہن

کی منتال کر رہا تھا۔

”بہت سے بھی زیادہ ہی خوب صورت ہے۔“ وہ جل کر بولی۔ ”ویسے آپ ضرور پڑھیے گا کیونکہ اس

آپ چھ لوگوں کے لیے ہی خاصی سبق آموز داستانیں موجود ہیں۔“ وہ جانے لگی تو وہ تیزی سے اس

ماننے لگا۔

”فہم ضرور کیجئے مگر غصے میں اپنا نقصان تو مت کیجئے۔“

مسکراتی آنکھیں مسکراتا لہجہ۔

”مطلب۔“ وہ تنک کر بولی تو اس نے خاکی رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ اپنی کتاب اسی اسٹال پر چھوڑے جا رہی تھیں۔“ فارحہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کتاب چھٹی

بڑھ کر قدم اٹھاتی چلی گئی اور یہاں اس وقت..... اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی تقدیر میں یہ تیز

قدم اٹھانا اور اسی تیزی کی وجہ سے منہ کے بل گرنا لکھا جا چکا ہے اور جو تقدیر میں لکھا گیا بھلا اسے کون مٹا

سکتا ہے۔

+

”یسا سو ہے..... اسود ابراہیم۔“ تحریم کے نہایت پر جوش انداز میں بتانے پر وہ خاموش کی خاموش

مانا تھی۔

اگر تھ ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ تحریم اسے اتنی خوشی خوشی اس شخص سے متعارف کروانے جا رہی ہے تو

یہ کیا اس کے ساتھ نہ آتی۔ کوئی اس وقت اس سے پوچھتا کہ ”اسود ابراہیم“ نامی اس شخص کو دیکھ کر کیسا

میں کہہ رہی ہے تو وہ اپنے احساسات کے لیے صرف ایک لفظ منتخب کرتی۔ یا پوی اور پھر اس کی تشریح میں

ان کا رنگنے یا توقف کیے بولتی ہی چلی جاتی مگر دوسرے ہی بل اس پر منکشف ہوا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی

لے کے قائل نہیں ہے۔ وہ جی بھر کر بدول ہوئی تھی۔

مسکریہ مری بہت پیاری سی کزن اور فریڈ فارحہ۔“ تحریم نے بڑے پیار سے اس کے کندھوں کے

لہجہ سے کہا تھا اور جہاں وہ اس کے ”پیاری سی“ پر اس قدر زور دے رہے تھے کہ اس کی طرح شرمندہ

میں اس کے چہرے پر بے ساختہ سی مسکراہٹ کو ابھرتے اور پھر معدوم ہوتے دیکھ کر اندر ہی اندر

آئی اے بلا ہی تھیں وہ ایکسکیز کرتی وہاں سے ہٹ گئی۔
صیغہ آئی کے کہنے پر وہ تحریم کے کمرے سے حسین کے گھر والوں کو دیے جانے والے اخراجات لے جا

”اے مولیٰ تو تم خودی اس کی خوبیوں کی معترف ہو جاؤ گی اور تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں تمہاری تعریفیں نہیں کرتی۔ وہ ہے ہی تعریفیوں کے لائق میں نے تو سوچا تھا کہ اسود اور حسین کو طواؤں گی

وہ دبا گیا تھا پھر جنہیں نشست نزل کی وہ بے تکلفی سے گھاس پر براجمان ہو گئے۔

فیاض میں یہ سب کچھ دیکھ کر خفا ہوئے۔ خاصہ دور تھی اور حسرت بھری نگاہوں سے لیپ پوسٹ کی دو دھاریا روشنی میں ان قارخانہ لوگوں کو دیکھ کر کہتا تھا اس کا سب کے ساتھ شریک ہونے کا۔ دائرے سے اٹھنے پر قہقہہ کہتے ہو کر کچرہ میٹھی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا اس کا سب کے ساتھ شریک ہونے کا۔ دائرے سے اٹھنے پر قہقہہ کہتے ہو کر کچرہ میٹھی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا اس کا سب کے ساتھ شریک ہونے کا۔ دائرے سے اٹھنے پر قہقہہ کہتے

یہ اسودادہ ایم آخراپنے گھر کیوں نہیں جاتا۔“ اس نے منہ کے زواویے بگاڑتے ہوئے سوچا۔ ایک نادر وجہ اسے ان سب کے ساتھ شریک ہونے سے کوک رہی تھی۔ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خیر ہم بھی تعجب ہو رہا تھا وہ کیسے اس کی ذہانت، وجاہت اور شرافت کے گمن گایا کرتی تھی اور اب اتنا ایک طرف، وجاہت دوسری طرف جبکہ شرافت کا کہیں عمل دخل ہی نہ تھا۔ بلاوجہ جو فضول لڑکیوں جھا کر رکھا ہے کیا اسے شریف کہنا شرافت ہے۔

اے کل جی بی او کے سامنے والی سیزھیوں میں ہونے والی ملاقات یاد آگئی۔ وہ مہوش کو کس پوکا کارڈ
ن کر کے اپڑ گئی تھی جب اسے وہ دکھائی دیا اور ابھی تو وہ حیرت سے جھیلی آنکھوں کے رقبے کو بھی کم نہیں
رہا تھا جب وہ غمگیناوری حیرانی چہرے پر سجائے اس کے سامنے آن رکھا تھا۔

”آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہماری ملاقات سڑکیوں میں ہی کیوں ہوتی ہے؟“ اس کے دوستانہ سے
 خدا پروردہ چہلمے اڑی نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی مگر سرائس بھر کر بخیدگی سے بولی تھی۔
 ”اللہ ایسی نادروں میں آپ کو ہی مبارک کرے البتہ میں نے ایک بات ضرور سوچی ہے۔“
 ”کیا۔“ اس نے پر اشتیاق انداز میں دریافت کیا۔

”لہذا آپ لڑکیوں کا بیچا کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے آپ کو شرم بھی نہیں آتی۔“
اس کا انداز صاف کاٹ کھانے والا تھا وہ دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔
”لڑکیوں کا بیچا اور میں۔“ اس کے چہرے پر احتجاجی کی سی کیفیات رقم تھیں۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور لہجے کی سے بولا۔

”آپ نے مجھے کس لڑکی کا چچا کرتے دیکھا ہے۔“ فارحہ کو اس کے انداز میں ناگواری سی محسوس ہوتی تھی۔ مگر وہ نظر انداز کر گئی۔

”کس کس کو دفع کریں میں تو صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ آپ میرا پیچھا کرتے ہیں اور جہاں میں جلتا ہوں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔“ اس کا انداز ابھی بھی جارحانہ تھا۔

مکران کی ملاقات جم خانہ میں ہوئی اور مزے کی بات یہ ہے کہ بڑی اچھی دوستی بھی ہوئی۔ اب جھیل شاہد
یہ بات بھی عجیب لگے مگر ہے حقیقت کہ میرے علاوہ حسین بھی اس کا معترف ہے۔“

”ایسی کیا خاص بات ہے اس میں؟“ اس نے پوچھا تھا۔
 ”کوئی ایک بات ہوتا ہوں۔ تم اس سے ملو گی تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔“

”اچھا! تمہارا وہ نام کروڑ کیا مانتے پر اپنی خصوصیات لکھوا کر گھومتا ہے۔ جو مجھے ملے ہی تھا جمل جانے گا۔“ اس نے چڑانے والے انداز میں کہا تھا اور اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً تحریم کو اسوڑے حوالے سے چھیڑنے سے باز نہیں آتی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے ہی حسین بھائی کے کان بھرنے پڑیں گے یعنی کہ حد ہے۔ میں حسین بھائی کی جگہ ہوتی اور میری مستقبل قریب کی بیوی اس طرح سے کسی کی تعریفیں کر رہی ہوتی وہ بھی میرے سامنے تو پتا ہے میں کیا کرتی؟ میں فوراً سے پہلے تمہیں قتل کر دیتی تاکہ نہ رہے ہانس اور نہ بچے ہانسری“۔

وہ کم سے کم ایک بار تو اسودا براہیم سے ملنا چاہتی تھی۔ تحریم نے اس کا ذکر کر کے اس کے اندر نفس اور اشتیاق پیدا کر دیا تھا اور تحریم ہر ایک کی تعریف کرنے کی قائل نہیں تھی۔ وہ بہت کم لوگوں کی تعریف کرتی تھی اور ایسے لوگ واقعی قابل تعریف ہوتے تھے۔ فارحہ کو یقین تھا کہ اسودا براہیم، تحریم کی باتوں سے بے کم نہیں ہوگا اسے تحریم کی باتوں پر پورا یقین تھا مگر اس بار..... اس بار اسے حد سے زیادہ مایوسی ہوئی تھی کم سے کم اسے تو یہ بندہ کہیں سے بھی قابل تعریف نہیں لگا تھا۔

صیبو آئی کو ان کا مطلوبہ سامان فراہم کرنے کے بعد وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واپس لان میں آگئی گی
جہاں فی الحال محفل عروج تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے منگلی کی تقریب کی بجائے چھوٹے پیمانے پر کسی کا دعوت
دلیہ ہے۔ طارق اکل، صیبو آئی اور ان کے بچے خاصے سوشل واقع ہوئے تھے پھر سہ ماہیہ بھی ان ہی کے
جیسا تھا اور فارحہ چونکہ اسی شہر میں تھی اس لیے وہی شریک ہوئی تھی۔ نہ بھی ہوتی تو اس نے اس تقریب میں
ضرور شریک ہونا تھا۔ وہاں سیا کلوٹ میں عمامہ، ڈیڑی اور مہوش کی اپنی مصروفیات تھیں۔ مہوش ایسا اکل
فائل ایئر میں تھی مگر ایک لوکل رفاہی تنظیم کی ہیڈ تھیں جبکہ ڈیڑی اپنی ماربل اور گلاس ایئر شری کی مصروفیات
میں مگم۔

اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے قدرے تاریک گوشے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی میز لان کے
جھرنے سے کچھ فاصلہ پر تھی۔ سرمئی پتھروں کے نیچے ٹکٹی روشنی جپتے ہوئے شفاف پانی سے ٹکس
رہی تھی۔ ہوا میں رہتی مراد کی دھیمی دھیمی سی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے میز پر کبھی لاکر انھوں
کے پیالے میں چھوڑ رکھے وہاں دیکھنے لگی جہاں سب لوگ تھے۔ بڑے لوگ تو کچھ الگ تھک ہوئے
تھے جبکہ ساری ایک جڑیشن نے عین وسط میں قبضہ جمایا تھا اور گرد و پڑی کر سیدوں کو ایک بڑے سے

”یہ تو آپ ہی زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں۔ مجھے تو صرف اتنا ہی پتا ہے کہ آپ لڑکوں کی عادت ہوئی ہے کہ جہاں کوئی خوب صورت لڑکی دیکھی چل دیے اس کے پیچھے۔“

”خوب صورت.....“ اس کا ہتھیرہ زبردست تھا۔ اس کے طویل فقرے میں سے صرف یہی نظر اتری سمجھ میں آیا تھا۔ فارحہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ پرس ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر گھل کرتے ہوئے گویا اس نے اپنے اشتعال کو قابو کیا تھا۔

”بات سنئے کس خوب صورت.....“ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر اس نے پکارا تھا۔ اس کے رکے ہنجیدگی سے بولا۔

”یہ غلط فہمی اپنے ذہن سے نکال دیجئے کہ میں آپ کا پیچھا کرتا ہوں۔ اول تو بہت مصروف انداز ہوں میں تفریحاً بھی ایسا فضول کام کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ دوسرا یہ کہ مجھے ایسی فضول دے بیج حرکت کرنے کی ضرورت ہے بھی کیا؟ جبکہ آپ خود ہی ہر اس جگہ موجود ہوتی ہیں جہاں میں جاتا ہوں۔“

”واٹ۔“ وہ تقریباً کرٹ کھا کر پلٹی تھی۔

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر ہر اس جگہ پہنچ جاتی ہوں۔“

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔“ اس نے کندھے اچکائے اور دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ فارحہ کو اشتعال نے گھیر لیا۔ اس شخص کا ہر انداز چیخ و پکار کی بات کی تائید کر رہا تھا۔

”خاصی احتیاجی بات ہے بھلا کبھی سنا ہے آپ نے کہ کوئی لڑکی خود لڑکے کے آگے آگے ہو بیڑ لڑکے ہی لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔“ وہ بھنڈ تھی۔

”ضروری نہیں بہت سارے کیسز میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“

”جی نہیں ایسا نہیں ہوتا۔“

”آپ کو نہیں لگتا کہ آپ شاذ و نازم کا مظاہرہ کر رہی ہیں؟“

فارحہ کو یہ تجزیہ خاصا معقول سا لگا۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں؟“ خود اس کا اپنا انداز طرہ سے ماہو بن گیا وہ اطمینان سے بولی۔

”شروعات تو آپ نے ہی کی تھیں۔“

”خاصا گھسا پٹا لطیفہ ہے۔“

”مجھے نئے لطیفے بھی آتے ہیں کبھی، ہم فرصت سے مل بیٹھے تو ضرور سناؤں گا۔“

”انشاء اللہ حسرت ہی رہے گی۔“ وہ منہ میں بڑبڑاتی وہاں سے تپ گئی تھی۔

بچپنی ملاقاتوں میں بھی یہی ہوا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولی گئی تھی اور ہر دفعہ طویل منگول بچہ لپٹی تھی اور تو اور بات ختم بھی ایسے موڑ پر ہوتی تھی جہاں اسے کوئی معقول جملہ نہ ملتا تھا جہاں وہ اس کی

گرت کر گئے۔

اسے اس تنہا گوشے میں بیٹھے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ اتنا وقت گزر چکا تھا کہ وہ منہ کے برے برے زلزلے بنائی اور حسرت سے ان لوگوں کو دیکھتی بھی تھک گئی تھی۔ زیادہ غصہ تو تحریم پر آنے لگا تھا جو آج اسے تھکا فراموش کیے بیٹھی تھی۔ ”کیا اتنے لوگوں کے درمیان تحریم کو ایک بار بھی میری کمی محسوس نہیں ہوئی گی؟“

اس نے بدگمانی سے سوچا تھا۔ کیا تھا اگر جو ایک بار وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان سب کے درمیان لے جاتی پھر تو وہ صرف تحریم کا دل رکھنے کی خاطر اسودا براہیم کے جلوں کا سامنا بھی کر لیتی۔ مگر تحریم صاحبہ کا دل تو آج مکمل طور پر رکھا جا چکا تھا ابھی ابھی حسین نے حاضرین کے سامنے کوئی نظم سنائی تھی اور اس نے یہ نظم تحریم کے نام کی تھی۔ اتنی دور سے تحریم کے چہرے کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ضرور دیکھا تھا۔ وہاں سب لڑکے تحریم کو ہوت کر رہے تھے۔ فارحہ وہاں ہوتی تو ضرور اس کے یوں بلش کرنے پر اسے چڑائی مگر وہ وہاں نہیں تھی سو یہاں بیٹھی مروا اور رات کی رانی کی مہک سانسوں میں اتار تہی، مصنوعی آبشار کا شور سنتی وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

ایک لڑکو کو یہ خیال بھی آیا تھا کہ آخر اسودا براہیم کو اس قدر اہمیت دینے کا مقصد ہے کیا؟ فارحہ کو اسے ایک عام سے شخص کی طرح ٹرٹ کرتے ہوئے اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ محض اس کی وجہ سے ایک اچھا فنکشن اپنے لیے بوربنالے۔ مگر اچھا فنکشن بوربن چکا تھا۔

وہ انہی جی سوچ رہی تھی جب وہاں دائرے سے تالیوں کا شور بلند ہوا تھا۔ وہ ادھر متوجہ ہوئی چند لمحوں کے توقف سے اسکن کی نہایت مدھری آواز ہوا کی گود میں سوار ہو کر اس تک پہنچی تھی۔ کسی نے بڑھ کر مارے لب پوسٹ بجا دیے لان کی خشکی پر محض چاند کی دودھیا چاندی کی چادر تھی رہ گئی تھی۔

رات کی رانی کے ساتھ ساتھ فضا میں اٹھیلیاں کرتی یہ دلفریب دھن..... اگلے کئی لمحوں تک وہاں موجود ہر شخص پر گویا بحر پھونکا گیا تھا۔ وہ بھی پلکیں موندے ہتھیلیوں پر چہرہ نکائے بڑے جذب سے سن رہی تھی۔ اسی بہوت سی کیفیت میں اس نے ایک بار پھر تالیوں کی پر جوش آواز سنی تھی فضا کا ہر ایک چھتا کے سے ٹوٹا تھا۔ ہوا میں کھمرے سر پٹا کر و اسکن کے تاروں میں روپوش ہو گئے۔

وہ ہنسی ڈرا سا ایک کراسر پھونکنے والے کو دیکھنے کی سعی بھی کی تھی تبھی اس کے چہرے کے عین سامنے کسی نے چنگی بجائی۔

”ہیلو..... سو رہی ہیں یا رو رہی ہیں۔“ وہ شیشا کر پیچھے ہٹی پھر جھنجھلا کر رخ بدلا وہ بڑی سنجیدگی سے استہمامیہ نظر اس پر لگائے کھڑا تھا۔

”کتنے شور میں تو کوئی احتیاج ہی ہو سکتا ہے۔“ ناگواری سی ناگواری تھی۔

”اسی لیے تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“ سامنے والی کرسی گھسیٹ کر نشست سمجھاتے ہوئے اس نے برجستگی سے کہا۔

فارحہ نے اس کے بیٹھنے کو ناگواری سے دیکھا تھا۔ محض اس شخص کی وجہ سے وہ یہاں جھپ کر بیٹھ گئی تھی سب سے کٹ کر بیٹھی تھی جبکہ وہ لا پرواہی سے ادھر ادھر گردن گھماتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”میں سمجھا تھا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں مگر آپ کے تاثرات کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے پہلی ہی پہچان گئی تھیں۔“

”آپ بھولنے والی چیز تو نہیں ہیں۔“ غصہ دہاتی وہ بڑے ضبط سے بولی تھی جو اب اسو نے اسے ادا دیتی نظروں سے دیکھا تھا۔

”درست..... دراصل میری پرستیشی ہے ہی اتنی شاعر کہ لوگ مجھے چاہ کر بھی بھول نہیں پاتے۔“ فارحہ کے طعنے کے جواب میں اس نے اس قدر خوشگواریت سے کہا تھا کہ وہ جل کر خاک ہی تو ہو گئی۔

”خاصے خوش فہم ہیں آپ۔“

”خاصے خود آگاہ ہیں آپ..... یوں کہا ہوتا تو فقرہ زیادہ اچھا لگتا۔“

”خاصے ڈھیت بھی ہیں آپ۔ میرا خیال ہے کہ یہ فقرہ تو آپ کو ضروری اچھا لگے گا۔“

”اب آپ کی بات سے اختلاف کر کے میں تیل سے یہ تو نہیں کہہ سکتا نا کآؤ اور مجھے مارو۔“

”آپ مجھے تیل کہہ رہے ہیں۔“ اس نے صدمہ کی سی کیفیت میں دریافت کیا تھا۔

”تو اس میں اتنا بھڑکنے کی کیا بات ہے۔ ابھی ابھی آپ نے بھی تو مجھے ڈھیت کہا تھا اور مجھے تو ہائل بھی غصہ نہیں آیا۔“

”وہ اس لیے کہ آپ بہت گریٹ ہیں۔ کوئی بات چاہے درست ہو یا غلط دوسرے کا دل رکھنے کے لیے فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں شیرینی میں لپیٹ کر کھڑکایا تھا۔ ہونٹ مسکراتے ہوئے جبکہ لب و لہجہ چباتا ہوا۔

اسو نے اپنی بے ساختہ انداز کی ہنسی کو ہشک لیوں تلے قید کیا تھا بلکہ یہ بھی ایک کوشش ہی تھی اس کی گھموں میں ہنسی کا رنگ نمایاں تھا۔

”آپ کو پتا ہے آپ کی ناک اتنی چھنی کیوں ہے؟“

میز پر دونوں بازو باندھتے ہوئے اس نے جسم سا استفسار کیا تھا۔ اس بات پر جہاں فارحہ حجب دیتی تھی وہیں قریب آتی تحریم کو بھی حیرت نے گھیر لیا تھا۔

”جو بوجھ کی وجہ سے۔“ فارحہ کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

”دراصل آپ کی ناک پر ہر وقت غصے کا بوجھ اس قدر رہتا ہے کہ بچاری ناک تھک کر بیٹھتی ہے۔“

مطلق بیان کرتے ہوئے اس نے اطمینان سے کمر پشت سے نکالی تھی۔ فارحہ دانت کچکچا کر رہ گئی مطلق بیان کا تحریم کی ہنسی نے کیا تھا۔

”مجھے لا جک ہے۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے نہیں بلکہ سراسر غلط بات ہے یہ۔“ فارحہ نے تیزی سے اسے ٹوکا تھا۔ تحریم نے کسی قدر چونک کر اسے دیکھا تھا فارحہ کا جارحانہ انداز اس کے لیے نیا اور اُنوکھا تھا۔ وہ پہلی بار اسو سے ملی تھی اور پھر بھی اس طرح سے بات کر رہی تھی۔

”مجھے غصہ نہیں آتا بلکہ آپ کی حرکتیں مجھے غصہ دلا دیتی ہیں۔“

”اسی کو ہی حرکتیں کی ہیں میں نے؟“

”میرا چچا تو کیا آپ نے۔“ اس کا لہجہ و انداز نہایت ٹھوس تھا۔ تحریم کا ذہن کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسو نے اس کا چچا کیا کہ یہ تو وہ نہیں جانتی تھی مگر وہ اسو کو خوب اچھی طرح سے جانتی تھی اور اس سے اس بات کی توقع نہ باعث ہی تھی۔

”آج بھی آپ یہاں پہلے سے موجود تھیں انٹیکٹ مجھے معلوم ہوتا کہ آج یہاں آپ سے ملاقات رہے گی تو میں تمہارا جلدی ہی آ جاتا۔“

”اور مجھے معلوم ہوتا کہ آج یہاں آپ سے ملاقات ہوگی تو میں کبھی نہ آتی۔“

اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا تحریم کے خیال میں اس بات پر تو اسو کو برا ماننا ہی چاہیے تھا مگر وہ اس کا تھا تحریم کو یہاں بیٹھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ دونوں ہی وہ دونوں نہیں لگ رہی تھے جنہیں وہ اب لہ جاتی تھی۔ اسو کی آنکھوں میں شرارت اور لیوں پر کھیلنا تبسم بے حد نمایاں تھا۔ وہ کسی بھی غیر سے اس ریلوے فری نہیں ہوتا تھا۔

دوسری جانب قلعہ منہ کے برے برے زاویے بتا رہی تھی۔ اس کے انداز میں خنکی و ناراضی ہی تھی۔ ”پلو اس ملاقات کا ایک فائدہ تو ہوا مجھے ان کی اس اضافی خوبی کے متعلق پتا چل گیا..... بے حد مانگ کو ہیں یہ۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے تحریم سے کہتے ہوئے اسے سر رہا تھا اور اس سے قبل کہ فارحہ کچھ کہتی (نہ) تھی اتنا اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ بات ہی تعجب کا باعث تھی کہ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات نہیں ہے۔

”کیا تم دونوں میں سے کوئی مجھے یہ بتانا پسند کرے گا کہ یہاں ہو کیا رہا ہے؟“ اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”تمہارے فریڈ کی تعریف کر رہا تھا مگر یہ برامان گئیں۔“

”واٹ! وہ تعریف تھی۔“ فارحہ نے اسے کچا چبا جانے والے انداز میں گھورا۔ ”آپ مجھے تیل،

”ہندانہ کرے۔“ فارحہ نے دل کراس کی بات قطع کی تھی۔ ”اور اسے حراج شناسی نہیں بلکہ عمومی رویہ ہے۔“ جات ہر ایک کو بری لگتی ہے۔“

”جہاں۔“ اس نے تعجب سے کہا۔ ”شاید اسی لیے میرے تیل کہنے پر آپ اس قدر خفا ہو گئی تھیں۔“ وہ رخ مڑ چکی تھی۔

”ہو۔“ اور اس سے آگے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ تبھی بڑے اشتعال سے سامنے والی کرسی کو ٹھوکر مارنی آئی تھی اور دوسرے ہی پل پاؤں کی انگلیوں کی پوروں کو لگنے والی ضرب سے لب بھینچ لیے تھے۔ ساتھ ہی آنکھیں بھی..... آنکھیں کھولیں تو اسودہ بند ہونوں پر مٹھی بجائے مسکراہٹ دبا تا بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے ضبط سے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے اس دل جلانے والے انداز کو نظر انداز کر کے گزر رہا تھا جتنی مکر.....

”آپ ایک انتہائی بدتمیز انسان ہیں۔ نہ تو لڑکیوں کا چچھا کرتے ہوئے آپ کو شرم آتی ہے اور نہ ایک انسان کو تکلیف میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے شرم آتی ہے۔“ وہ قدم اٹھاتے اٹھاتے رکھی اور پلٹ کر کھانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”میں دعا کروں گی کہ آپ بھی ایسے ہی کرسی سے ٹھوکر کھائیں۔ تب میں بھی آپ کو دیکھ کر یونہی مسکرائوں گی جیسے آپ مسکرا رہے ہیں۔ بالکل ایک لنگور کی طرح۔“

اور اسودہ کے بے ساختہ قہقہے نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

+

گلابی میں ڈھیروں ڈھیروں چوریاں چڑھانے کے بعد اس نے آئینے میں خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی تو اور کانوں میں بندے پہنتی تحریم کے سامنے جا کر کی تھی۔

”کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس کے پوچھنے پر بیڈ پر نیم دراز تحریم نے کتاب بند کر کے آنکھوں پر نگاہاں لگا کر پرچہ نظر کا چشمہ درست کرتے ہوئے سر تا پا اسے دیکھا تھا۔

”ہوں..... تم اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”لیکن اتنا تیار ہونے کے بعد اچھا لگنا نہیں ہوتا۔“ آپ ڈھیروں ڈھیروں میک اپ توپ لیں اور پھر پوچھیں کہ میں کسی لگ رہی ہوں؟“ اور فارحہ نے اس کے اس انداز کو بخوبی سمجھتی تھی تبھی اندنی ہوئی مسکراہٹ لبوں تلے بھینچ کر اپنا پرس کھٹکا لے گئی۔

”ہاں! تم اچھی لگتی ہو بشرطیکہ تمہیں آنکھیں بند کر کے دیکھا جائے تو.....“

فرحہ نے قریب پڑا انکیہ اسے سمجھنا مارا تھا۔

مینڈک کبھی سے ملاتے رہیں اور میں ان باتوں کو تعریف کی طرح وصول کرتی رہوں۔“

”ویل..... میں نے تو آپ کی تھوڑی سی تعریف کی تھی۔“

”دیکھیے مجھے لگتا ہے کہ آپ دونوں کے درمیان کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے اور اس کی انڈر اسٹینڈنگ کو صرف مل جل کر ہی سلجھایا جاسکتا ہے۔“ تحریم نے منصفانہ رویہ اختیار کیا۔

”تم دونوں مجھے بتاؤ کہ اصل میں ہوا کیا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں بس اس دن شاپنگ سنٹر میں.....“

”نہیں میں بتاتی ہوں۔“ فارحہ نے ساری بات تمام تر جزئیات کے ساتھ بتانی شروع کی مگر بھی بے فیر تک ہی پہنچی تھی کہ تحریم کو اس کے پاپائے بلا لیا اسے ناچار اٹھنا پڑا۔

”میں ابھی واپس آ رہی ہوں خدا کے لیے دوبارہ جھگڑا مت شروع کر دیتا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

”نہیں تم یہیں بیٹھو۔“ وہ چلی گئی فارحہ مصلحت بیٹھی رہی اور رخ بھی بدل لیا مگر اس سب کے باوجود اسے اپنے چہرے پر پھیلے خفا خفا سے انداز کو ختم کرنے میں دقت ہوئی تھی۔

”اچھا ایک بات تو بتائیں۔ آپ کو کتابوں سے واقعی دلچسپی ہے یا اس دن صرف خود کو لاپرواہ کرنے کے لیے اس اسٹال پر رک گئی تھیں۔“ کچھ دیر بعد اسودہ نے پھر اسے مخاطب کیا تھا۔

”مجھے آپ جیسے کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ لہجہ قدرے دھیمہ اور کم جارحانہ تھا مگر خفا خفا لگ رہی تھی۔

”آپ کو کیسے پتا کہ میں کیا کام کرتا ہوں۔“ اس نے پھر پوچھا تو وہ اطمینان سے بولی۔

”میرا تو خیال ہے کہ آپ کوئی بھی کام نہیں کرتے سوائے.....“

”سوائے خوب صورت لڑکیوں کا چچھا کرنے کے.....“ اسودہ نے اس کا جملہ مکمل کر دیا تھا۔ فارحہ ایک ترجمہ سنجیدہ ہی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت لیے اسے تنک رہا تھا۔

”بالکل۔“ وہ کچھ اور کہنے والی تھی مگر کہا یہ..... جواباً وہ محظوظ ہوتا مسکرایا تھا۔

”محترمہ! ڈاکٹر ہوں میں۔“

”شکل سے تو نہیں لگتے۔“ بہر حال حساب چکانے کا موقع اسے بھی میسر آ گیا تھا۔

”شکل سے کیا لگتا ہوں۔“ اس نے دلچسپی سے پوچھا تو وہ اک شان بے نیازی سے بولی۔

”یہ مت پوچھیے کیونکہ جھوٹ میں بولی نہیں اور سچ بتاؤں گی تو آپ برا مان جائیں گے۔“

”اے کہتے ہیں حراج شناسی..... ابھی تو ہماری چوتھی ہی ملاقات ہے اور آپ کتنا بھی جمل ماکا

سی بات مجھے بری لگ سکتی ہے..... سوچتا ہوں دو ایک ملاقاتیں اور.....“

”ہاں بابی.....“ دین محمد نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ تیزی سے تنبیہی انداز میں اس کی بات کاٹ گئی۔
”خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔“

اس کے کونزب سے دیکھ کر وہ مزید دلیل لگتی تھی۔ وہ اس کی توقعات سے زیادہ زخمی تھا۔ دین محمد نے پوسٹل بکچری کی کچھلی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔

فائدہ لگائی گئی۔ جب تک دین محمد نے گاڑی قریبی ہاسپل کے پارکنگ میں روکی وہ گردن
اس بچے کے بیٹ سے لٹکے ہاتھ سے پانی کی طرح ٹپکتے خون کو دیکھتی رہی تھی جو فٹ میٹ میں
سودا تھا۔ اس بچے کی عمر زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال رہی ہوگی دین محمد نے پھر سے اسے گود میں
اٹھل کی عمارت کی جانب دوڑ لگائی تھی۔ کار لاک کرتے ہوئے قارحہ نے اپنی ٹانگوں میں بڑی
لیکاپٹ محسوس کی تھی۔ اس بچے کے حوالے سے اس کی کیفیات بڑی عجیب تھیں۔

ہراسے تا نہیں چلا کہ کیا ہوا؟ ایمر جنسی وارڈ کے کاریڈور میں اپنے ارد گرد چلتے پھرتے لوگوں کو وہ ہنر کم مایوں کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ وہاں ایک شور تھا اور وہ مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس لمحے گرتی سانسوں کی تکلیف وہ خود محسوس کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے اپنی آنکھوں میں نمی سی محسوس کی، مائل پہلے کا تھا بھی اس نے ایک آواز سنی تھی۔ بے حس و سردی آواز۔

جب تک پولیس نہیں آجاتی ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ ایف آئی آر درج کروائیں اس
 قیام پے کونٹریٹ دبے سکیں گے۔“

لہذا سب کے دوران اگر اس بچے کو کچھ ہو گیا تو.....؟“ اس کے لہجے میں ایک خدشہ سا گونجا تھا۔
 نے غائب سے چونک کر اس نے اس سرد مہر کی جانب دیکھا مگر وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کی بات
 کے بند ہو گیا تھا۔ وہ بڑی بے ساختگی سے اس کے تعاقب میں بھاگی تھی۔

اس کے اس شخص نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اس کا سچا سنورا روپ اور یوں خود سے رہنے کے اعداد و احوال طور پر تشویش کا باعث تھا۔ وہ اس کے قریب سے گزرنے کو سعی جب اس نے اسے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے رکی تھی۔

نہیں تھا۔ اس کے حیرت میں جتنا سوال نے گویا اسے ہوش دلایا تھا۔
 لڑکچہ بچہ کا بے بس وجود سسکیاں بھر رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے اس شخص کو پہچان نہیں پا

دیکھنا تھا کہ وہ دیکھتا پا کر وہ مزید گھبرا گیا تھا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام کر

”جسٹوں کا عالمی مقابلہ اگر کبھی منعقد ہوا تو پہلا انعام تم ہی کو ملے گا۔“
”مجھ سے پہلے حسین بھائی اس انعام کے حقدار ہوں گے میں نے اکثر انہیں تمہاری تعریف کرتے سنا ہے۔“

”تم انتہائی فضول لڑکی ہو فارحہ کی بچی۔“ اس نے بے ساختہ قہقہہ لگا تھا۔ فارحہ بھی مسکرائے مگر۔
 ”مٹھرو میں دین محمد سے کہتی ہوں وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔“ چنچل پاؤں میں اڑتے ہوئے فتح علی نے کہا۔
 تھا۔ پھر وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکلتی تھیں۔ وہ دونوں قیل یہاں آئی تھی۔ فاضل ایئر کے اسٹوڈنٹس ان کونسل
 کے لیے ویلکم پارٹی کے انتظامات کر رہے تھے اسی سلسلے میں دونوں کلاسز آ رہی تھیں فارحہ اس موقع پر
 فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں آگئی تھی اور اب دونوں یہاں گزار کر وہ سیدھی اس قریب میں شریک ہونے
 رہی تھی۔

دین محمد اس گھر کا پرانا ملازم اور خاصا باتوئی سا پٹھان تھا۔ گمریلو ذمہ داریوں کے علاوہ ایک وقت ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دے لیتا تھا اور چونکہ وہ فارحہ کو بخوبی جانتا تھا اس لیے اس وقت اپنے مخصوص لہجے میں اسے اپنے پوتے کا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔ فارحہ حسب ضرورت گفتگو میں کوئی ٹکراؤ لگا دیتی جس سے اس کی تسلی ہو جاتی۔

سکھل پر گاڑی رکھی تھی یونہی لاشوری طور پر گردن کھماتے ہوئے اس کی نظروں ہاتھ کے کنارے بے یار و مددگار پڑے اس بچے پر جاری تھی جس کے ارد گرد خون بکھرا پڑا تھا۔ پیدل چلنے لوگ اسے ہانڈ سے دیکھتے تھے اور پھر بڑی لاشعلتی سے گزر جاتے تھے کوئی بھی رک کر اس بچے کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شہر کے اس کمرشل ایریا میں ایک سے بڑھ کر ایک بے حس انسان موجود تھا۔ وہ اس بچے کے ایک ہاتھ کو دلا کی درخواست کے لیے بڑی مشکل سے اٹھا اور پھر نہایت کے مارے گردنا دیکھ کر کانپ سی گئی تھی۔

”ایک اور ایکٹیوٹ۔“ اس نے دین محمدؐ کا تاسف بھرا جملہ سنا تھا سبکل مکمل چکا تھا۔
 ”ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے دین محمدؐ۔“ اسے گاڑی میں سواتا دیکھ کر فارحہ نے کہا تھا کہ دین محمدؐ کا لالہ
 بڑا لالچ و اساتھا۔

”چھوڑ دو بی بی! ایسے ایکڑینٹ تو روز ہی ہوتے ہیں۔“

”کیا مطلب روز ہوتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں خود بخود درشتی سی آگئی۔ اپنے دل میں اس ڈیڑھ بچے کے لیے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے وہ اس فنکشن کو مکمل طور پر بھول گئی تھی جس کے لیے وہ کئی دن سے پرجوش تھی۔

”روز ایکسڈنٹ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم اس کی مدد ہی نہ کریں۔ آپ
مکن لے چلیے ہم اسے ہسپتال لے چلتے ہیں۔“

اسود سے مخاطب تھا۔
 ”آپ میرے آفس میں آئے اسود، ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر لیتے ہیں۔“
 ”آپ کے اطمینان میں اس بچے کی جان چلی جائے گی۔“ فارحہ نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی

”ہم میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنی..... تم چلو میرے ساتھ اسود۔“ وہ اس کے بازو کو مضبوطی
 پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسود نے اپنے کندھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا
 تکیے ہوئے سناٹ سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”ہیں ڈاکٹر عبداللہ کی بات سنی چاہیے فارحہ! وہ اس ہاسپٹل میں سرجن ہیں۔“
 فارحہ کو یاد آ کر ہاس کی بات ماننی پڑی۔ حالانکہ دل میں شدت سے خواہش ابھر رہی تھی کہ وہ اس
 شخص کو مار ڈالے۔

”میں اس مریض کا چیک اپ کر چکا ہوں۔ اگرچہ تفصیلی چیک اپ نہیں کیا، کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا
 پتہ بخوبی جانتے ہو۔ ایک سیٹ کا کیس ہے پولیس کا انوالو کیے بنا کچھ بھی کرنا بہت رسکی ہوگا ہمارے
 بہت تفصیلی معائنہ نہ کرنے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم سے کم بھی وہ بچہ ڈیڑھ گھنٹے سے زخمی
 خون بہہ چکا ہے اینڈ آئی ایم شیور کہ اس کی بیک بون پر بھی کم سے کم تین میجر
 injury ہیں۔ ہمیں اس بچے کو ٹریینٹ دینے میں کوئی تعرض نہیں ہے لیکن اگر ہماری ٹریینٹ کے بعد
 وہ ٹیکس ہاؤس یا توب سے پہلے گردن ہماری ہی پھٹنے لگی۔“

”آپ میری توقع سے بھی زیادہ بے حس ہیں ڈاکٹر۔“ فارحہ بس یہی کہہ سکی تھی۔
 ”ڈاکٹر عبداللہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فارحہ! پولیس کو انوالو کیے بنا کچھ بھی کرنا نہایت رسکی ہوگا
 ڈاکٹر! جن بڑے آرام سے ڈاکٹر پر الزام تراشی شروع کر دیتے ہیں۔ پولیس آجائے تو.....“

”پولیس کے آنے تک وہ مر جائے گا۔“ بے اختیار وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ کاریڈور میں چلتے لوگ
 کا اٹھنا دیکھنے لگے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ اور اسود نے نہایت شرمندگی سے ارد گرد کھڑے لوگوں کو دیکھا

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرا بس ہے۔ وہ حد سے زیادہ زخمی ہے تم انتظار کرنے کے لیے کہہ رہے
 تھے یہ تم کو اسود کہ میں پولیس کا انتظار کروں مجھ سے یہ کہو کہ میں اس کی موت کا انتظار کروں
 سگے ہوئے تڑپتے ہوئے دیکھوں اور.....“

”کلی! کلی!“ دین محمد کی آواز بروہ یک لخت خاموش ہو گئی تھی۔ تیز تیز بولنے اور چیخنے کی وجہ سے اس کا
 بال ہلکا ہوا تھا۔ گردن میں سینے پر ٹکس سے اور رگیں ابھری ہوئی تھیں وہ رک گئی تھی۔ وہ ٹھٹھک گئی تھی۔

”پلیز فارحہ! ٹیل میں..... ہوا کیا ہے۔“ وہ تشویش میں جھلا تھا اور تب وہ اسے پہچان گئی حمی کاہل
 بکھری آنکھوں میں پہچان نے انکڑائی مٹی تھی۔

”اسود..... وہ..... وہاں۔“ سراسیمگی میں بس وہ یہی کہہ سکی تھی۔ مگر دوسرے ہی بل وہ بڑے تچی
 انداز میں اس کا ہاتھ تھام گئی تھی۔

”وہ بہت زخمی ہے اسود..... تم..... تم پلیز اسے بچالو۔“

”کون بہت زخمی ہے..... تم کس کی بات کر رہی ہو؟“

”وہ..... طلحہ.....“ اس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی اور آنکھوں سے آثار بہنے لگے تھا۔

”کون طلحہ؟“ اس نے اسود کو سنا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر اپنے گال پونچھنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ کلائی میں
 پڑی چوڑیاں پوری شدت سے ٹھٹھک اٹھی تھیں۔

اسے اس ٹھٹھک سے وحشت ہوئی۔ اسے اپنی کلائی میں پڑے ان رگوں سے وحشت ہوئی۔ ان
 چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں توڑ دینے کی خواہش کو اپنی تمام تر شدتوں سے محسوس کرتے ہوئے وہ دل ہی
 دل میں خود کو باور کروا رہی تھی وہ خود کو یقین دلارہی تھی کہ جس کو اس نے سڑک کے کنارے تڑپتے دیکھا ہے
 وہ ”وہ“ نہیں ہے وہ ”طلحہ“ نہیں ہے۔

اپنی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو بمشکل اعتدال پر لاتے ہوئے وہ اسے ساری بات بتانے لگی تھی اور
 آخر میں اس نے بڑی التجا سے اسے کہا تھا کہ وہ اسے بچالے۔

”انشاء اللہ اس بچے کو کچھ نہیں ہوگا فارحہ! میں ابھی یہاں کسی سے بات کرتا ہوں۔“

اس نے متلاشی انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔
 ”نہیں تم اسے دیکھو۔“ وہ بھند تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ قطعی طور پر بھول گئی تھی۔ کہ کل تک وہ اس
 شخص کو ڈاکٹر ماننے سے انکار کرتی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بس امید کا جھنکوا تھا اور وہ اس جھنکو کو کھوتا نہیں چاہتی تھی۔
 ”لیکن فارحہ..... میرا تعلق اس ہاسپٹل سے نہیں ہے۔ میں تو یہاں ایک سرجن سے ملنے آیا ہوں۔
 میں کیسے.....“ وہ تذبذب میں جھلا تھا فارحہ نے اس کی بات سرعت سے قطع کر دی۔

”تم صرف اسے ایک بار دیکھ لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”چلو میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔“

فارحہ نے اسے بہت تشکرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے گال کو رگڑا تھا اور اس سے ٹپکی کھائی
 کی ہر ای میں قدم بڑھاتی ایک آواز نے اس کے قدموں کو زنجیر کیا تھا۔ اس نے سڑک دیکھا دی ہر جہرہ

”کیا ہوا ہے اسے؟“

”طلحہ اب نہیں ہے۔“

”وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔“

”وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے فری۔“

”شاید اس عورت کا طبع بھی اسے چھوڑ گیا ہے۔“ اس نے سوچا تھا تبھی اس کی اس کم سمی کیفیت پر گہرا کرا سو نے اسے پکار لیا تھا۔

فارحہ نے اس کا بے اختیار سہارا دینے کے لیے بڑھا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”مبارک..... بہت بہت مبارک ہو آپ دونوں کو۔“ اس نے ایک کاٹ داری نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ ایک کے ماتھے پر M.B.B.S کا ٹیگ چسپاں تھا اور دوسرے کا سفید ادور آل اور ہاتھ میں پکڑا اسٹیکھو سکوپ اس بات کی نشاندہی کرتے تھے۔

”پولیس نہیں آئی۔ اس بچے کو ٹریسٹ نہیں ملی۔ وہ مر گیا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ آپ دونوں کو تواب بہت خوشی ہو رہی ہوگی نا..... اب آپ لوگوں کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“

اسود کو اس کی ذاتی حالت پر شک ساگرز اٹھا۔ اتنی بہتہ زحی سے اپنا ہاتھ جھٹک دینے کے ہادر

گھٹیا ہو..... سب کے سب گھٹیا ہو۔“

”فارجہ۔“ اسود نے قدرے سختی سے اسے ٹوکا تھا اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں نے اسے
عبداللہ سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے سینئر میں سے تھے۔

”تم میرے ساتھ چلو فارحہ۔“

”میرے ساتھ۔“ وہ سابقہ انداز میں چلائی تھی۔

مجھے نہیں جانا مہارے سے بڑھ کر برے نکلے ہوا سودا برا ہیتم! میں نے سوچا تھا کہ تم صرف مجھے دیکھو، تم تو میری سوچ سے بڑھ کر برے ہو۔ اسی لیے میرا چچھا کرتے ہو۔ مجھے گرتا دیکھ کر کہتے ہو مگر یہ تو مجھے لگا کہ اس نے اس قدر برے انسان بھی ہو سکتے ہو۔ تحریم کہتی تھی کہ اس کی باتیں نہیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ تم اس قدر برے انسان بھی ہو سکتے ہو۔ ایک آوارہ بھی ہے۔ میں نے مان لیا کہ اسودا چچا ہے لیکن تحریم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک آوارہ بھی ہے۔ کاکا چچا کے قودلی سکون حاصل کر سکتا ہے جبکہ کسی مرتے ہوئے انسان کی مدد کرنا اس کی فطرت ہے۔ اور اس کے بعد وہ بولتی ہی چلی گئی تھی پہلے اس کے پروفیشن اور پھر اس کی ذات کے لیے نہیں ہے۔“ اور اس کے بعد وہ بولتی ہی چلی گئی۔ یہ دیکھے بنا کہ اسودا برا ہیتم کے چہرے کے سخت اور نامناسب الفاظ استعمال کرتی ہی چلی گئی۔

ایک پرہیزگار شخص مس فارحہ۔ “اسود کی آواز اس کی طرح بلند نہیں تھی مگر غراہٹ اتنی واضح تھی کہ سنا ہوگی۔

”تم کون ہوتی ہو یہ کہنے والی کہ میں اچھا ڈاکٹر نہیں ہوں اور یہ کہ میں اپنے پروفیشن سے مخلص نہیں میرے دل کی جگہ پھرٹ ہے جس میں رحم کا کوئی نام ہی نہیں اور یہ کہ میں بے حس ہوں۔ اچھا ہوں وہ بڑی کڑی سوالیہ نظروں سے اسے دیکر ہاتھ فارحہ کو پہلی بار اپنی پوزیشن آکوردگی سے پہلی بار اپنے گرد جمع لوگوں کو دیکھتا تھا۔

”جب سے یہاں کھڑی ہو جو تمہارے دل میں آ رہا ہے بولتی جا رہی ہو۔ میں نے سوچا کہ تمہیں پہچانے۔ اس لیے تم یوں جذباتی ہو رہی ہو مگر یہ معلوم نہیں تھا مجھے کہ تمہاری ذہنی حالت پہلے سے ہی ہے۔ دوبار تم سے ہنس کر بات کر لی۔ تمہاری باتوں کا جواب دے دیا یا دو سے زیادہ اتفاقی ملاقاتیں ہوئے۔ کچھ لیا کہ میں تمہارا تعاقب کرتا ہوں وہ کیا خوش فہمی ہے۔“ وہ استہزاء سے بولا تھا۔

”ختمہ فارحہ صاحبہ! نکل آئیے اس احمقانہ بات کے چکر سے۔ جن چند اثقاف ملاقاتوں کو میں نے بہت ہی نہیں دی ان سے تم نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میں تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہوں اور یہ کہ میں اس آوارہ اور لنگ جوجر لڑکی کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے اور تم نے کتنے آرام سے یہ کہہ دیا کہ میں اچھا نہیں ہوں۔“

”نہیں فارحہ بی بی! میں اچھا ہوں۔ بہت اچھا انسان ہوں کم سے کم تمہاری طرح تو نہیں ہوں۔“

”صرف خود کو بچانے کے لیے یہ جھوٹ بول دے کہ اس بچے کو زخمی حالت میں سڑک کے کنارے اٹھالیا ہے جبکہ بچے کا سکیڈٹ خود اپنی گاڑی سے کیا ہو۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے تم پر۔ کیا یہ کہتے ہوئے اس لڑکے کو اس بچے کے قاتل ہیں تمہیں ذرا بھی شرمندگی نہیں ہو رہی؟“

”چلو خیر اب تمہیں بھی امیر ماں

باپ کی امیر اولاد کو شرمندہ ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ روڈ تو تمہاری ملکیت ہی ہوئے نام۔ چاہے ایک کی بجائے دس بچوں کو نکلیں مارو۔ قاتل تو پھر بھی ہم ڈاکٹر زہری رہیں گے جو پشٹل کو بروقت ٹریسٹ نہیں دیتے۔“ فارحہ کا سراپا الزام پر جھلکا چلا گیا۔ پھر فارحہ سے مزید وہاں نہیں لگا گیا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔

دین محمد کو اس نے ہاٹل تک خود کو ڈراپ کرنے کی ہدایت کر کے باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ دکانوں کے باہر کہیں کہیں نیون سائنس جگمگا رہے تھے۔ آسمان کے کنارے سیاہ ہونے لگے تھے۔ اپنے کرب سے بوجھل دل کو تسلیاں دیتے اس نے خود سے ایک آخری اعتراف کیا تھا۔ وہ کل تک اس شخص کو ناپسند کرتی آئی تھی اور آج..... آج وہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔

✦

”طنخہ کون ہے؟“

اس سوال پر اس نے گردن نہیں اٹھائی تھی بلکہ گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ شرمندہ نہیں تھی وہ غمگین تھی۔ وہ روئی بھی نہیں تھی مگر اس نے کرب کو اپنے دل کی حدود تک پھیلنا محسوس کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسودا براہیم بڑی سنجیدگی سے اپنے سوال کا جواب جاننے کا منتظر ہے۔

تحریم کے علم میں اپنے اور اسود کے مجھڑے کی بات لائے بغیر اس نے اس ہاتھل کا ایڑہ میں معلوم کیا تھا جہاں اسود جا ب کرتا تھا اور اسی شام بنا کسی پس و پیش کے وہ اس سے ملنے پہنچ گئی تھی۔ پچھلے دو دن کی مسلسل خود اکتسابی کے بعد اس قسم کے کسی کام کی ضرورت نہیں تھی۔

”ڈاکٹر اسود تو اس وقت وارڈ کے راؤنڈ کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ آپ ان کے روم میں انتظار کر لیجئے۔ کاریڈرو میں فرسٹ روم انہی کا ہے۔“ وہ سر ہلا کر ریسپنڈنٹ کی ہدایات کے مطابق مطلوبہ مقام تک پہنچ گئی۔ اسے انتظار کرتے بمشکل پندرہ منٹ ہی گزرے تھے جس وقت اسود روم میں داخل ہوا۔ دروازے کے سامنے والی دیوار پر لگا کیلنڈر دیکھتے ہوئے وہ جملے ترتیب دے رہی تھی جو اس نے اسود کے سامنے ادا کرنے تھے۔ وہ یہاں بنا کسی گھبراہٹ کے آئی تھی مگر یہاں آ کر بے حد گھبراہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

تھی۔ وہ آہٹ پر چلتی تھی اور اسود کو دیکھ کر تمام تر جملے اور الفاظ اڑ پھو ہو گئے تھے۔ اسود اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا مگر اس کے چہرے پر ابھرنے والا یہ تاثر بس پل بھر کو رکھا۔ اس کے بعد وہاں سنجیدگی و وحشی آ گئی تھی۔

بعد وہاں بنجیدگی و درختیں آگئی تھیں۔
 ”کیوں تشریف لائی ہیں آپ یہاں؟ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں آوارہ ہوں لہذا ہوں
 لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہوں اور جو لڑکیوں کا پیچھا کر سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے، سب کچھ“ مزے پیچھے

ہالوں کی چیز کے قریب جا کر ہاتھ میں پکڑا اٹھو سکوپ رکھتے ہوئے اس نے جس طرح سے فارحہ کو دیکھا تھا اور جس طرح سے اپنے آخری دو لفظوں پر زور دیا تھا وہ اسے مزید شرمندہ کرنے کے لیے کافی

”ہم آپ سے ایک سکہ ذکر کرنے آئی ہوں اسود۔“ سارے ترتیب وار لفظ کہیں کھو گئے اس کے لبوں پر۔

”اچھا جی... مہربانی جلدی جلدی ایکسکوز کیجئے اور یہاں سے تشریف لے جائیے آپ کو تو ہوتا ہے کتابدار انسان ہوں میں۔ پھر آپ تنہا ہیں اور خوب صورت بھی کچھ نقصان ہو گیا تو ساری زندگی ہاتھ ہی تیر جائیں گی۔“

یہاں کی طرف دیکھے انہائی لائق سے کہتا وہ فائل کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ فارحہ نے اپنا شرمندگی سے منہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے خفایں۔ ٹھیک ہے میں آپ کی ناراضی ڈیز رو کرتی ہوں مگر..... مگر ہم سب کی اپنی چیزیں ہیں۔ بہت مسرت ہو گیا تھا آپ کے ساتھ۔“

”وہیں کھڑی سوچ سوچ کر شرمندہ سے لہجے میں بول رہی تھی۔ اسود نے فائل سے نظریں ہٹا کر سے دیکھا۔“

”ہو گیا ایکسکیز؟..... اب جائیے۔“ اس نے واپس نظریں فائل پر گاڑ دیں۔ فارحہ مزید نچل ہو گئی وہ اٹھنے لگانے والی کرسی تک آن رکھی تھی۔

”میں شرمندہ ہوں اسود!“ وہ رو دینے کو تھی مگر اسود کو اس پر ترس نہیں آیا تھا۔

”اور علی..... میں تو سمجھا تھا کہ آپ صرف دوسروں کو شرمندہ کرنا جانتی ہیں۔“ اس نے بے حد فخریہ لہجے میں پڑائی تھی۔ اس کا لب و لہجہ انتہائی جلابھنا ہوا تھا۔ وہ خود کو اسود کے لیے گھر سے تیار کر کے لائی تھی مگر اس وقت اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسود کا مزید ایک فخریہ جملہ اسے رلا دے گا۔

”آج آپ جو بھی کہیں گے میں سن لوں گی کیونکہ غلطی بہر حال میری ہی تھی۔ اسی لیے میں آپ سے ایک کلمہ کر رہی ہوں۔ میں نے بہت غلط الفاظ استعمال کئے تھے آپ کے لیے۔“

”وہ الفاظ اتنے نامناسب بلکہ غلط تھے آپ کو مجھ سے ایک سکینوز کرتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔“

”الحق“۔ مجھے بہت شرم آ رہی ہے ابھی بھی اور اگر شرم نہ آ رہی ہوتی تو میں دو روز پہلے ہی آپ سے ایکسکوز لیتی۔“

اسود نے جھٹکے سے فائل بند کر دی تھی اور میز پر کہنی کا سہارا لے کر دو انگلیوں سے پیشانی مسلنے لگا تھا۔
فارحہ کو اس کی خاموشی غیبت لگی وہ جلدی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ جتنا چاہے مجھے برا بھلا کہہ لیں جتنا چاہی ڈانٹ لیں مگر مجھے معاف کر دیں۔“

اس کے اس قدر التجائیہ انداز میں کہنے کے باوجود بھی اسود کے چہرے کے کھنچاؤ میں کی واقع نہیں ہوئی۔

”آپ میری پوزیشن کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس روز میں نے جو کچھ بھی کہا وہ غیر ارادی طور پر کہا تھا آپ ایک ڈاکٹر ہیں اسود! کسی انسان کو تڑپے دیکھنا اور پھر اس کی موت کی خبر سننا آپ کے لیے معمول کی بات ہو سکتی ہے مگر میرے لیے یہ ایک معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے اس بچے کی آنکھوں میں زندگی کے لیے حسرت دیکھی تھی۔ ہاتھ اٹھا کر رحم کی بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ زندگی کی خواہش کیا ہوتی ہے؟ زندگی کی چاہ کے کہتے ہیں؟ یہ سب باتیں میں نے بس اسی پل میں جانی تھیں۔ وہ بچہ کس قدر چھوٹا تھا ابھی تو اس نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا تھا، دنیا سے اپنا حصہ وصول کرنا تھا لیکن چند لوگوں کی غلطی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا ٹھیک ہے شاید اللہ نے اسے اتنی ہی زندگی دی تھی۔“ اس نے دکھ اور مایوسی سے کہا تھا۔ ”مگر میں کیا کرتی مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی بات آ سکتی تھی کہ آپ لوگوں کی وجہ سے..... پھر مجھے لگا تھا کہ جیسے وہ طلحہ ہے..... بس اس لیے میں.....“ دکھ کی کیفیت میں بولتی وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔ اپنی بات کا رد عمل جاننے کے لیے اس نے اسود کی جانب دیکھا تھا۔ اس کا انداز ہنود پر قرار تھا البتہ پیشانی سے ہاتھ ہٹائے وہ ترجمی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نظر ملتے ہی اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

فارحہ کو مایوسی ہوئی۔ اسود کے چہرے پر خنکی تھی نہ درشتی، طنز نہ اجنبیت اس کا چہرہ قطعی طور پر پناہ تھا فارحہ کوئی اندازہ نہ لگا سکی تو مایوسی ہو گئی۔

”آپ مجھے معاف نہیں کرنا چاہتے؟“ اٹھنے سے قبل اس نے آس وراش کی کیفیت میں ایک آخری سوال کیا تھا اور اب کی بار اسود نے اپنی ریوا لونگ چیئر کا رخ سیدھا کر کے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔

”طلحہ کون ہے؟“

فارحہ کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ اپنی بات میں اس کا حوالہ دے چکی تھی۔ وہ جوتھنے کا سوچ رہی تھی غلطی ہی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے گردن نہیں اٹھائی تھی بلکہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دھنسی رہی تھی۔

”طلحہ ہے نہیں۔“ اس نے بوجھل سی آواز میں توقف کیا ”وہ تھا۔“

”مطلب۔“

”بھائی تھا وہ میرا..... جڑواں بھائی۔“ اس نے آنسوؤں کے گولے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔

”سات سال کی عمر میں وہ بھی ایک ایسے ہی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔“
ہم دونوں آئیں کریم کھانے جا رہے تھے..... روڈ کراس کرتے ہوئے..... پتا نہیں کہاں سے ایک بانگ اور..... اس کا سانس اٹکنے لگا تھا۔ آنسوؤں کے جس ریلے کو وہ روکنے کی سعی کر رہی تھی وہ موقع ملتے ہی برپا تھا اور وہ جو ہاتھل سے نکلنے کے بعد یہاں آتے تک دل میں مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ رونا نہیں ہے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے بے ساختہ رو دی تھی۔ آنسو روک لینا آنسو چھپا لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اور وہ تو اپنے ہر جذبے کے معاملے میں ابھی ناپختہ تھی۔ خوش ہوتی تو تفتی دیر تک ہنستی رہتی غصہ آتا تو بے درغلی اس کا اظہار کر دیتی پھر غم تو بڑوں بڑوں کو لا دیتا ہے۔

”میرا بھائی میری آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں واپس گھر نہیں جا سکتی تھی اور وہاں کوئی ہماری مدد کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اس بچے کو تڑپا دیکھ کر میں سمجھی کہ وہ طلحہ ہے اور وہ طلحہ ہی تھا میرا بھائی نہ سہی تو کسی اور کا..... میں پھر سے سات سالہ فارحہ بن گئی تھی جس کی چیخنی آواز کوئی نہیں سن رہا تھا۔ میں ایک اور طلحہ کو مرتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر.....“ وہ پھر سے رونے لگی تھی کافی دیر بعد اس نے چہرہ اپنی انگلیوں سے رگڑ کر صاف کرنا چاہا۔ اس کا سارا چہرہ بھیک چکا تھا تبھی اسود نے اس کے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی تھی۔

”ایم سوری! مجھے تم سے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔“ اس کی جانب ٹشو پیپر بڑھاتے ہوئے اس نے ٹرندگی سے کہا تھا۔ فارحہ نے جلدی سے ٹشو پیپر پکڑ لیا۔

”اگر آپ مجھ سے یہ نہیں پوچھتے تو میرے اس دن کے روپے کو بھی نہ سمجھ پاتے اور پھر آپ یہی سوچتے کہ میں کس قدر بدتمیز لڑکی ہوں۔“

”نہیں یہ تو خیر میں پہلے سے ہی جانتا ہوں کہ تم کتنی بدتمیز ہو۔“ فارحہ نے بال کان کے پیچھے اڑتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ ہلکے پھلکے سے انداز میں کہہ رہا تھا وہ پھلکی سی مسکراہٹ مسکرا دی۔ اسے اسود کی یہ بات آج ہی نہیں لگی تھی بلکہ آج اسے اسود کی کوئی بات بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔

”میں آپ سے ایکسکیوز کر رہی ہوں۔“

”ایکسکیوز تو مجھے بھی تم سے کرنا چاہیے میں نے بھی تو تمہیں کافی برا بھلا کہا تھا۔“ وہ رائے لینے والے انداز میں اس کی جانب دیکھ کر بولا تھا۔ فارحہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگی۔

”وہ آپ کا حق بننا تھا کسی نے اتنا سب کچھ مجھے کہا ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتی۔“

اسود کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”تمہیں پتا ہے فارحہ! تمہارا مسئلہ کیا ہے۔“ نشو پیمبر کا ڈبہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے دریافت کیا۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی کچھ نمی باقی تھی فارحہ نے استہمایہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

”تم حد سے زیادہ جذباتی ہو۔“

”ہاں ہوں..... میں بہت زیادہ جذباتی ہوں مگر اپنی اس جذباتیت کو میں ختم نہیں کر سکتی۔ یہ میری فطرت کا حصہ ہے۔“ اس نے بغیر کسی شرمندگی کے اپنی اس کمزوری کا اعتراف کر لیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ قطعی طور پر بھول گئی تھی کہ دور و قبل تک وہ اس شخص کے لیے اپنے دل میں بے حد نفرت محسوس کر رہی تھی۔

اسود نے کچھ بھی کہنے اور اس کی بات پر تبصرہ کرنے کی بجائے انٹرکام اٹھالیا تھا۔

”تم کیا لوگی چائے، کافی یا کچھ اور منگواؤں تمہارے لیے۔“ فارحہ نے بے حد حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا انداز بڑا ہی دوستانہ تھا۔ وہ اس سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے فارحہ یہاں کچھ کھانے پینے کی غرض سے ہی آئی ہے۔“

”میں تو سافٹ ڈریک لوں گا دراصل چائے یا کافی مجھے پسند نہیں ہے..... اوکے میں تمہارے لیے بھی سافٹ ڈریک منگوا لیتا ہوں۔“ اسے خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا اور اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے مین پیش کرنے کو تھا کہ فارحہ نے ٹوک دیا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا؟“ اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا تھا جو اب اسود نے ریسورڈ کان سے ہٹا کر اسے خشکی سے گھورا۔

”اب کیا معافی، معافی کی گردان کر کے تم مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو۔“

”نہیں یہ مطلب نہیں تھا میرا۔“ وہ یکدم گڑبڑا سی گئی۔

”پھر کیا مطلب تھا۔“ اس کا انداز ہنوز تھا۔

”آپ کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے تو میری شرمندگی بھی ختم ہو جائے گی۔“

”میرے کہہ دینے سے تمہاری شرمندگی ختم ہو جائے گی۔“ اسود نے ریسورڈ ہاتھ میں تھامے کر ہی کی بیک سے کمر ٹکا تو ہوئے پوچھا۔ فارحہ نے اثبات میں گردن ہلا دی تو وہ بڑی بے ساختگی سے بولا۔

”کر دیا ہے میں نے تمہیں معاف..... اب کہو تو اسٹامپ پیپر پر بھی لکھ دوں تاکہ تمہاری تسلی بھی ہو جائے۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔ دل سے ایک ہماری بوج

سر کا تو لبوں پر مسکراہٹ خود بخود دیکھ رہی تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا چھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ اسود بھی مسکرا ہوا تھا۔

پراس نے یکدم ہاتھ میں پکوار ریسورڈ لہرایا تھا۔

”اب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں سافٹ ڈریک کا آرڈر دے دوں۔“ وہ مجسم و شریہ سا استفسار کر رہا تھا فارحہ مسکرا کر نفی میں گردن ہلاتی کھڑی ہو گئی۔

”مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔“

اسود نے چند لمحوں کو سوچا تھا پھر ریسورڈ رکھ دیا تھا۔

”کیسے جاؤ گی تم؟ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تا ہوا بولا تھا۔

”میرے پاس میری گاڑی ہے۔“ اسود نے سر ہلا دیا وہ اسے چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ گاڑی کا کالا کوئلے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے معاف کر کے آپ نے میرے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔ اس بچے کی موت کا غم ایک طرف مگر آپ سے اور ڈاکٹر عبداللہ سے اس قدر بدتمیزی کرنے کے بعد میں بہت گھٹی ٹیل کر رہی تھی..... مجھے معاف کرنے کے لیے شکر یہ اسود۔“ اس نے بہت تشکرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جبکہ وہ لا پرواہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”اور میرے ساتھ یہاں تک آنے کے لیے بھی شکر یہ۔“ اس نے پھر کہا تو گویا وہ جھنجھلا گیا۔

”تمہیں جتنے شکر یہ ادا کرنے ہیں وہ سب ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زبان کو بار بار زحمت کرنی پڑے۔“ فارحہ اس کے کیلئے انداز پر یکدم مسکرا دی۔

”غیر آپ اتنے بھی اچھے کام نہیں کرتے کہ میں بار بار شکر یہ ادا کرتی رہوں۔“ وہ صاف اسے ہڑائی تھی۔ ”لیکن بہر حال اس سافٹ ڈریک کے لیے شکر یہ جس کی آفر ابھی آپ نے کی تھی۔“ ایک ہاتھ کا رکے کھلے دروازے پر رکھے دوسرے ہاتھ کا شدید سا آنکھوں پر رکھے وہ اسے شرارت سے دیکھ رہی تھی تیزی سے غریب کی طرف پیش قدمی کرتے سورج کی چمکیلی زرد کرنیں امتلا س کے چھدرے چوں سے نکل کر اس کے وجود کا حاطہ کر رہی تھیں۔

”اور آپ کا اس آفر کو رد کر دینے کا شکر یہ۔“ وہ بولا تھا۔ ”ویسے میرا خیال ہے اگر تم اس آفر کو قبول کر لیتیں تو ہماری یہ ملاقات ایک اچھی دوستی کی شروعات ہو سکتی تھیں۔“

پینٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر بازو سینے پر باندھتے ہوئے وہ تائید طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نجانے ہوا چلی تھی یا کسی پیچھے نے اڑاں بھری تھی بہر حال امتلا س کے چوں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ پتے بٹے تو ٹھیک کر نہیں اس کی آنکھوں میں حسرت چلی گئیں۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے زور سے آنکھیں بھیجنے لیں۔

بند پلوں کے سامنے گھر سے سیاہ پھنورے جیسی آنکھیں امید کے دیے کی مانند روشن ہو گئی تھیں۔ اس نے گھر آکر آنکھیں کھولیں سامنے اسود ابراہیم ویسے ہی دیے اپنی آنکھوں میں جلانے اسے دیکھ رہا تھا۔

فارحہ نے سر جھٹکتے ہوئے اس احتمالہ بات سے پیچھا چھڑوایا اور پرس سے نکال کر ننگا سر آٹکھوں پر چڑھا لیا۔

”سافٹ ڈرنک کی آفر قبول نہ کرنے کے باوجود میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہماری یہ ملاقات ایک اچھی دوستی کی شروعات ہے۔“ اسود خیر گالی کے انداز سے مسکرا دیا۔ دیے کی لو پوری شدت سے چمکی تھی مگر فارحہ کو اپنے دماغ کا فتور لگا۔ سو ایک بار پھر سر جھٹک دیا اسود کو خدا حافظ کہہ کر وہ کار میں بیٹھ گئی۔ اسود واپس جانے کی بجائے وہیں کھڑا اس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد کھڑکی سے منہ نکالا تھا۔

”اور وہ سافٹ ڈرنک ڈیور ہا۔“ مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ وہ اسے خبردار کر رہی تھی۔ وہ اس کی بات کھل کر مسکراتا ایک ہاتھ سینے پر رکھے ذرا سا جھکا تھا۔

”اٹس مائی پلیوریم۔“

فارحہ نے ہنسنے ہوئی گاڑی بیک کی تھی۔

+

یکے بعد دیگرے ہونے والی ان ملاقاتوں کے بعد ان کی اگلی ملاقات خاصے توقف سے ہوئی تھی اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں سے کم وہ اسود کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

پروفیسر زکریا کی کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اپنے فرینڈز کے ساتھ ڈپارٹمنٹ کی بیڑھیوں میں بیٹھ آتے جاتے لوگوں پر شا کے بے ساختہ تبصروں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یونہی لاشعوری طور پر گردن گھماتے ہوئے اس کی نظر نے جس شخص کو دیکھا اس پر اسے اسود ابراہیم کا گمان گزرا تھا اس نے تصدیق کی غرض سے دوبارہ دیکھا مگر اب اس کی پشت فارحہ کی جانب تھی۔

”اسود! یہاں کیوں آئے گا جرنلزم ڈپارٹمنٹ میں بھلا اس کا کیا کام۔“ وہ ابھی سر بھی جھٹک نہ پائی تھی کہ حجاب کی بات نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

چند منٹوں بعد جب وہ کسی بات پر بے ساختگی سے تہقہ لگا رہی تھی تب کسی نے اسے پکارا۔ انا آواز کو وہ بخوبی پہچان سکتی تھی۔ اپنی کچھ دیر پہلے والی حیرانی کو نظر انداز کرتی وہ کھڑی ہو کر اس کی جانب آئی تھی اسود کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی اور چونکہ وہ اس سے ناواقف تھی تبھی تمام تر توجہ اسود پر مرکوز رہی۔

”آپ یہاں کیسے؟“ رسی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تو جواب دینے کی بجائے اپنے ساتھ کھڑی لڑکی سی اس کا تعارف کروانے لگا تھا۔ الوینہ ابہتاج اسود کی کزن تھی اور ذکریا یونیورسٹی سے مائیکریٹ ہو کر آئی تھی اور بقول اسود چونکہ وہ یہاں کسی سے بھی واقف نہیں تھی اس لیے تھا ڈپارٹمنٹ آنے

ہوئے گھبراہٹ تھی۔ اسود اسے یہاں ڈراپ کرنے آیا تھا اور اس کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے اسے بے گھبراہٹ کی اندر تک چھوڑنے آ گیا تھا۔

ڈپارٹمنٹ کے اندر تک چھوڑنے آ گیا تھا۔

”جھوٹ بولنے میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے اسود! میں نے تو تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے بلکہ تم نے خود ہی گھبراہٹ گھبراہٹ کے نعرے لگانے شروع کر دیے تھے۔ اب مان لو کہ تمہارا اپنا دل میرے ساتھ یہاں تک آنے کو چاہ رہا تھا۔“

الوینہ کے جارحانہ انداز میں کہنے پر اسود ہنسنے لگا تھا۔ الوینہ بھی مسکرا رہی تھی بس فارحہ ہی نہیں مسکرا سکی۔ اسے ان دونوں کے درمیان ایک مانوس سارشیہ محسوس ہوا تھا اور نجانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی نظریں الوینہ کے گالوں پر بھٹک رہی تھی جن میں ہنسنے کے باعث دو گڑھے بے حد نمایاں ہوئے تھے۔

وہ خوب صورت تھی مگر مسکراتے ہوئی آنکھوں میں شرارت سموئے بہت خوب صورت لگنے لگی تھی۔

ارد کا پنا آپ ان دونوں کے درمیان بڑا غیر ضروری سا لگا۔ ابھی وہ اپنی اس نامانوس سی کیفیت پر قابو ہی پا رہی تھی کہ اسود نے پھر اسے مخاطب کر لیا۔

”دراصل اس ڈپارٹمنٹ میں میں تمہیں ہی جانتا تھا۔ سوچا کیوں نا الوینہ کو تم سے ملوا دوں۔ آئی ہو پنا کی گھبراہٹ اور اجنبیت ختم کرنے میں تم اس کی کچھ مدد کرو گی۔“ وہ دیکھ اسے رہا تھا جبکہ چڑا الوینہ کو رہا نا۔

”شیو رائے ناٹ۔“ اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے یہ ذمہ داری قبول کر لی مگر ساتھ ہی اس کے ذہن میں کئی کے کوندے کی طرح ایک سوال ابھرا تھا۔ اس نے کبھی اسود کو اپنے ڈپارٹمنٹ کے متعلق نہیں بتایا تھا کبھی اتنی تفصیلی گفتگو کا موقع ہی نہیں آیا۔

”اچھا تو پھر میں چلتا ہوں تمہیں واپسی پر ڈرائیور پک کرے گا۔“ وہ الوینہ سے کہہ کر فارحہ سے مخاطب ہوا تھا۔

”اس کا خیال رکھنا کہیں گم و م ہو گئی تو ساری ذمہ داری تمہاری ہی ہو گی۔“ وہ چڑا تا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”اس نے تو مجھے بالکل ہی بچی سمجھ لیا ہے۔“ مسکراتے ہوئے وہ فارحہ کی جانب مڑی تھی اور خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔

”تعارف تو تمہارا ہو چکا اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”میں پہلے تمہیں اپنی فرینڈز سے ملواتی ہوں۔“ الوینہ جب بے تکلف ہو رہی تھی تو اسے بھی زیادہ اہمیت نہ دینا چاہی۔

”ابہتاج کہ مناسب نہیں لگا۔ حجاب وغیرہ تو نجانے کہاں غائب ہوئی تھیں۔ وہ اسے لیے کینٹین میں آ

”میں تو اس لیے انکار کر رہی تھی کہ حسین بھائی کو برا لگے گا۔“

”کیوں؟“

”انہوں نے ذن کا پروگرام اس لیے رکھا ہو گا تاکہ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار سکیں۔“

”تم اور تمہاری عقل کی پرواز۔“ تحریم اکتاہی تو گئی تھی۔

”حسین نے مجھ سے خود تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے کہا ہے پھر اسود بھی تو ہو گا۔“

”گو یا اس کباب میں تنہا میں ہڈی نہیں ہوں گی۔“ اس نے محظوظ ہوتے ہوئے ٹکڑا لگایا تھا اور یہی جب اس نے حسین اور اسود کے سامنے کبھی تھی تو اسود جھپٹ کر ہنسا تھا جبکہ حسین کا قبضہ زبردست تھا۔ اور چونکہ ذن حسین کی طرف سے تھا اس لیے وہ انہیں اپنی پسند سے آواری لے آیا تھا۔ چار افراد کے پانچ پیلے سے ریزہ تھا۔

”یار اسود! تمہیں نہیں لگتا ہمیں بھی بریانی آرڈر کرنی چاہیے تھی؟“ ویر کے کھانا سرو کر کے جانے کے بعد حسین نے کچھ سوچتے ہوئے سے انداز میں اسود سے پوچھا تھا۔

اسود نے حیرانی سے سر اٹھا کر حسین کو دیکھا وہ بخوبی واقف تھا کہ اسے بریانی سے کبھی بھی اتنی رغبت نہیں رہی۔ مگر چند لمحوں کے توقف سے حسین کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے اسے ساری بات سمجھ گئی تھی۔ ساتھ والی میز پر موجود جوڑے کے سامنے رکھی بریانی کی ڈش دیکھتے ہوئے وہ بڑی بے ساختگی سے مگر اچھا ساتھ ہی تحریم پر بھی ایک نگاہ ڈالی تھی۔ وہ بڑی شد و مد سے فارحہ کو اپنے نئے سندھی اور بلوچی لڑکائی والے کپڑوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”بھئی دور کی نظر ذرا کمزور ہے حسین..... اس لیے بریانی کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ البتہ اتنا مجھے یقین ہے کہ یہ بریانی تھوڑی spicy ہے تم یوں کرو یہ اسپیکٹیز ٹرائی کرو اس کا میٹ بھائی سے بھی زیادہ اچھا ہے۔“ اسٹیکس کی مدد سے اسپیکٹیز کھاتے ہوئے اس نے بھی حسین کے سے انداز میں ذمہ داری کی۔ ساتھ ہی اسپیکٹیز کی ڈش اس کی طرف بڑھادی۔ حسین نے اپنی پلیٹ میں اسپیکٹیز ڈالتے ہوئے حسرت بھری نگاہ ساتھ والی میز پر ڈالی تھی۔

”اسپیکٹیز کی تو خیر کیا بات ہے۔ لیکن بریانی.....“

”بریانی کھول جاؤ بیٹا! اسپیکٹیز کو تمہاری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔“ اس نے چڑانے والے انداز میں کہا اور اس تمام گفتگو کے دوران فارحہ پہلی بار چوکی تھی۔ اس نے ان دونوں کی تقلید میں اس طرف دیکھا تو وہاں بات کرتے ہوئے وہ دونوں وقتاً فوقتاً دیکھ رہے تھے۔

”میں بھول سکتا میں بریانی کو۔“ حسین نے بیجا رنگی سے کہا۔ ”دیکھ نہیں رہے اس کی آؤٹ لک ہی تھی ابھی ہے۔“ فارحہ نے اس میز پر موجود بریانی کی ڈش کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے وہاں بیٹھی

گئی اور الوینہ کو وہ اپنے بارے میں کیا بتائی۔ الوینہ نے اسے ایسا کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا وہ جلدی بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی۔ سننے سے زیادہ بولنے سے شغف رکھتی تھی یہی دونوں ”خصوصیات“ تھیں جن کی شخصیت کا حصہ تھیں مگر اسے پہلی بار اپنی دوسری خصوصیت کے مضراثرات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ سوچنے پر مجبور ہی تو ہو گئی۔ یقیناً جب وہ مسلسل بولتی ہوگی تو سامنے والے کے دل میں ویسی ہی فیکٹور ہوتی ہوں گی جیسی کہ اس وقت اس کے دل میں تھیں۔ اسے الوینہ سے الجھن ہی ہونے لگی وہ اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ مجبوراً اسے صرف سننا پڑا اچھی خاصی بد مزہ ہو گئی تھی وہ مگر ایسا بھی کچھ دیر کے لیے ذرا دیر سے ہی مگر وہ الوینہ کی باتوں پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ اس کی گفتگو خاصی دلچسپ تھی۔

”پہلے میرا ارادہ بھی ہاسٹل میں رہنے کا تھا مگر کافیہ آئی مجھے اپنے یہاں رہنے کے لیے کہہ رہی تھی پھر اسود نے بھی فورس کیا تو میں مان گئی۔ چند ایک روز میں میرے گھر والے بھی آ جائیں گے تو میں اپنے کمرے کی شفٹ ہو جاؤں گی۔ ویسے تم اسود کو کب سے جانتی ہو؟“

بہت تفصیل سے بتانے کے بعد اس نے پوچھا تو کوک کا سپ لیتے ہوئے وہ اپنی اور اسود کی ہلکی ملاقات یاد کر کے مسکرا دی۔

”زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا.....“

اسی وقت ثنا، قانتا اور حجاب آگئیں تو سوال خود بخود نظر انداز ہو گیا۔ وہ اسے ان سب سے مخالف کروانے لگی تھی۔

+

تحریم کی سالگرہ تھی۔ حسین اس موقع کو بہت اچھے طریقے سے سلیمینٹ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے ذن کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ تحریم نے فون پر اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی مگر اس نے انکار دیا۔

”میں کیا کروں گی تم لوگوں کے ساتھ جا کر؟“ تحریم کے مسلسل اصرار پر اس نے جھجھکا کر کہا۔

”ہم کھانا کھانے باہر جا رہے ہیں ظاہر ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ جا کر کھانا کھاؤ گی۔“

”تحریم پلیز نا۔“ اسے سمجھ نہ آیا کہ تحریم کو کیسے انکار کرے۔ ”یار! مجھے کباب میں ہڈی بنا کر لے“

ضروری ہے کیا؟“

”شٹ اپ فری! مجھے پتا تھا کہ تم یہی بات کرو گی۔“ اس نے ڈپٹ کر کہا۔

”بہت خوب! جب پتا تھا تو دعوت کیوں دی تھی۔“ وہ جیسے محظوظ ہوئی ہوئی بولی تھی۔

”میرا دماغ خراب ہو گیا تھا بس اسی لیے۔“ وہ جل کر گویا ہوئی فارحہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔

سرخ لباس اور مناسب سے میک اپ میں اس لڑکی کو پھر یکدم مشکوک سے انداز میں اسود اور پھر حیرت دیکھا تھا۔

”آپ لوگ بریانی کی تعریف کر رہے ہیں؟“ اس کا انداز استعجابیہ سا تھا۔ اسود نے قہرے ماسکراہٹ کو چھپانے کی بجائے خود بھی سوالیہ نظریں حسین پر گاڑ دیں۔

”اور نہیں تو کیا..... ہم لوگ بریانی کی ہی تعریف کر رہے ہیں تم خود دیکھ لو دور سے دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے کہ بریانی کتنی اچھی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا کہ فارحہ شش و شش میں جھلا ہو گئی۔

”ہاں فری! یہ لوگ بریانی کی تعریف ہی کر رہے ہیں۔“ تحریم نے پہلی بار ہنسنے میں دخل دیا تھا، نہایت وثوق سے کہہ رہی تھی۔

”مجھے بھی دور سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ بریانی کتنی اچھی ہے لیکن ایک بات ہے مجھے تو اس قدر مزہ زیادہ پسند آیا ہے۔ ذرا دیکھنا تو فری! ہمارا بروٹ اس ڈارک براؤن تورے سے آگے کتنا لگ رہا ہے۔“ اس کا انداز حسین سے کچھ مختلف نہ تھا۔ وہ بیچارگی سے کہہ رہی تھی اور انفس سے راتو میز پر بیٹھے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی جو ان لوگوں کی باتوں سے بے نیاز اپنی ساتھی سے معروف کشت حسین نے تحریم کی بات پر محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا تھا۔ اسود اور فارحہ نے اس کا ساتھ دیا تھا جبکہ تحریم برابر کر کے اطمینان سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گئی تھی۔

انہوں نے کھانا اسی خوشگوار ماحول میں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد حسین اور تحریم کافی بیٹھا چاہے اسود نے انکار کر دیا۔ فارحہ کو بھی کوئی ایسی خواہش نہیں تھی کیونکہ اگر ابھی کافی پی لیتی تو ساری رات جاگ گزرنی پڑتی اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

”اس ہوٹل کے ہال میں کیلی گرافی کی بڑی اچھی نمائش لگی ہے میں کافی دن سے سوچ رہا تھا، آنے کا مگر فرصت نہیں مل سکی اب آئی گیا ہوں تو کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔“ انہماک سے کھڑے ہوتے ہوئے اسود نے کہا پھر یکدم ہی اسے ابھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔

”تم یہاں بیٹھ کر کیا کرو گی جب تک یہ لوگ کافی پیٹے ہیں ہم دونوں الگ-الگ بیٹھ کر آتے ہیں اس نے اتنا اچانک فارحہ کو مخاطب کیا تھا اور وہ جو انکار کرنے کا سوچ رہی تھی خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ حسین اور تحریم کو کچھ وقت دینا چاہتی تھی اور اسے ایسا لگا تھا کہ اسود نے بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا جس کی بنا کسی تعرض سے اس کے ساتھ آگئی تھی۔

”تو آپ کو کیلی گرافی میں بہت انٹرسٹ ہے؟“ مختلف نمونوں کو سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے نے بڑے شرارتی سے انداز میں دریافت کیا تھا۔

”ہاں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں لبوں پر ہاتھ رکھے بے ساختگی سے ہنسنے لگی تھی۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جواب کیا کیا جائے؟“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی۔“ اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

Happy Valentine اور اندرا سودا براہیم کا نام بہت نمایاں تھا۔

یہ کی گنجائش تو اب جیسے بچی ہی نہیں تھی۔ سائینڈیکل پر پڑے سرخ گلابوں کے خوب صورت سے

لہجے کی مہک اپنے اندر منتقل کر کے وہ بڑے آسودہ انداز میں میسز پر لیٹ گئی تھی۔

رہنے کی مہک اپنے اندر منتقل کر کے لیے بہت کچھ تھا۔ چودہ فروری اس کے لیے ہمیشہ بہت عام سادہ رہا تھا اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

بے بسی میں اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسودا براہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ

”اچھا..... لیکن اسودو جانتا تھا کہ میں ملتان گئی ہوئی ہوں۔“

”شاید بھول گیا ہوگا۔“ اس نے خود ہی کہہ دیا مگر فارحہ چونک گئی تھی اور حقیقتاً سارکت پانی میں بھڑک

تھا۔ وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ”اگر اسودا اس بات سے باخبر تھا کہ الوینہ ملتان گئی ہوئی ہے تو پھر

وہ ڈپارٹمنٹ کیوں آیا تھا؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

اور جب اس نے الوینہ کی عدم موجودگی کے متعلق اسے بتایا تھا تو وہ حیران ہوا تھا اور نہ ہی باپوی نے

اسے گھبراہٹا۔ ”کیوں؟ ایسا کیوں ہوا تھا؟“

کیا وہ الوینہ سے ملنے نہیں آیا تھا؟ حالانکہ اس نے خود کہا تھا کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا سو چاکین

نہ الوینہ سے ملتا جاؤں۔ وہ سوچتی گئی اور خود سے سوال بھی کرتی گئی اور سوال در سوال کے اس سلسلے نے

بہت سی کنجیاں کھول دی تھیں۔ وہ خود بخود مسکراتے لگی چند روز بعد اسود پھر ڈپارٹمنٹ آیا اس وقت الوینہ

یونیورسٹی میں لائبریری گئی ہوئی تھی۔

”آج بھی آپ الوینہ سے ملنے آئے ہوں گے۔“ اسود کو اپنے سامنے پا کر وہ شرارت سے کہے گا

نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے خبر تھی کہ اسود اس کے متبسم انداز پر کسی قدر حیران ہوا ہے۔

”نہیں..... آج تو میں تم سے ملنے آیا ہوں۔“ اب حیران ہونے کی باری فارحہ کی تھی۔

”تحریم کی ایم میل آئی تھی میں اسی کامیج تمہیں دینے آیا تھا۔“

اور اس کے بعد یہ دیکھے بغیر کہ سامنے والا شخص اس کے یوں بے ساختہ ہنسنے پر حیرانی و تشویش میں مبتلا

ہو رہا ہے وہ ہنستی چلی گئی تھی اور وہ جو ایک گمان تھا کہ اسود اس سے ملنے آتا ہے یقین میں بدلتا چلا گیا ہے

لگا کہ الوینہ تو بس ان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہی ہے۔ اسود جب بھی آتا ہے اپنے آنے کی وجہ الوینہ کو براہ

دیتا اور وہ ایک یقین بھری مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اس کی بات تسلیم کر لیتی۔

وہ اپنے اس نئے جذبے کو کسی کے ساتھ شیئر کرنا نہیں چاہتی تھی اور وہ ”کسی“ تحریم سے بڑھ کر کوئی

نہیں ہو سکتا تھا جبکہ تحریم اور حسین شادی کے بعد مستقل لندن مقیم ہو گئے تھے اور چونکہ فارحہ کے پاس اسٹر

میں کپیوٹر نہیں تھا اس لیے اسود کو موصول ہونے والی ای میل میں وہ فارحہ کے لیے بھی کوئی نہ کوئی پیغام

دیتی جنہیں اسود جوں کا توں اس تک پہنچا دیتا تو پھر جب رابطے بڑھے تو تعلق بھی بڑھتا چلا گیا۔

اس کی پسندیدگی محبت کی منازل عبور کرنے لگی تھی۔

+

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو کوئی چوتھی بار بہت دھیان سے دیکھا تھا جس کے

وہ واپس آئی تو ان لوگوں نے کتابیں کھولیں ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شا کے گھر سے فون آ گیا وہ چائے وہیں چھوڑا فون آتے ہی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

”تم آج ڈپارٹمنٹ کیوں نہیں آئیں؟“ شا کے جانے کے بعد الوینہ نے پوچھا۔ وہ ایک کتاب سے کچھ اہم پوائنٹس نقل کر رہی تھی جبکہ الوینہ ایک دوسری کتاب کے مفصل جائزے میں بھی مگن تھی فارحہ نے آنے کی وجہ بتائی تو وہ چائے کا ایک بڑا سا سب لیتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ صبح اسود بھی ڈپارٹمنٹ آیا تھا تمہارے بارے میں بھی پتہ نہ تھا۔“ ”اچھا۔“ فارحہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے اپنے لہجے کو حتی المقدور سرسری رکھا تھا۔ مہار کہ الوینہ چونک جائے۔ ساتھ ہی اس کی نگاہوں نے کونے والے میز پر رکھے پھولوں کا جائزہ لیا تھا۔

”پتا ہے فارحہ! اسود نے مجھے بہت پیارا سا گولڈ کا نیگلکس گفٹ کیا ہے۔ تم میرے گھر آؤ گی تب میں تمہیں دکھاؤں گی۔ دراصل وہ نیگلکس میں ابھی پہننا نہیں چاہتی شادی کے بعد ہی پہنوں گی بلکہ وہ نیگلکس ہی کیوں تم میرے گھر آؤ گی تو میں تمہیں وہ سارے گفٹس دکھاؤں گی جو اسود مجھے مختلف اہم موقعوں پر دیتا رہا ہے۔ پتا ہے صبح ہی صبح پہلے اس نے مجھے فون پر مبارک باد دی اور تھی ڈنر ساتھ کرنے کا وعدہ بھی لے لیا مگر پھر گیارہ بجے کے قریب ڈپارٹمنٹ چلا آیا تاکہ مجھے میرا وعدہ یاد دلادے۔“

”بہت دوستی ہے تم دونوں کی، اور مبارک کس خوشی میں دی اس نے تمہیں، کہیں سالگرہ تو نہیں ہے آج تمہاری؟ اگر ایسی بات ہے تو اچھی سی ٹریٹ تیار کر رکھو۔“ اس کی بات بہت دلچسپی سے سنتے ہوئے فارحہ نے کہا تھا جبکہ الوینہ نے اس کی بات سن کر ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی ننھے بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

”دوستی..... دوستی میں کوئی کسی کے لیے اتنا نہیں کرتا جتنا کہ اسود میرے لیے کرتا ہے اور جہاں تک سالگرہ کی بات ہے تو چودہ فروری کو ہر لڑکی کی سالگرہ ہوتی ہے۔“

”میں تمہاری بات سمجھی نہیں الوینہ۔“ اس نے بہت نارمل انداز میں دریافت کیا تھا۔ بلاشبہ الوینہ کی پہلی بات اسے چونکا گئی تھی۔ الوینہ نے کتاب ایک طرف رکھی تھی اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”ارے میری پیاری سی فرینڈ! اتنی بڑی ہو گئی ہو مگر تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ چودہ فروری کو کیا ہوتا ہے..... اسود مجھے ویلنٹائن ڈے وٹش کرنے آیا تھا۔ تہہ ڈے وٹش کرنے نہیں آیا تھا۔ پچھلے چار سالوں سے وہ یہی کرتا آ رہا ہے تو اب کیسے بھول جاتا بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں بھولتا میری ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اسے یاد رہتی ہے۔“ وہ خوشی خوشی اسے بتا رہی تھی۔

”اور جہاں تک ٹریٹ کی بات ہے وہ تو میں تمہیں ضرور دوں گی مگر تھوڑا سا انتظار کرو بس کچھ ہی دنوں

میری اور اسود کی شادی کی ڈیٹ فکس ہونے والی ہے تو پھر.....“

”ہاں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی اور یہ دیکھے بنا کہ فارحہ کے چہرے کے رنگ کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، وہنت نے انکشافات کرتی ہی جاری تھی۔ چار سال پہلے ان دونوں کی منگنی اسود کے رہ رہتی تھی اور عقرب ان کی شادی متوقع تھی۔ الوینہ کے گھر والوں کا مستقل لاہور شفٹ ہونا اسی بنا پر ایک کڑی تھی۔

”اسود میرے لیے بہت پوزیٹور ہا ہے شروع سے تم نے بھی نوٹ کی ہوگی یہ بات کہ کس طرح وہ مجھے ڈپارٹمنٹ آیا کرتا تھا ہفتے میں دو چکر تو لازمی تھے اس کے ہی از سو کیوٹ..... بالکل دیوانہ ہے وہ۔“ ”ہاں کی دیوانگی پر جیسے ہنسی تھی اور فارحہ کی حالت تو یوں تھی گویا کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔“

”تم نے بھی ذکر ہی نہیں کیا اس بارے میں۔“ اس کے لبوں سے مردہ سی آواز نکلی تھی۔ ”میں نہیں جانتی تھیں اس بارے میں؟“ الوینہ نے استغہامیہ نظروں سے اسے دیکھا اور فارحہ کو بے لپے چہرہ شامی کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ مگر الوینہ اس وقت صرف اپنے اور اسود کے ٹھوس تعلق کو بہذب سے پرت در پرت اس کے سامنے کھولتی جا رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اسود کو کافی گہرے دوست ہو تو اس نے تمہیں ضرور بتایا ہوگا۔“ الوینہ بہت عام سے انداز میں اپنی حیرانی کا اظہار کر رہی تھی جبکہ گلدان میں رکھے وہ سرخ گلاب اس کی آواز رہے تھے۔ وہ اچنبھے کی سی کیفیت میں پھولوں پر نظر ٹکائے الوینہ کو سن رہی تھی جو بہت یقین لہاتی تھی۔

اسود ایسا اہم دنیا کا وہ واحد شخص ہے جس کے متعلق میں پورے دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کی باتیں، میں سب سے اہم ہوں۔ ریٹلی فارحہ..... بہت چاہتا ہے اسود مجھے۔“

+

”میرا پرائیویٹ لیٹل جاور پرانگی سے آدمی ترجمی لکیریں کھینچ رہی تھی کمرے میں داخل ہوتی شانے غرات دیکھا پھر خاموشی سے الیکٹرک کیبل کا پلگ لگا دیا چائے تیار ہونے تک وہ خاموشی سے اپنے غنڈی کی تھی۔

”گمب کیا محسوس کر رہی ہو؟“ چائے کا گمب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شانے نے پوچھا۔ بال سمیٹنے شانے نے مثبت انداز میں سر ہلا دیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کی طبیعت گری گری سی تھی۔ اتنے ہی دن سے آٹھ ڈپارٹمنٹ جا پائی تھی مگر وہاں بھی عجیب سی بے کلمی نے گھیرے رکھا تو سر درد کا کہہ کر جلدی لے لیا تھا۔

”خیر! یقین کرو میں الوینہ یا اسود کی وجہ سے نہیں جا رہی بلکہ میں اپنے گھر بلوئی پار! میں ان لوگوں کو بہت کس کر رہی ہوں۔“

میں نے کہا ہے کہ اس اقدام نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے اور اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے بتاؤ کہ اس بات کو ممکن ہے الونین نے جھوٹ.....“

”جواب کیوں بولے گا؟“ اس نے بے اختیار اس کی بات قطع کی تھی۔

منسوب کر لیا اور کیا ہم لوگوں نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ واقعی کیسے اس کی خاطر ڈپارٹمنٹ آیا کرتا ہے۔ آواز اٹھنے لگی تھی مگر وہ بڑے ضبط سے بولتی گئی۔

ہمدرد اور دوست تھا اور میں اسے ایک اچھا انسان بھی سمجھتی تھی اس کے علاوہ میری اس کے ساتھ کوئی ناراضگی نہیں تھی مگر افسوس کہ اس نے مجھے تعریف کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ویلنٹائن ڈے پر

اے بھول بھولے تو بہر حال میں اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ضرور ہوتی تھی۔ وہ تو سوچ رہا ہے

ہمارے ہاتھ رہوں گی تو سب بھول جاؤں گی..... آئی پر اس جب میں واپس آؤں گی تو نہیں پہچنے

اور نورین کہیں ہی ملوں گی۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کا دل کتنا بے چین

وہاں کی جانب بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ پاؤں بستر سے لٹکائے سر جھکائے پاؤں کے

تو غصہ نہ کرنا۔ اس کے چہرے پر یہ انداز نہ لانا کہ اس کا دل کھٹک رہا ہے۔

میں نے بھی اس سے نصیحتا کرنا۔ جہت نہیں رکھتا۔ ایک آدمی ہمارے ساتھ دے گا۔ وہ سوسے

تو نہیں کیوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ فخر اُسا ہو سکتا ہے۔“

میں نے بھی یقین نہیں آتا کہ وہ شخص ایسا ہو سکتا ہے مجھے تو اس کی آنکھوں میں ہمیشہ افسوس آتا تھا۔ ان آنکھوں میں آنے والے پسندیدگی دکھائی دیتی تھی اور یہ دونوں باتیں ہی غلط نکلتیں۔

اپنے لیے گم میں جائے نکالشی ثنائے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر بے اختیار ہی اسے ٹوک بیٹھی۔
 ”جب درد سے ہی نہیں تو پھر بلا وجہ پین کلرز استعمال کرنے کا فائدہ۔“

فارحہ نے بتا کچھ کہے پر اس ایک طرف رکھا اور گ منہ سے لگالیا۔ ناچا جائے اور کس کا ذریعہ ہے۔
 کے بستر پر آ بیٹھی۔ فارحہ نے دو تین سب اندر اٹھ لیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ الماری کے اوپری کپڑے

سفری بیگ نکال کر باہر رکھا پھر ایک ایک کر کے مختلف سوٹ ترتیب سے رکھے گئے۔ ساتھ ساتھ دیگر ضرورت کی چیزیں بھی بستر پر ڈھیر کرتی گئی۔ شانے اس کے اس عمل کو قدرے تخیر سے دیکھا تھا وہ اپنے آپ میں

ابھی تک بھرتی جاری تھی۔
 ”کہیں جاری ہو فارغ؟“

”ہاں سیالکوٹ جا رہی ہوں۔“ اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ ”میں سب کھردلوں کو بہت مس کر رہی ہوں۔ طبیعت بھی شاید اسی لیے جو جھل رہتی ہے۔ کچھ دن سب کے ساتھ گزراؤں گی تو“

طبیعت سبھل جائے گی۔

چائے میں بھگو یا بسکٹ منہ تک لے جاتے ہوئے شانے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس کے الفاظ میں

سچائی کا عنصر تھا اس لرزہ کی ہی اس دن جب وہ نونہل کروا چلا سر سے یہیں اس کی اس بات پر جواب دیا تھا۔
 تھا۔ الوینہ کے جانے کے بعد فارحہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور وہ سب باتیں جو سات دن کی تھیں
 کے لئے اس نے اپنے لئے ایک نیا کمرہ بنوا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ سات دنوں میں اس نے فارحہ کو بھی لایا۔

[illegible]

”میرا خیال ہے کہ جانے سے پہلے تمہیں اسود سے بات کر لینی چاہیے۔“ شا کے اتنا کہنے پر بیک، جھک کر اسود کے پاس پہنچا۔

”کیا بات کرنی چاہیے مجھے اسود سے؟“

سوچتے ہوئے دیکھی سی آواز میں گویا ہوئی۔
 ”کسا جا الونہ نے جھوٹ بولا ہو۔“

کچھ کہنے کی غرض سے کھلے اس کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ بڑی بے بسی سے چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔
ہوئے انتہائی رقت سے اس نے خود کو مسکرانے پر مجبور کیا تھا۔

میں اس کے القات کو اپنی مرضی کا رنگ دیتی چلی گئی پتا نہیں سب لڑکیاں ہی ایسی ہوتی ہیں یا صرف میں ہی
احسن نکلی۔ تیاریاں کرتے ہوئے وہ مسلسل خود سے مخاطب رہی تھی پھر جب روائی سے قتل وہ ٹاکس آف
کروانے اور ڈپارٹمنٹ میں لیوا پلکیشن سے متعلق ہدایات دے رہی تھی تو ٹائٹا اپنے خدشے کا اظہار کیے جا
نہیں رہ سکی۔ اس کی بات سن کر وہ مسکرا دی تھی اور ٹائٹا کا ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔

”اسود ابراہیم میرے لیے اتنا اہم بھی نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر اپنا کیریئر تباہ کر لوں۔ تم یقین
رکھو میں واپس ضرور آؤں گی۔“ وہ ٹائٹا سے گھٹل کر کمرے سے باہر نکل گئی مگر اس تمام عرصہ میں ٹائٹا بار
ایسا ہوا تھا کہ کمرے کی دہلیز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ہاتھ میں پکڑا سفری بیگ اس نے دوسرے ہاتھ
میں منتقل کرتے دائیں طرف میز پر پڑے گلڈان کو دیکھا تھا سرخ گلابوں کا رنگ اڑ چکا تھا۔
”ٹائٹا پھولوں کو کوڑے دان میں پھینک دینا۔“ وہ دہلیز عبور کر گئی تھی مگر اس کی آواز کا کرب وہیں
کہیں رہ گیا تھا۔ ٹائٹا کے پاس۔

+

بارش کے بعد آسمان خاصا نکھر چکا تھا۔ ہوا میں روانی اور مردا کی مہک تھی۔ ذرا زور سے جھونکا ہوا تو
دریچے سے لپٹی نیل پر رکے قطرے نپاٹ پڑتے۔ ایک ایسا قطرہ اس کی پیشانی پر آ ٹھہرا تو وہ چونک سی
گئی۔

نیچے لان میں گھاس سے زیادہ بارش کا پانی رکا ہوا تھا۔ سامنے سڑک پر سفیدے کے درختوں کی
قطاریں تھیں تیز ہوا شاخوں سے ٹکراتی تو پتے تالیاں بجانے لگتے۔ ہوا کی سرسراہٹیں وہ یہاں تک سن رہی
تھیں۔

اس نے پیشانی سے قطرہ پونچھا اور سینے پر بازو باندھتے ہوئے نیلے آکاش کی گہرائیاں تلاشی لگی کتنا
وقت بیت چکا کتنا وقت بیت رہا تھا کتنے آرام و دوٹو سے اس نے ٹائٹا سے کہہ دیا تھا کہ جب واپس آئے گی
تو پہلے والی فارحہ بن کر اس سے ملے گی اور ٹائٹا کو ٹائٹا ایک طویل عرصہ ہوا وہ خود بھی اس پرانی والی فارحہ عزم
سے نہیں مل پاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس فارحہ عزم کو قطعی طور پر بھول ہی گئی تھی جس کے عزائم بہت بلند
تھے جو زندگی میں بہت آگے جانا جاتی تھی کچھ کر دکھانے اپنا نام منوالینے کی خواہش تھی جسے ہر دم متحرک رکھتی
تھی۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو وہ بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی البتہ زندگی کے ہر بل سے خوشیاں سمجھ کر
اس کا سن پسند کام تھا۔ باتیں تو عام ہی تھیں مگر یہی عام باتیں کچھ لوگوں کے لیے بہت خاص بن جاتی ہیں۔
”تم بہت بدل گئی ہو“ اسے یہ کامیٹنٹ اکثر ملنے لگا تو وہ بجائے حیران ہونے کے خودی مسکرا کر سر جھکایا
کر دیتی۔

بجائے کہ کوئی کسی ایک شخص کے لیے اتنا اہم ہو جائے کہ اس کی زندگی کا ہر عزم ہر خواب
ایک ہی شخص پر مرکوز ہو جائے۔ اس کی آپ بیتی نہ ہوتی تو یقینی طور پر وہ اس بات پر سختی سے سربلاد دیتی مگر
ایک ہی شخص کی تھی۔ حماقت ہی سہی مگر بہر حال وہ اس حماقت کی مرئیت ہو رہی تھی۔

دیکھا نہیں کر سکتی تھی۔ حماقت ہی سہی مگر بہر حال وہ اس حماقت کی مرئیت ہو رہی تھی۔
بائے کی فون آئے وہ اسے واپس آنے اور از سر نو پڑھائی شروع کرنے پر زور دیتی فارحہ ہنس کر

پڑی۔
”اباب پڑھنے میں دل نہیں لگتا گھر والوں سے دور رہنا بھی اب مشکل لگتا ہے جہاں تک ”اسود
اباب“ کا معاملہ ہے تو میں تو اسے بھول بھی گئی تھی پتا نہیں کس مسئلے میں الجھی ہو۔ اسود نے الوینہ سے شادی
کر لی ہے یا کسی اور سے مجھے اس کی قطعاً پتہ نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی پرواہ ہے اور اسی لیے میں عنقریب
ایک ہی گری ہوں کچھ روز میں منگنی کا باقاعدہ فنکشن بھی ہو جائے گا تو میں تمہیں تصویریں بھیجواؤں گی۔“
اس نے بڑے آرام سے جھوٹ بول دیا وہ ٹاکس کو یہ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس میں الوینہ اور اسود کو ایک
خود بخوبی کا حوصلہ نہیں ہے اگر ایسا ہوا تو وہ جذبات کی رو میں بہتی وقت کے کسی کمزور لمحے کی زد میں
بائے کی اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی۔ کسی کمزور لمحے کی زد میں آ کر وہ اسود ابراہیم کو اس کی جیت پر خوش
بائے کی کامیابیوں کیوں فرما رہی تھی۔ اس کے سینے پر سچے میڈلز میں ایک اور اضافہ کیوں کرتی وہ.....؟

اور وہ جو اس نے کہا تھا کہ اسود ابراہیم اس کے لیے اہم نہیں ہے تو یہ غلط تھا۔ اسود ابراہیم اس کے لیے
اہم تھا تو کیا وہ اپنی تعلیم اور وری چھوڑتی اپنا کیریئر بر باد کرے گی؟

اسے اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوتی تو گردن موڑ کر دیکھا۔ مہوش کمرے میں داخل ہوئی
تھی۔

”رات بھر سے جاگ رہی ہو سو جاؤ کچھ دیر میں فریش ہو جاؤ گی۔“ اس کی آنکھوں میں پھیلی سرخی
کھتے ہوئے اس نے کہا۔

”اباب بھائی سو گئے کیا؟“ اس کا کہنا نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”نہیں تو..... ابھی تو چائے پی رہے ہیں کچھ دیر میں آفس جائیں گے.....“

”آفس جاتے ہوئے وہ مجھے ہاسپٹل ڈراپ کر دیں گے؟“ اس کا انداز استغماہیہ تھا۔ مہوش نے الجھ
کے ساتھ کہا ”ہاسپٹل جا کر تم اب کیا کرو گی؟“

فارحہ نے گردن موڑ کر نظریں سفیدے کے سرسراہٹے جھنڈ پر لگا دیں۔

”کچھ کام ہے۔“ اس کے مختصر سے جواب پر بیڈ شیٹ کی سلوٹیں درست کرتی مہوش حریفہ الجھ گئی پھر
کھانے والے انداز میں بولی۔

”تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس شخص کے گھر والوں سے رابطہ ہو جائے تو ہارون سب کچھ خود ہی

ہینڈل کر لیں گے تم۔۔۔۔۔

”میرا جانا ضروری ہے مبہوش۔۔۔۔۔ بہت ضروری۔“ اس کا لبہ دلچسپہ دو ٹوک تھا۔ مبہوش چہرے لہجہ بہن کی اس عجیب سی کیفیت کا کوئی مناسب نام تلاش کرتی رہی پھر مایوس ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

+

اس کے قدم ٹھک کر رک گئے۔ سر اٹھا کر دیکھا کمرہ نمبر ۱۲۔ کمرے کے باہر وہ اتنی ہی دیر کا بھیجی میں گلے سے لٹکا اٹھو سکوپ اس کے ہاتھ میں قید ہوا۔ ٹکبے سے اندھیرے سے اس کی آنکھوں سے مانوس ہونے میں کچھ وقت صرف کیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیڈ کے ایک طرف آ گیا۔ کتنے ہی پل یونہی گزر گئے۔ وہ بجائے اس کا چیک اپ کرنے کے مسلسل اس کی صورت تکہ ہاتھ کل اس نے فارحہ تنویر کو اس شخص کے لیے روتے دیکھا تھا۔ اس کی کٹائی میں لگی ڈرپ کی سولہ شہادت کی انگلی سے چھوتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

”اگر میں یہ سوئی نکال دوں تو۔۔۔۔۔؟“ کوئی کمینہ اس کو ترغیب دے رہا تھا۔ نظریہ مرک کرداؤ جن کے چہرے تک چلی گئی۔ بند ہونٹوں پر خاموش التجائیں اس کا دامن تھامنے کو ہاتھ پاؤں بار رہی تھیں۔ وہ کھڑا رہا، سوچتا رہا مگر یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گا سچی عتب میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ پلٹ کر دیکھنا نہی بلیو کھدر کی شلوار قمیص، ہم رنگ دوپٹہ، آنکھوں کی سرفی سے منگوا ادھوری نیند کی شکایت اور گندی رنگت میں کھلی اداسی۔۔۔۔۔ بڑی سرعت سے اس نے اپنی انگلیاں داؤد جن کی کلائی سے الگ کر لیں۔

”میں راؤنڈ سے واپس آیا تو ان کا خیال آ گیا سوچا کیوں نہ جاتے جاتے ایک نظر دیکھا جاؤں۔“ فارحہ کے چہرے پر پھیلی سراپسگی دیکھتے ہوئے اس نے تسلی بھری وضاحت دی تو وہ پرسکون سی نظیر داؤد جن پر ڈال کر سیر وئی کھڑکی کی جانب بڑھ گئی۔

اسود نے اسے اپنے قریب سے گزر کر کھڑکی کے پاس جاتے دیکھا۔ کل کے برعکس خاصی ہیز مات میں تھی وہ۔ بلیٹے سے برش کیے بال شانوں پر پڑے تھے مگر اس کی آنکھوں کے گرد سوزش خاصی نمایاں تھی وہ پر حزن دکھائی دیتی تھی۔

اس نے داؤد جن کے ہوش و خرد سے بیگانہ وجود کو رنگ بھری نگاہوں سے دیکھا پھر دروازے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ فارحہ کی آواز کمرے کی خاموشی میں گونجی۔

”میں اس شخص کی کنڈیشن کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔“

کر رہی تھی۔

”اس شخص۔۔۔۔۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ کتنے ہی پل چپکے سے گزر گئے فارحہ اس کی بڑبڑاہٹ سے ناواقف ہے سوال کے جواب کی منتظر اسے دیکھ رہی تھی شے کی کھڑکی پر پڑے بھاری پردے کی درز سے دھوپ کی لمبی کیر براہ راست اس کے چہرے پر پڑنے لگی تھی۔ گندی رنگت دکھنے لگی جیسے گندم کی نوخیز بالیاں

ہو پ کی کش سے دکنے لگتی ہیں۔

”تم اپنے شوہر کو اس شخص کہہ کر مخاطب کرتی ہو؟۔۔۔۔۔ اسٹریچ۔۔۔۔۔ کتنا غیرایت بھرا انداز لگتا ہے جیسے

ننان کی غیر کی بات کر رہا ہو۔۔۔۔۔ انہیں عجیب نہیں لگتا؟“

روانی حیرانی کا اظہار کر رہا تھا حقیقتاً اسے یہ بات بڑی عجیب سی لگی تھی۔

”جب انہیں ہوش آ جائے گا تو یہ سوال تم خود ہی پوچھ لینا۔“ پھول گلدان میں سجا کر وہ سنجیدگی سے

اس کی طرف چلی۔

”کیا تم مجھے داؤد کی کنڈیشن کے بارے میں بتا سکتے ہو؟“ بظاہر اس کی حیرانی کو قطعی خاطر میں نہ

آئے ہوئے وہ بڑے اعتماد سے اس سے مخاطب تھی اگرچہ دل شیشا پاتا تھا۔

”اور یہ کہ داؤد کتنے عرصے میں ریکور کر لیں گے؟“

اسود نے کچھ کہنے کی غرض سے منہ کھولا پھر بتا کچھ کہے بند کر لیا۔ کتنے ہی ٹاپے اسے حیران حیران

نظروں سے اسے دیکھنے میں گزرے پھر گردن گھما کر داؤد جن کو دیکھا۔

”یہ کس آپ ڈاکٹر صائم ہینڈل کر رہے ہیں۔“

اس کے لہجے میں رکھائی تھی۔ فارحہ نے اسے بڑی بے اعتنائی سے دروازے کی سمت بڑھتے دیکھا

گردوازے کی ناب پر ہاتھ رکھے وہ پل بھر کور کا تھا۔

”میں تمہیں ڈاکٹر صائم سے ملوا دیتا ہوں تمہیں جو کچھ پوچھتا ہے ان سے پوچھ لینا۔۔۔۔۔ فارغ ہو کر

بہرے کہیں میں آ جاؤ! ابھی ڈاکٹر صائم وہیں ہوں گے۔“

فارحہ کو وہ خود سے الجھا ہوا لگا خود سے بھی خفا اس نے بھی ناراض۔ اس کے لبوں پر ہنسی سی مسکراہٹ

نکلی تھی۔

”میں تمہیں کیا سمجھوں اسودا براہیم! انجانے کو سارو پ سچا ہے تمہارا۔ وہ جو مجھے دیکھ کر سرد ہر ہو گیا تھا

داؤد جیسے اس بیٹہ کو براہیم دو ستوں کی طرح مجھے تسلیمان وے رہا تھا یادہ روپ زیادہ حقیقی ہے جس کے

لہجے میں مجھے سے گفتگو کرتے ہوئے صرف رکھائی ہوتی ہے یادہ جو خشکی بھرنے لہجے میں بھی اپنا نیت میرے

لہجہ پر چڑھ گیا ہے۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ادھور ہے پراجیکٹ کو مکمل کرنے کی ایک اور کوشش ہو۔“

بند دروازے سے ٹکرا کر نگاہ داؤد حسن پر جا بٹھری۔

”اور ایک یہ شخص ہے جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں مگر لگتا ہے کہ ایک تعلق ہے بہت گہرا، بہت مضبوط۔ شکر یہ تو تمہارا میں ادا نہیں کر سکوں گی مگر احسان مند ساری زندگی رہوں گی کہ بہر حال تم نے مجھے نصرت سے بچایا ہے۔“

پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتی وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔

ساڑھے پانچ سال..... اس کی زندگی کا سب سے بے کیف حصہ..... ہاشل چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد وہ میڈرڈ (امین) چلی گئی۔ دل کا حال چھپانے کو بہانے تو کئی تھے پھر یہاں پاپا کے کئی رشتہ دار عہدے سے کسی نے اعتراض نہیں کیا اور اگر کوئی اعتراض کرتا بھی تو کیا۔ اس سرزمین سے منہ موڑ کر کہیں تو جانا ہی تھا کہ اس سرزمین نے اسے کبک بھیجتی تھی اور کبک کبھی آنکھوں کی سرزمین پر سیلاب نہیں لاتی مگر دل کی دنیا کو اجاڑ اور خالی پن ضرور عطا کر دیتی ہے۔

کبھی تحریم کی گفتگو میں اسود ابراہیم کا ذکر آتا تو وہ بات بدل دیتی۔ وہ اپنا غم اس سے بھی شیز کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیز میں ملازمت کی۔ مختلف زبانیں سیکھیں پھر متعلقہ ادب کا مطالعہ بھی کر لیا بس اگر کہیں پڑھ پائی تو وہ ممتاز مفتی ان لواد رکھتے رابرٹ فراسٹ جیسا شاہکار یاد تھا۔

پھر انہی دنوں ممی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تو وہ اس کی شادی کے لیے فکر مند رہنے لگیں اور اس بار اس نے مجبوراً ان کی بات مان لی اور پاکستان واپس آ گئی۔ شادی کے لیے رضامند بہر حال وہ اب بھی نہیں تھی۔ پھر ایک ایسے ہی دن میں جب وہ مہوش کے پاس چند روز قیام کی غرض سے آئی ہوئی تھی مہوش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ جھنجھلا کر کار کی چابی لیے گھر سے باہر نکل آئی۔ موسم کے توراں وقت بھی تنہا تھے آسمان کے کناروں سے اٹھتا ہوا غبار تیزی سے آسمان کو اپنی پیٹ میں لے رہا تھا۔ بھری ہوا درختوں کی شاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر نئے سرے پر چھیر رہی تھی۔

وہ اندھا حدنگا ڈی دوڑانے لگی۔ اضطراب تو گویا خون کیساتھ گردش میں تھا۔ وہ مہوش کو کیسے سمجھاتی کہ جب تکین کوئی اور ہو جبکہ گھر کے دروازے پر شیم پیٹ کسی اور کے نام کا دی جائے تو یہ بڑا نامناسب لگتا ہے۔ پھر کوئی ایک تو دو غلا کہلاتا ہی ہے اور وہ یہ نامناسب زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

اس کے دل میں کوئی اور تھا جسے چاہے کبھی وہ باہر نہیں نکال پائی تھی اور اب خود پر کسی اور کی ہم پیٹ کا کردہ دہری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ کچھ تو سوچوں میں تنہی دیتی تھی کچھ خون کی گردش میں اضطراب۔ بارش کی آواز میں کھڑا شخص دکھائی ہی نہیں دیا۔ ذرا سی غفلت اور وہ شخص موت کے دہانے پر جا پہنچا۔

+

اور اس حادثے سے بڑا حادثہ تو اسود ابراہیم کا پھر سے سامنا تھا۔ وہ شخص جس کا سامنا وہ زندگی میں کبھی دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھی محض اس خوف کی بنا پر کہ کہیں کسی کمزور لمحے کی قید میں وہ اپنا دل اس کے ماتھے پر رکھ دے پھر وہ اس پر نئے گاؤں کے گھر سے اپنا نکس چھوڑے بیانی گزر گیا تھا اور ایک تم ہو جو اس بل کا جوگ سینے سے لگے وہ بل تو میری زندگی میں اپنا نکس چھوڑے کسی بھی روح کی مانند گھوم رہی ہو۔“

وہ اس شخص کا سامنا کرنے سے اسی لیے گھبراتی تھی کہ کہیں اس کی تسخرانہ نگاہیں فارحہ کے بدن میں پھنسا دیں اور وہی شخص چہرے پر ایک نرم سا تاثر لیے اس کے سامنے بیٹھا بے حد محبت سے اپنی بیوی کو بچے کا ذکر کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سام سے داؤد حسن کے متعلق سب کچھ معلوم کر کے وہ اٹھنے لگی تو اسود نے روک دیا۔

”پاپا کہاں رہی ہو؟ بیٹھو تمہیں بہت اچھی سی چائے پلوتا ہوں۔“

ڈاکٹر سام اس وقت جا چکے تھے۔ اسود کا انداز بے حد دوستانہ تھا۔ وہ بیٹھی رہی مبادا کہ وہ اس کے لہجے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرے پھر یہ بھی تو خدشہ تھا کہ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اس نے جو دروغ گوئی کہاں کا پل نہ مکمل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جھوٹ اس نے اراداً نہیں بولا تھا۔ یہ تو کل افراتفری میں کچھ ایسی صورت حال تھی کہ اسود کو ان بات میں جواب دینی گئی اور اگر وہ داؤد حسن کو اس کا شریک حیات سمجھ رہا تھا تو اس میں طائفہ کیا تھا۔ ایک طرح سے اس کا بھرم قائم رہا اور اب خدشہ دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

اس کا دل بے اختیار سر پیٹ لینے کو چاہا وہ متضاد کیفیات و خدشات کا شکار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسود نے ان کی شرارت کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں بہت مس کر رہا ہوں۔ اسے آئی وٹس ایمن اور میں یہاں ہوتیں تو تم سے بھی ان کی ملاقات ہو جاتی۔“

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“ اس کی گفتگو میں اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”بہاؤدین، ایمن کے پرنس وہیں رہتے ہیں نا۔“

”ایمن۔“ وہ چونک سی گئی۔ ”لیکن اسود! تم تو الویس سے شادی کرنے والے تھے نا؟“

اس نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ جواباً اسود نے جیسی نظروں سے اسے دیکھا وہ اسے بوکھلا دینے کے لیے کافی نہیں پھر وہ یکدم مسکرانے لگا، اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی۔

”نہیں فارحہ! میں کبھی الوینہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی اور نگاہیں فارحہ پر لگی تھیں۔

چائے کانگ لیوں تک لے جاتا اس کا ہاتھ درمیان میں ہی ٹھک کر رک گیا۔ وہ بے چینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن.....“ وہ بڑی مشکل سے بولنے کے قابل ہو پائی۔

”الوینہ نے مجھے خود بتایا تھا کہ تم۔“

”کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اسود نے سرعت سے اس کی بات قطع کی۔

”جھوٹ بولا تھا الوینہ نے تم سے کیونکہ وہ خود مجھ میں انٹرنل تھی۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں کبھی اس میں انٹرنٹ نہیں لیا۔ وہ میرے لیے بس ایک عام سی کزن تھی اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ بولتے بولتے کھڑکی کے پاس جا رہا تھا۔

”اپنی ساری زندگی میں میں نے جس لڑکی میں انٹرنٹ لیا وہ تم تھیں۔ اچھی لگی تھیں تم مجھے، میں سوچا تھا کہ شادی کروں گا تو ایسی لڑکی سے مگر پھر تم چلی گئیں تو میں نے ایمین سے شادی کر لی۔“ وہ آرام سے اتنی بڑی بات کہہ گیا گویا یہ معمولی بات ہو مگر فارحہ کے لیے یہ ایک دھچکا تھا۔ کھڑکی سے آروشی یکدم تاریکی میں بدل گئی تھی۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

”ایمین سے میرا شادی کا فیصلہ نہایت مناسب تھا وہ جتنی اچھی بیوی ہے اس سے کبھی اچھی دوست ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید اتنا مطمئن تو میں تم سے شادی کر کے بھی نہ رہا ہوتا جتنا کہ اب ہوں۔“ اس نے گردن موڑ کر ایک مختصر سی نگاہ فارحہ پر ڈالی۔ وہ گردن جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سوچ سے وہ ناواقف تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلا کھستہ ورنجٹ کا سایہ دور کیوں نہ تھا۔

اس نے پرسکون ہو کر گردن موڑ لی۔

”تم مجھ میں انٹرنٹ تھے..... اچھا؟ حیرت ہے مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوسکا۔ جی تو جب الوینہ مجھے بتایا کہ تم اور وہ انکلیڈ ہو تو مجھے برا نہیں لگا بلکہ تمہارے پھول بھجوانے کو بھی میں مذاق تھا کبھی تم دوستوں میں ایسا مذاق چلتا ہی ہے۔“

اسود لیوں پر تنہا نہ مسکرا ہٹ لیے اس کی جانب پلٹا اور میز پر پھیلے ہوئے کاغذوں کو لڑا سا جھکا۔ ”بہت خوب..... تمہیں برا نہیں لگا..... بہت گریٹ ہو تم۔“ کئی بڑی باتیں بولنے کے خصلے سے برداشت کر لیتی ہو..... آپ کو ایک بات بتاؤں مسز فارحہ! اگر میری کسی فریڈ نے میرے ساتھ ایسا مذاق کیا ہوتا تو میں اس کا مٹوڑ دیتا۔“

براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ سارے الفاظ دانتوں تلے چبا گیا۔ جتنے اس کے لفظ سخت تھے اس سے کہیں زیادہ لہجہ۔ آنکھوں سے سختی و درشتی جھانک رہی تھی۔ فارحہ کا دل کسی نے مٹھی میں مسل

”جہیں یاد ہے اسود! ایک دفعہ میں نے بھی تمہیں ایسی ہی بات کہی تھی تب تم نے مجھے جذباتی کہنا۔“ سر اٹھائے اس کی آنکھوں میں جھانکتی وہ اسے یاد دل رہی تھی۔

”میں کسی فیلنگ کو مذاق کا نام دے دیا جائے اور پھر یہ توقع کی جائے کہ وہ جذباتی نہیں ہوگا نہایت اطمینانی سوچ ہے۔“ وہ جیسے جھکا تھا ویسے ہی سیدھا بھی ہو گیا۔

”پورے ڈیڑھ برس میں مختصر ہا کہ شاید تم لوٹ آؤ اور تم میری فیلنگ کو مذاق سمجھ رہی ہو۔“ وہ درشت بولنے لگا مگر گان تو پہلے ہی تھا۔

(ڈیڑھ برس اور مجھے دیکھو کتنے عرصے سے بنا کسی امید کے مختصر ہوں۔ یہ بھی یاد نہیں بس اتنا پتا ہے کہ ہماری تقدیروں نے بڑا عجیب سا مذاق کیا ہے ہمارے ساتھ)

اس نے اسود کو جھنجھلائے ہوئے انداز میں سگریٹ سلگاتے دیکھا اور انگلیوں کی پوروں کی مدد سے آنکھوں کے کناروں میں چسکتی نمی چھپا گئی۔

”اب پرانی باتوں کو یاد کر کے کڑھنے سے کیا فائدہ؟ تم ایک مطمئن زندگی گزار رہے ہو۔ میں بھی خوشحال ہوں۔ یوں سمجھو کہ ہم دونوں اسی مقام پر ہیں جہاں ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ ایمین سے تمہارا شادی کا فیصلہ نہایت مناسب تھا۔ یوں بھی میں تو شروع سے ہی داؤد سے کھیڑ رہی ہوں۔ تمہارے بارے میں تو گمانے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا۔ تم میرے لیے صرف ایک دوست تھے۔“ اس نے ہل بھر کے لیے توقف کر کے اسود کو دیکھا۔

”میں ایک مطمئن زندگی گزار رہا ہوں تم بھی خوشحال ہو.....“ اس نے ہل بھر کا توقف کیا پھر لا پرواہی سے بولا۔

”تم جہاں کبھی ہو تو میں مان لیتا ہوں۔“

فارحہ کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ جو کہہ رہا تھا اس کا انداز اس کے قطعی طور پر برعکس تھا۔

”تم میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہے۔“

اسود نے خود ساختہ سی حیرانی سے اسے دیکھا۔

”کہ تو رہا ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو اسود۔“ وہ مزید چڑ کر بولی۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”تمہارے چہرے پر لکھا ہے۔“

”کیا لکھا ہے؟“

”یہی کہ تم میری بات پر یقین نہیں کر رہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ خود کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی ہو۔“

اس نے اطمینان سے فارحہ کا اطمینان غارت کیا۔

”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ بولکھائی گئی اور اسے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن نہایت برا لگا تھا۔

”اب تم جھوٹ مت بولو فارحہ!“ وہ دل جلانے والی مسکراہٹ لیوں پر سجائے اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”کیونکہ تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔“

”کیا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے؟“ اس کی بے بسی بالآخر اشتعال کی حدود کو چھونے لگی تھی۔

”یہی کہ تم اپنے صحیح مقام پر ہو اور یہ بھی کہ تم داؤد حسن سے کمیڈ تھیں اور مجھے صرف دوست سمجھتے تھیں۔“ وہ بے حد پر یقین تھا۔

”ہاں یہی سچ ہے میں داؤد سے ہی کمیڈ رہی ہوں۔“ اس نے ہر لفظ پر زور دیا اور تب وہ پہلی بار

بھڑکا۔

”اس کا مطلب تم نے مجھے وقت گزاری کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا.....“ وہ بے حد پر اشتعال ہو گیا تھا۔

”اسود میں.....“ اس نے کہنا چاہا مگر اسود نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔

”پلیز فارحہ! اب اپنے حق میں دلائل دے کر مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں اب تک یہی

سمجھتا رہا کہ تم محض الوینہ کی باتوں سے بدظن ہو کر..... مگر مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اصل میں تم خود

ہی دھوکے باز تھیں۔“

”کیا دھوکا دیا ہے میں نے تمہیں.....“ وہ ہکا بکا اس کی شکل تک رہی تھی۔

”میرے جذبات سے کھیلتی رہی ہو تم۔ کیا یہ دھوکا نہیں ہے؟“ وہ دہلی دہلی سی آواز میں چنچا تھا۔

اور فارحہ بے دم سی ہو کر گر گئی۔ اسود ابراہیم کے الفاظ اس کے منہ پر نکلے بعد دھمکے پھڑپھڑا رہے

تھے اور ہر پھڑکے ساتھ اس کا حوصلہ مزید پست ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگا وہ دوبارہ کبھی نہیں بول سکے گی جبکہ

اسود بول رہا تھا اور بولتے ہوئے اسے قطعاً احساس نہ تھا کہ اس کے لہجے کی سختی و ترشی کسی کی روح کو چید

رہی ہے۔ کسی کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہے اور کسی کے دل میں موجود حسرت زدہ محبت یا کین

جھپکائے اسے تک رہی ہے۔

پھر اشتعال کی جگہ رنج نے لے لی اور وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ وہ اسے دعا باز اور خود غرض کہہ

کر خاموش ہو گیا اور وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی سوچتی چلی گئی کہ اس نے کب اسود کو قہر کا

ذریعہ بنایا؟

مداہمین انفر دگی سے بھر گیا۔ یہاں وہاں بدگمانی کے ڈھیر تلے گہری خاموشی چھائی رہی۔ وہ دیر

بھر جھکے اس طویل عرصے کا پل پل چھانتی رہی پھر آنکھوں میں سرخ ڈورے سے اترنے لگے

بند دل کی حدود عبور کرنے لگی تو آنکھوں میں بادل سمٹ آئے۔ تب وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر جانے سے

ایک ہی قدم بڑھانے سے پہلے وہ اس کی جانب پلٹی جو اپنے دل کا سارا تنفر اس کو دان کر کے اب

بٹھا دینا چاہتا تھا۔

”نصرت تمہارا ہے نہ ہی میرا۔ بلکہ قصور تو اس سیاہ پل کا ہے اسود ابراہیم! جو ہم دونوں کے بیچ آیا اور آ

خل ہو گیا..... اور مشکل یہ ہے کہ ہم چاہ کر بھی اس سیاہ پل کو اپنی زندگیوں سے نکال نہیں سکتے۔“

اس کی آنکھ سے ایک ننھا سا موتی گال پر لیکر چھوڑ کر میز کی سطح پر پڑھ گیا اس کے لہجے میں شکوہ تھا نہ

ت بلکہ آواز میں دکھ تھا اور ایک جانا بچپنا سا کرب۔

اس نے اپنے پس پر گرفت مضبوط کی اور مینہ برساتی آنکھوں کے ساتھ اپنا نکھرا وجود سمیٹتی باہر نکل

بکروہ..... میز کی سطح پر پیچہ ویٹ جمائے ڈرا دیر کے لئے چونکا۔ نگاہ اٹھائی تو بند دروازہ منہ چڑا رہا تھا

یڑکی چٹکی سطح پر پڑا وہ ”قطرہ“ سچے موتی کی مانند چمک رہا تھا۔

ایک دروازہ بند ہوا تھا مگر یادوں کی تیز آندھی میں کئی دروازے کھلنے بند ہونے لگے تھے۔

+

اور ایک شام ڈھلنے کے قریب ہے۔ زردی دھوپ میں نارنجی رنگ تو کب کے کھل مل چکے درختوں

سائے لے ہوئے لگے ہیں ابھی ایک سرمستی سا دھند کا ساری کائنات پر قابض ہو جائے گا پھر قدرت

ابھرا تھا اس کیوں پر سیاہی بھرا اسروک لگائیں گے پھر.....

آج صبح جب میں بیدار ہوا تو ہمیشہ کی طرح پہلی نظر کھلی کھڑکی سے باہر پھیلے وسیع آسمان پر جا رہی۔

ان پر پچھلی رات کی طرح کالے کالے سفید سفید بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر ان بادلوں میں وہ شدت

نارنجی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا بادل برس کر مطمئن ہو گئے اب انہیں جانے کی جلدی تھی اور میرا دل بے

باہر چاہا کہ یہ بادل کہیں نہ جائیں یوں ہی ہمیشہ آسمان کو گھیرے رہیں۔ بارش بدست رہے کبھی نہ تھے یا برف

ڈھنوں ہو جائے، تمام سفری راستے مسدود ہو جائیں یا کوئی بھی رکاوٹ..... ایسی رکاوٹ جو ”اسے“

ساتھ لوک دے۔

سب اقدار امداد اسے دیکھنے کو چاہنے لگا تھا۔ یہ خواہش اتنی شدت سے ابھری تھی کہ میں خود کو روک

کر لے لیتا تھا میں عام روٹین کے برعکس وقت سے پہلے باہر نکل میں موجود تھا۔ مجھے اپنے عمل کی شدت پر

لگائے گی اور اس کے باوجود میں داؤد حسن کے روم میں چلا گیا پھر وہاں فارحہ بھی آگئی تو میں نے اسے

نظر بھر کر دیکھا۔ حالانکہ یہ نگاہ اس پر ڈالنے کا حق میں نہیں رکھتا تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا اور ہر کون سا تا میری تو کوئی غلطی بھی نہیں تھی اور..... اور اس کے باوجود اتنے آرام سے وہ میری زندگی سے کل کر کسی اور کی زندگی میں شامل ہو گئی اور اس نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ حقیقت کیا ہے؟ بہر حال حقیقت کبھی نہیں بدلتی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس گزرنے عرصے میں میں اسے کبھی بھی بھول نہیں سکا۔ مجھے تو وہ شام بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد ہے جس شام میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اپنی تمام عمر گزار کر بھی میں جس شام کو اپنے حافظے سے محو نہیں کر سکوں گا۔ وہ وہ شام ہے۔

شاہنگ سینئر کے گلاس وال کے اس پار ہوا کے نرم جھوکوں سے شام خوشگوار ہو چلی تھی جب سبز حیا اترتے ہوئے میں اس سے ٹکرا گیا۔ خدا گواہ ہے کہ اس تصادم میں میری کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی البتہ غلطی ضرور ہوئی تھی مجھ سے بھی اور اس سے بھی۔ وہ چونکا ہوا کر نہیں چل رہی تھی پھر کچھ میں بھی تیزی سے سبز حیاں عبور کر رہا تھا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معذرت کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا مگر نجانے مجھے کیا ہوا اور میں گفتگو کو طول دیتا ہی چلا گیا اور اس غیر ارادی اور مختصر ملاقات میں وہ میرے حافظے میں نقش ہو کر رہ گئی۔ ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہی..... جاتے جاتے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ہماری اگلی ملاقاتیں محض اتفاقی تھیں مگر سرسری قطعاً نہیں تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ مجھے اسے چڑا کر مزہ آتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب مسلسل اتفاقی ملاقاتوں میں وہ مجھے دکھائی دی تو میں خود اس کے سامنے پہنچ جاتا۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے خاصی دلچسپ لگی تھی۔ اگلی چند ملاقاتوں کے دوران یہ دلچسپی بڑھتی ہی گئی اور یہ دلچسپی صرف دلچسپی ہی تھی۔ اس میں محبت جیسی کوئی بات نہیں تھی بلکہ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ ہماری آخری ملاقات میں بھی محبت کہیں نہیں تھی۔ البتہ وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی جہاں تک محبت کا تعلق ہے تو میں کسی ایسے جذبے کا قائل نہیں ہوں جو لوگوں میں تخلیق ہو جائے خود رویتل بھی اپنی جڑیں زمین کے پتے میں مضبوطی سے پیوست کرنے کے لیے کچھ وقت لیتی ہے تب کہیں جا کر پروان چڑھتی ہے۔ ہاں تو فارحہ تنویر سے مجھے محبت نہیں تھی مگر وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ کب اور کس ہل میں یہ حادثہ ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن اس پسندیدگی کا موجب ایک حادثہ ہی بنا تھا اور فارحہ نے اس حادثے کو لے کر کافی مس بی ہو گیا تھا۔ بات صرف مجھ تک محدود رہتی تو شاید میں برداشت کر لیتا مگر وہ میرے کردار کو بدلتا بناتے ہوئے میرے پروفیشن پر انکی اٹھارہ تھی اتنی بکواس سن کر خاموش رہتا میرے بس سے باہر تھا نتیجتاً میں بھی اسے خوب کھری کھری سنا ڈالیں۔

دو روز بعد اس نے ہاسٹل آ کر مجھ سے ایک سیکو ذکر لیا اور اسی روز میں کسی قدر چمک گیا۔ فارحہ نے فقط مجھ سے نہیں بلکہ ڈاکٹر عبداللہ سے بھی خاصی بدتمیزی کی تھی جبکہ معذرت وہ صرف مجھ سے کر رہی تھی۔

میں صرف مجھ سے ہی تھی اور شرمندگی ہم صرف اس شخص سے محسوس کرتے ہیں جسے ہم اہم جانتے ہیں جانتا کہ میری عام سی بات پر بھی جل بھن جانے والی اس لڑکی کی زندگی میں میری کیا اہمیت تھی کہ اس کی اہمیت میری زندگی میں بڑھتی چلی گئی۔ میرا دل اس سے ملنے کے لیے بیتاب رہنے لگا۔ میں خود خود اس کے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگے اور وہ مجھے اتنی اچھی لگنے لگی کہ میں نے اس کے قدموں پر چڑھ کر اس کے والدین کی جانب سے کوئی تعرض نہ تھا مگر کسی بھی باقاعدہ کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے والدین کی جانب سے کوئی تعرض نہ تھا مگر کسی بھی باقاعدہ کارروائی میں فارحہ کی رائے جانا ضروری سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی کیونکہ اس کے پاس اتنی ہی پسندیدگی محسوس کی تھی جتنی کہ میں خود اس کے لیے رکھتا تھا مگر یہ میری غلط فہمی تھی میں نے اتنی ہی پسندیدگی اس کی حد کو عبور کر کے محبت کی وادی میں قدم رکھ چکی ہے۔

میں اندازہ نہیں تھا کہ اس کی پسندیدگی اس حد کو عبور کر کے محبت کی وادی میں قدم رکھ چکی ہے۔ بلکہ میں نے اسے پھول بھجوانے کے کئی روز تک چاہنے کے باوجود میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کر سکا۔ میری بات کی بنا پر اور مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ میرے ان مصروفیات بھرے شب و روز کا ایک کئی اسے مجھ سے بدگمان کر چکا ہے۔

دو روز بعد میری سیکرٹری نے مجھ سے اچھی علیک سلایک تھی۔ جن دنوں میں میڈیکل کے فائل فنان دنوں میری اور الوینہ کے شادی کا شور اٹھا تھا حقیقت یہ ہے کہ میری ممالوینہ کو خاصا پسند کرتی تھی اسے اپنی بو بھی بنانا چاہتی تھیں مگر میرے انکار کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میری فیوچر پلاننگ میں انی انوکھ کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ میں بہت اچھا سر جن بننا چاہتا تھا۔ میں اپنے نام کے آگے کئی کا حوالہ دیکھنے کا خواہاں تھا۔ سوشادی میری نزدیک ایک جزوقتی کام تھا۔ مجھے قطعی طور پر اندازہ نہیں تھا کہ میری سیکرٹری نے اس بات کے نقش باقی ہیں۔ اس نے انکار کو اپنی سمجھا تھا۔ ثناء سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے کئی باتیں بتائیں۔

ب سے پہلے تو بڑی خوشی سے فارحہ کی گفتگو کی خبر دی مگر پھر ساتھ ہی جوش جذبات میں بہت کچھ کہتی تھی۔ میں صرف ہنس رہا تھا۔ یہی بات تھی کہ میں نے فارحہ کو دھوکا دیا ہے۔ یہ الزام میرے لیے دھچکے سے کم لگتا تھا۔ میں الوینہ سے میرے انکار کو اپنی بے عزتی گردانتے ہوئے محض انتقامی کارروائی کے طور پر فارحہ کو مجھ سے ملانے لگا تھا۔ میں الوینہ سے خوب جھگڑا مگر اب لیکچر پینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے فارحہ کی غلطی سے اس کا ارادہ کر لیا مگر ثناء سے اس کا ایڈریس مانگا تو وہ بہت منت سے بولی۔

میں آپ اب اس کی پرسکون زندگی کو بے سکون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ روز میں اس کو مل جائے گی اور انشاء اللہ وہ ایک اچھی زندگی گزارے گی اب اگر اس اسٹیج پر آپ اس کے سامنے آپ اس کی آنے والی زندگی برباد کر دیں گے۔ ایک بات بتاؤں آپ کو اسود صاحب! ہم لڑکیاں اسے بہت کتنی ہیں تو پورے دل سے کرتی ہیں دل کی پوری زمین ایک ہل میں اس شخص کو الٹ کر

فارحہ نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے مگر میں جانتی ہوں فارحہ بہت بڑی جرنلسٹ بننا چاہتی تھی مگر آپ کی خاطر اس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور بولز کی اپنا کیریئر برباد کر سکتی ہے کیا وہ محبت نہیں کر سکتی..... ایک گزارش ہے میری آپ سے، دوبارہ اس کی زندگی میں عمل مت دیجئے آپ کی بے وفائی کے ساتھ وہ پرسکون زندگی گزارے گی مگر آپ کی محبت کا ذرا سا احساس اس کی شادی شدہ زندگی کو عذاب بنادے گا۔“

”محبت۔“ میں خود بھی چونک گیا۔

”کیا مجھے اس سے محبت تھی۔“ میں نے خود سے سوال کیا اور جواب میں ایک گہری مرہیب خاموشی میرے گرد پھیل گئی۔

پھر کچھ روز میں بے قرار رہا کہ بہر حال اسے کھودینے کا افسوس تھا رفتہ رفتہ یہ افسوس اس قدر شدید ہوا کہ اذیت بن گیا۔ اس کی موجودگی میں میں اسے پسند کرتا تھا مگر اس کے جانے کے بعد میں اس سے محبت کرنے لگا تھا..... گہری محبت۔

یہ محبت بھی بڑی عجیب سی شے ہے جب نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی۔ مگر جب ہوتی ہے تو اپنا احساس اس شدت سے دلاتی ہے کہ انسان بے بس ہو جاتا ہے۔

میری ہر بے بسی پر غصہ و اشتعال کا غلاف چڑھنے لگا۔ دل ہی دل میں اس سے خفا ہو گیا۔ کاش وہ مجھ سے آ کر فقط ایک بار پوچھتی کہ چٹائی کیا ہے؟

اسے اسود ابراہیم کے کردار میں اتنا جھول نظر آیا کہ کسی کی ذرا سی دروغ گوئی پر وہ بدگمان ہو گئی۔ یوں دکھ بھی تھا، غصہ بھی اور فارحہ تو یہ کھوئے کا غم کک کی میخ بن کر میرے دل میں گڑا رہ گیا۔ نتیجتاً میری شخصیت میں کئی تبدیلیاں بھی آئیں میں مجلسی زندگی سے دور ہوتا چلا گیا۔ میرا حلقہ احباب سمٹ کر چند لوگوں تک محدود رہ گیا میری فطرت میں اشتعال انگیزی بڑھ گئی۔ مجھے ذرا ذرا سی باتوں پر غصہ آنے لگا پھر ارد گرد رہنے والوں کے اعتراضات بڑھنے لگے تو میں اپنا ساز و سامان سمیٹ کر میڈیکل کی حریہ تعلیم کی غرض سے امریکہ جا بیٹھا پھر وہاں بھی کب تک رہ سکتا تھا واپس آیا تو ماما میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ میرے امریکہ میں قیام کے دوران ڈیڈی اپنا ذاتی ہاسپٹل مکمل طور پر اسٹبلش کر چکے تھے۔ یہ ہاسپٹل ہم دونوں کا خواب تھا سو میں بھی اسی طرف لگ گیا۔ میری تمام تر توجہ ہاسپٹل پر مرکوز ہو گئی یوں زندگی ایک تسلسل سے گزرنے لگی اور تبھی..... تبھی وہ پھر میری نگاہوں کے سامنے آن لگی۔

مجھے حیران ہونا چاہیے تھا۔ سو میں جی بھر کر حیران ہوا مگر دوسرا جذبہ اشتعال کا تھا۔ مجھے اس شخص سے نفرت محسوس ہو رہی تھی بھی میں نے اسے خون دینے سے انکار کر دیا۔ صرف خون ہی نہیں بلکہ میں نے کئی بار بڑی سنجیدگی سے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا یہ شخص اس لڑکی کا شوہرا جس سے میں محبت کرتا تھا۔ اسے تکلیف پہنچتی تو اس کی آنکھیں نم ہوتیں یہ مر جاتا تو وہ بھی..... اس سے

لیے بحال تھا۔

ہفت ماہ میں نے اپنے رویے کی تلافی کر ڈالی مگر فارحہ کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو مجھے اندر ہی اندر میں ڈال رہا تھا۔ وہ بولتی تو اس کی نگاہیں جھکی ہوتی تھیں اور بھی کئی ایسی باتیں تھیں جو مجھے شک میں رہی تھیں۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھے ایک فلرٹ سمجھتے ہوئے وہ اپنی فیملی کو مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ میں ہر ایک کا ہٹنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا مگر فارحہ کے معاملے میں میں سو فیصد پر یقین ہوں۔ اسے شروع سے ہی دل کا حال چھپانا نہیں آیا تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے دل کا حال مجھ سے چھپا لیتی۔

بات اگر میرے ان شبہات تک محدود رہتی تو مجھے ٹھیک تھا۔ مگر بات یہ ہوئی کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا پچہن میں بیٹھا اپنے دل کو ایسی باتیں سوچنے پر ٹوک رہا تھا جب فون کی بیل بجی۔

میرا دل اس وقت کوئی بھی کال ریسپونڈ کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے آپ کو یہ بات خوب اچھی طرح بھالنے کے بعد کہ فارحہ تو یہ فارحہ داؤد حسن بن کر قطعی طور پر پرانی ہو چکی ہے۔ میں نئے سرے سے اندر ایک خالی پن سا محسوس کرنے لگا تھا اور یہ خالی پن مجھے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے بے دلی سے فون ریسپونڈ کیا مگر یہ دل بڑی جلدی ایک انہونی سی مسرت سے بھر گیا۔ میں ساتھ ہی ساتھ روٹھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا کڑیوں سے کڑیاں مل رہی تھیں۔ واقعات سے واقعات نہ لگے تھے۔

مام کے جانے کے بعد میں نے اسے روک لیا اور جان بوجھ کر ایسی باتیں شروع کر دیں جو اسے سچ ہاں کتا میں اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ میرے کیمین سے چلی گئی ہے اور جانے سے پہلے اپنے اور داؤد حسن کے کاراز کو کیا فاش کرتی یوں ہوا ہے کہ وہ جاتے جاتے اپنی آواز کا دکھ میرے ارد گرد چھوڑ گئی ہے۔

دراصل میں اور وہ..... ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے کبھی وہ چوہا درمیں بلی تو کبھی وہ بلی اور میں چوہا..... ہم دونوں کو اپنا اپنا بھرم قائم رکھنا تھا سو اس نے داؤد حسن سے (نام معنوی) قائم کر لیا اور یہ جان لینے کے بعد کہ اس کی زندگی میں اب میری کوئی گنجائش نہیں، میں ”کیمین“ نام کا ایک فرضی کردار گھڑ لیا ابھی کچھ دیر قبل میرے کیمین میں جو فون آیا وہ داؤد حسن کی بیوی کا

”میں..... ڈاکٹر اسود ابراہیم احمد آج خود کو دنیا کا سب سے بڑا چغہ محسوس کر رہا ہوں۔ کتنے آرام میں نے ڈاکٹر علیہ کی بات کو سچ تسلیم کر لیا اور وہ فارحہ..... بہر حال میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنا ساری زندگی میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی ہے اور وہ ہے فارحہ تو یہ جسے اب جلد ہی فارحہ اسود ہوا ہے۔

مما آج صبح تک بڑی بے بسی محسوس کر رہا تھا مگر اب بے حد خوش ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کہ اپنی خوشی کو

لفظوں میں کیسے ڈھال دوں۔ مگر ایک خلش بھی ہے میں نے اسے دکھایا اور ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ جو سچائی میرے لبوں تک آئی ہے اسے وہ بھی تسلیم کرے۔ بہر حال مجھے کوئی شکایت نہیں ہے تو میرے اس خوشی کو حاصل کرنے کا موقع دیا ہے مجھے اور میں اس موقع کو قطعاً نہیں گنواؤں گا۔

اور میرے کہن کے باہر گلاس ونڈو سے اس پار ایک شام ڈوبنے کے قریب ہے مگر اس شام کے ڈوبنے سے پہلے مجھے اس تک پہنچنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے ٹھانیں ہے۔ وہ مجھ سے ہنسنے بھی نہیں ہے بلکہ وہ اس "ایک پل" کی تاریکی سے نالاں ہے جو ہمارے درمیان آیا اور مستقل ہو گیا۔

میں اسے اپنے ساڑھے پانچ سال کا وہ ہر پل گنواؤں گا جو میں نے اس کی یاد کے سہارے برسرِ اکا اے کھودینے پر خود کو لامتناہی کیا۔

میں اسے اپنی ہتھیلیاں دکھاؤں گا جن کی لکیریں فقط اس کے نام سے روشن ہیں۔ پھر میں اس کی ہتھیلیاں اسے دکھاؤں گا جن پر میرے نام کا اجالا ہے اور زندگی کا کوئی بھی پل مستقل نہیں ہوتا بلکہ یادیں اسے مستقل کر دیتی ہیں۔ ہمارا "وہ پل" روشن تھا اور آج بھی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ پر یقین کرے گی کہ محبت بذاتِ خود بہت بڑا یقین ہے۔

ایک پر یقین مسکراہٹ لبوں پر سجائے میں میز سے کار کی چابی اٹھانے کو پلٹا تھا۔ جب ڈاکٹر صائم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"آج کوئی خاص بات ہے کیا؟" اپنے ہی خیالوں میں گم مجھے ان کی آمد کی خبر نہ ہو سکی تھی۔

"کہیں عید تو نہیں؟"

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تو وہ اطمینان سے بولے۔

"نہیں دراصل آج آپ مسکرا رہے ہیں نا تو میں نے سوچا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔" ان کے اس قدر معصومیت سے کہنے پر میں جھینپ گیا۔ میری سنجیدہ طبیعت کی بنا پر انہوں نے لطفدارانہ کڑا کڑا مسود عید پر ہی مسکراتے ہیں۔

میں نے چابی اور سیل فون اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا تو پیچھے سے وہ بولے۔

"میں تو تمہارے پاس ایک کام سے آیا تھا۔ مگر تم تو جلدی میں لگتے ہو۔"

میں ان کی جانب پلٹا اور خوشگوار بیت سے مسکرا دیا۔

"صرف جلدی؟..... میں بہت جلدی میں ہوں صائم! وہ دیکھو کھڑکی کے باہر ایک اور شام ڈوبنے کو ہے اور اس شام کے ڈوبنے سے پہلے مجھے کسی کو سحر کی نوید دینی ہے۔"

میرے اس بہم سے جواب پر ڈاکٹر صائم نے خاصی حیرانی سے مجھے دیکھا اور میں مسکراتا ہوا انہیں سے باہر نکل گیا۔

ن کاغذ

اس نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرنا چاہا پھر شانوں کے گرد پڑی مثال بہار مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹا اور لکڑی کا منقش دروازہ دھکیل کر باہر آ گئی۔ نرم ہوا کا سرد جھونکا چہرے پر کپکپانے پر مجبور کر گیا تھا۔ ناک میں جیسے مچھلی سی گھل گئیں۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ناک رگڑ کر ہزارت پہنچائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف آ گئی۔

کمر کی موٹی سی سیٹ لان کے آخری کونے تک پھیلی ہوئی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے گیٹ کھول لی۔ پھر بیٹھے ولید قاسم نے اسے کئی قدر حیرانگی سے دیکھا پھر جب وہ پورچ میں کار لاک کر رہا تھا تو وہ بند کر کے اس کی طرف آ گئی۔

"تم کب آئیں؟" اس نے پہلے خوشگوار سی حیرت کے زیر اثر پوچھا پھر گیٹ کی طرف دیکھا۔

"اور چوکیدار کہاں ہے؟"

"میں شام میں آئی تھی شعیب بھائی کے ساتھ اور چوکیدار کی بیوی بیمار ہو گئی ہے۔"

"اکیس تو میں بیوی کو پسند نہیں کرتا ہر دوسرے روز بیمار ہو جانے والی صنف۔"

اس کے پیچھے آتے ہوئے ولید نے افسوس سے اظہار رائے کیا تو وہ جو منقش دروازہ کھول رہی تھی مٹا کر دروازہ بند کر بولی۔

"ہیں..... لیکن تم سے کس نے کہا ہے کہ چوکیدار کی بیوی کو پسند کرتے پھر وہ۔" پھر سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"مگر صائم! ولید قاسم! یہ ادھر ادھر کی تانکا بھجائی تمہیں ضرور پٹا کر چھوڑے گی۔"

"گھر سے خواہ مخواہ پیش ہمارے دشمن۔" وہ بے نیازی سے کہتا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا تو وہ بھی لپٹ لپٹا ہوا آئی۔

"گال بھی نہیں کنوار یوں کی کسی ہے کیا؟ جو ہم بیویاں دیکھتے پھر وہ بھی دوسروں کی..... تو یہ

توبہ..... خدا ہمیں اس کڑے وقت سے بچائے۔ ہم تو اپنی بیوی ہی ایسی لائیں گے جسے دیکھ کر.....
 ”دوسرے خوش ہوں..... ہے نا۔“ زیب نے فقرہ اچک کر مکمل کر دیا۔ ولید ایک ہلکے انداز میں
 جھینپا وہ بات کو کیا مفہوم دے گئی تھی۔

”بکومت..... بے جی سو گئیں؟“ ثانی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔
 ”ہوں سو گئیں۔“ وہ بولی ساتھ ہی بیڈ پر اچھالی جانے والی ثانی کی کچھ کرتے ہوئے اسے خفگی سے گھبرا
 تو وہ چڑانے والے انداز میں ہنس دیا۔
 ”کھانا گا دوں تمہارے لیے ولید؟“ ولید نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کوٹ کی جیب سے والٹ اور
 موبائل نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔
 ”تم کھا چکیں؟“

”ہوں، ماں جی کے ساتھ ہی کھالیا تھا۔“ اس نے سرسری بتایا پھر بولی۔
 ”چائیز رائس بنائے ہیں ساتھ میں.....“ ولید نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
 ”اف بس کرو یا! کہیں ایسا نہ ہو میں غدیہ بن جاؤں..... قسم سے پیٹ میں بالکل مچائش نہیں
 ہے۔“ پھر بولا۔

”یونو..... آج میں اپنی سیکرٹری کے ساتھ ڈنر پر گیا تھا۔“ شرٹ کے کف کھولتے ہوئے اس نے بہت
 راز داری سے بتایا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

”یہ تم اتنی بد ذوق سیکرٹریز کیوں اپناٹ کرتے ہو ولید؟“
 ”تاکہ میرے اچھے ذوق کی نشاندہی ہو سکے۔“ ترت جواب آیا۔
 ”ویسے میرے اسٹاف میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور با ذوق لڑکی ہے تجھی تو سب کی سب اپنے
 باس پر جان چھڑکتی ہیں۔“ اس نے فرضی کالر جھاڑے تو وہ مسکرا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
 ”یہ خوش فہمی آپ کو لے ڈوبے گی حضرت۔“
 ”جی نہیں حضرت کی کشتی میں سوراخ نہیں ہے۔“ وہ ایک دم اس کے اور دروازے کے چچ مائل
 ہو گیا۔

”کافی بتالا ڈینٹھ کر باتیں کریں گے مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔“
 ”نیند تمہیں نہیں آ رہی مگر مجھے آ رہی ہے نا۔ کچن کارسٹہ تمہیں معلوم ہی ہے لہذا اپنی مدد آپ کے تحت
 کام کرو۔“ وہ اسے ہٹا کر جانے لگی مگر وہ پھر سامنے آ گیا اور بے حد مسکین صورت بنا کر بولا۔
 ”اتنے دنوں سے اپنی مدد آپ ہی کر رہا تھا۔ اب آئی گئی ہو تو یہ کار خیر کرتی جاؤ بہت ساری دعامیں
 دوں گا میں تمہیں۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھوں سے اشارہ کیا تو وہ ہنس دی۔

”یہ دعائیں تم کل تک سنبھال رکھو۔ آج مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔“ ولید نے اس کی سیاہ بھنورا سی
 لہوں کو دیکھا پھر منہ بسور کر ایک طرف ہو گیا گویا جانے کی اجازت دے دی۔ زینب اس کے اس بچوں
 سے انداز پر بہت بے ساختہ ہنسی تھی پھر اس کے بال منتشر کر کے باہر آ گئی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی
 لہجے بچہ بنی تھی۔

”آج مجھے وحید بہت یاد آ رہے ہیں نجانے کیوں؟ ان کی رفاقت میں گزرا ہوا وہ ایک ماہ جو میرے
 راسخوں پر بھاری ہے مجھے لہجہ بہ لہجہ یاد آ رہا ہے۔ پتا نہیں انہیں دنیا سے جانے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔
 انہوں نے ساتھ جینے کی قسم کھائی اور نہ ساتھ مرنے کا کوئی وعدہ تمھایا۔ تجھی تو شاید اکیلے ہی چلے گئے ورنہ
 ایک ہیٹ میں، میں کیا کم زخمی ہوئی تھی۔ آج جب شعیب بھائی مجھے یہاں چھوڑنے آ رہے تھے تو میں
 انہیں اپنی جاب کے متعلق بتا دیا۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا بس خاموش رہے مگر میں جانتی ہوں کہ
 لہجہ یاد آ رہا ہے۔ ماں جی اور ولید بھی خفا ہوں گے مگر میں کیا کروں۔ آخر کب تک ان دونوں
 رول کے بیچ ڈوبتی رہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے روپے کی ضرورت ہے، یہ ضرورت تو شعیب بھائی،
 بہن بھائی، ماں جی وقتاً فوقتاً بنا کہے پوری کر دیتے ہیں مگر اب میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ کل کلاں کو
 لیا اگر روایتی بھائی بن بھی گئیں (خدا نخواستہ) تو ماں جی تو ہیں ہی جنہوں نے پچھو بھی یا ساس کی بجائے
 بالکل ماں کی سی محبت دی ہے پھر اگر کل کو ولید کی بیوی..... خیر آنے والا وقت تو ہر ایک کو ڈراتا ہے اور
 مائیں ہر ایک میں شامل ہوں۔ اب میں سو جاتی ہوں کیونکہ مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ کچن سے کھٹ
 لکی آوازیں آ رہی ہیں یقیناً ولید کافی بنا رہا ہو گا میرا خیال ہے اب اس کا بھی کوئی بندوبست کر ہی دینا
 ہے۔ ویسے وہ مجھے بے حد پیارا ہے بالکل وحید کی کار بن کا پی۔ بس یہاں سنجیدگی نہیں ہے۔“
 وہ کچھ اور بھی لکھنا چاہتی تھی مگر نیند کی دیوی کچھ ایسی مہربان ہوئی کہ وہ لاسیٹ بھی آف نہ کر سکی۔

+

”ولید! تمہیں خدا کا واسطہ ہے اب اٹھ بھی چکو۔“ چوتھی بار دروازے میں سے منہ نکال کر چیخنے کی
 بلے اس نے اندر آ کر کبل ہی کھینچ لیا اور یہ ترکیب ہمیشہ کی طرح کارگر رہی تھی۔
 ”تم ہمیشہ بد صورت دلن کی طرح اٹری دیا کرو زینب خاتون۔“ نیند سے جو بھل آواز میں وہ جھنجھلا کر
 بڑھ گئی۔

”اب کیا کیا میں نے؟“ وہ مسکراہٹ دبا کر کبل سمیٹنے لگی۔
 ”کیا کیا؟“ وہ اٹھ بیٹھا پھر انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے بولا۔
 ”سارے ہی شادی اچھی طرح سے ہو گئی۔ اب تو بس میں اپنی دلہن کا گھونگٹ اٹھانے ہی والا تھا کہ تم

فک پڑیں۔“

”ہا ہا ہا..... تم اور تمہارے خواب۔“

”کیوں کیا خرابی ہے میرے خواب میں۔“ وہ لڑنے کو تیار تھا۔

”معاف کر دیجئے، کوئی خرابی نہیں ہے تمہارے خوابوں میں۔“ وہ بولی۔ ”میں یہ کہہ رہی تھی کہ۔“

”کہ تم ناشتا تیار کر چکی ہو۔ میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آ جاؤں اور دیر کرنے کی صورت میں مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملے گا۔ یہی نا۔“ ولید نے تائید طلب نظروں سے اسے دیکھا پھر جھکے سے کمرہ ہوتے ہوئے بولا۔

”تم چلو میں پانچ منٹ کی بجائے چار منٹ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔“ پھر اپنے کہنے کے مطابق چار منٹ میں ہی آیا تھا تب تک وہ اور ماں جی ناشتا شروع کر چکی تھیں۔

”تم آفس کتنے بجے جاؤ گے ولید؟“ ولید جو اخبار سامنے پھیلائے جلدی جلدی ہیڈ لائنز پر نظر دوڑا رہا تھا سراٹھا کر اسے دیکھا پھر اخبار ایک طرف ڈال کر آلیٹ والی پلیٹ اپنے آگے تھمھٹ لی۔

”جتنے بجے روز جاتا ہوں..... کیوں؟“ اس نے بتا کر پوچھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ ولید نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا۔

”آفس.....؟“

زینب مسکرائی ابھی وہ اسے لاہور آنے کا مقصد نہیں بتانا چاہتی تھی۔

”نہیں۔ آفس تم اکیلے ہی جانا مجھے کہیں اور جانا ہے۔“

”ہوں یعنی لفٹ چاہیے۔“ وہ اثبات میں مسکرا دی پھر جب وہ چائے کا آخری سپ بھی مٹا مٹا

چکا تو اٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا ماں جی! میں جارہا ہوں۔“

”اور میں بھی۔“ زینب بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماں جی نے بہت شفقت سے دونوں کے سر پر ہاتھ

پھیرا تھا اور نصیحت بطور خاص ولید کو کی تھی۔

”جی ماں جی! میں سلوڈرائیو یہ کروں گا اور پھر یہ جانشین ہے نا آپ کی میرے ساتھ۔“

اس نے زینب کی طرف اشارہ کیا تھا اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے باہر نکلے تھے۔

”کہاں ڈراپ کروں تمہیں؟“ مین روڈ پر آتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

”ڈی پی ایس کے سامنے۔“ زینب نے حتی المقدور سرسری انداز اختیار کیا تھا۔ اس کے باوجود

چونک گیا۔ ایک نظر اسے دیکھا پھر وڈ اسکرین سے باہر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”ڈی پی ایس..... اسکول؟“ زینب نے سر ہلا کر اس کے شک پر تصدیق کی مہر لگا دی۔

”میری معلومات کے مطابق تو تم ہسٹری میں ماسٹرز کر چکی ہو پھر یہ یکا یک زمری میں ایڈمیشن لینے کا بل کیوں آیا تمہیں؟“ اس کی شرارت کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے جاب مل گئی ہے ولید اور آج ہی سے جوائن کرنا ہے۔“ اسے پتا تھا کہ یہ بات ماں جی کی طرح بدکڑی بری لگے گی۔ انہیں تو وہ کسی طرح راضی کر ہی چکی تھی اور اب اپنی بات کا رد عمل اس کے چہرے پر

اُبھر چکا تھا۔ ”تم.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر فوراً ہی لب بھینچ کر نظریں باہر نکا دیں۔ آنکھوں میں

ان درشتی اور خفگی جیسے تاثرات نظر آ رہے تھے کار کی اسپڈ بھی غیر معمولی حد تک بڑھادی گئی تھی۔ زینب

زبان کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ اگرچہ اسکول میں پہلا دن تھا مگر

یہ اس کا ذہن ولید میں اٹکا ہوا تھا سودہ کچھ بھی ڈھنگ سے نہ کر پائی۔

واپسی اسکول دین سے ہوئی تھی۔ ولید کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی سودہ ماں جی کے کمرے میں آ

لاوا اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔ یہ مسکراہٹ غالباً ان کی شخصیت کا حصہ تھی کیونکہ ولید کو دیکھ کر بھی ایسی ہی

طراوت کی کرنیں ان کے ہونٹوں پر دکھتی تھیں۔

”کیا رہا اسکول کا پہلا دن۔“

”جی بس ٹھیک رہا۔“ وہ ٹکان زدہ سا جواب دے کر ان کے ساتھ ہی کمرے میں گھس گئی۔ ماں جی نے

ناہت سے اس کی پیشانی سے ہال سمیٹے تھے۔

”تھک گئی ہوتا۔“ وہ واقعی تھک گئی تھی مگر ان کا خیال کرتے ہوئے ہنس کر نفی میں سر ہلا دیا مگر ان کی

ٹانگیں ہوتی تھیں۔

”اسی لیے تو میں تمہیں روک رہی تھی آخر ضرورت ہی کیا ہے تمہیں نوکری کی؟“

”مگر میں فارغ رہ رہ کر میں بہت بور ہو چکی ہوں ماں جی! پچھلے سال تک تو پڑھائی تھی مگر اب.....“

لیکچر آؤٹ آؤٹ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”السلام علیکم ماں جی!“ اس نے بڑی سنجیدگی سے آکر ماں جی کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

”آج تم جلدی کیسے آ گئے ولید۔“ اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے کسی قدر تشویش

صدر بافت کیا تھا۔ وہ کرسی تھمھٹ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کچھ خاص وجہ نہیں، ذرا سر میں درد تھا۔“

”تم کپڑے بدل لو تب تک میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔ اس کے بعد چائے پی کر کچھ دیر کے لیے سو

ہاؤ اور ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ بیٹھے ماں جی! میں گرم کر لیتی ہوں۔“ زینب نے روکنا چاہا تو وہ بولیں۔

”تم بھی تو تھکی ہوئی ہو۔“ وہ باہر نکل گئیں۔ زینب جو کچھ سوچ کر رک گئی تھی پہلے بند روڑے کو دیکھا پھر اسے۔

”میں بھی تم سے بڑی ہوں کبھی مجھے بھی سلام کر لیا کرو۔“ ولید نے اسے خفگی سے گھورا تو وہ جو فی دبا ئے بیٹھی تھی یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اسے ہنستے دیکھتا رہا پھر باہر جانے لگا تو وہ ایک دم اس کے سامنے آ گئی۔

”خفا ہو؟“ اگرچہ معلوم تھا پھر بھی ڈور کا سرا کہیں سے تو پکڑنا ہی تھا۔ ولید نے جواب دینے کی بجائے سینے پر بازو باندھ کر اپنی گہری نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں جن میں خفگی بھی تھی تا سفا بھی۔

”تم میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو ولید، میں.....“ اس نے توقف کیا۔

”میں گہر بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں۔“ اس نے اپنی بے بسی کا اظہار یوں ہی مناسب سمجھا۔ ولید اسے دیکھتا رہا پھر پچھلے صحن کی طرف کھٹنے والی کھڑکی میں جا رکا۔

”بوریت دور کرنے کے اور بھی سو ہزار طریقے ہیں۔“ اس نے رک کر ایک ہی پل میں جیسے سارے حالات کا جائزہ لیا۔ وہ زینب کو بہت حد تک سمجھنے لگا تھا تبھی بولا۔

”بور ہو جاتی ہو تو میرے ساتھ آفس چلو۔ مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کی لڑکیاں یوں نکلے نکلے کی نوکریاں کرتی پھریں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”نکلے نکلے کی نوکریاں۔“ اسے جیسے جملے کے اسی حصے پر اعتراض تھا۔ ”وہ لوگ مجھے بہت اچھی پے دے رہے ہیں ولید۔“

”اچھی پے۔“ اس نے دوہرایا پھر طنز سے بولا۔ ”کتنی دے رہے ہیں۔ تین ہزار، چھ ہزار یا اس سے بھی کچھ زیادہ؟“ زینب جھنجھلا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی بات اسے سمجھا نہیں پار ہی تھی۔ ولید نے اسے الجھن میں دیکھا تو اس کے سامنے بچوں کے بل بیٹھ گیا۔

”ہمارا بزنس میں نے اور وحید بھائی نے مل کر شروع کیا تھا زینب! لہذا تمہارا حق بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ میرا..... اب اگر تم جاب ہی کرنا چاہتی ہو تو آفس آ جایا کرو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ تمہیں تمہاری انٹی سیدھی سوچوں سے بھی نجات مل جائے گی۔“ وہ جیسے اس کی چوری پکڑتے ہوئے مسکرایا۔ زینب کی نظریں گود میں رکھے ہاتھوں سے نہیں ہٹی تھیں۔ ولید نے کچھ دیر جواب کا انتظار کیا پھر دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر اس کا سردائیں بائیں ہلا دیا۔

”سن رہی ہو یا نہیں؟“

”سن چکی ہوں۔“ اس نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹکا ولید مسکرایا۔

”سمجھی بھی ہو یا.....“

”سمجھتی ہوں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ولید اپنے گھٹنوں پر ہتھیلیوں سے بوجھ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چھوٹا کیا سمجھی ہو؟“ متبسم و شریر لہجے میں اس نے دریافت کیا۔

”یہی کہ تم بہت بڑے ہو گئے ہو اور نصیحتیں کرنے لگے ہو۔“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بے بولی تھی۔ ولید ہنستا ہی چلا گیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

”ہنستا رہا کرو زینب اچھی لگتی ہو۔“ وہ اپنی پیاری سی دوست کو بہت پیار سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”ظاہر ہے میں اچھی ہوں تو اچھی ہی لگوں گی نا۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر اور ایک شان بے نیازی سے ابراہر نکل گئی۔ ولید وہیں کھڑا سوچتا رہا پھر مسکرایا اس رات وہ اپنی ڈائری میں لکھ رہا تھا۔

”مجھے لفظوں سے کھلانا نہیں آتا صرف اتنا کہوں گا کہ اس کی مسکان بہت خوب صورت ہے شاید اس کی وہ مسکراہٹ ہی تھی جب پہلی بار میرے دل نے اسے حاصل کرنے کی تمنا کی تھی۔“

+

شام بڑی اچلی سی تھی۔ گزشتہ دنوں کے برعکس آج کہہ نے اپنے پتکھ نہیں پھیلائے تھے اس کے باوجود

ابا بے حد کر کے دار تھی۔ ماں جی، عبدالکریم کو ساتھ لگائے گندم اور خشک میوہ جات ملا کر نشاستہ تیار کر

نہیں۔ ان کے خیال میں یہ گاؤں کی خاص سوغات تھی جو انہوں نے اپنی دادی سے سیکھی تھی۔ وہ فی وی

مانے بیٹھی تھی جس پر کوئی گیتوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ ایک نظر سرکین پر ڈالتی دوسری ہاتھ میں پکڑی

ب پر اور ساتھ ہی ساتھ مونگ پھلی سے لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔ ولید ابھی سو کر اٹھا تھا۔ میز ہیاں

ٹاٹے دیکھا تو وہیں اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”السلام علیکم۔“ آواز میں ابھی بھی نیند کا اثر تھا۔

”ولیم السلام۔“ زینب نے اسے دیکھا پھر وال کلاک کو۔ ”یہ کوئی وقت ہے اٹھنے کا۔“

”آج سنڈے ہے۔“ اس نے دیر سے اٹھنے کی اپنے تئیں معقول وجہ بتائی تو وہ مزید ڈپٹ کر بولی۔

”سنڈے ہے نہیں بلکہ تھا شام کے پانچ بج رہے ہیں اس وقت۔“

”یہ تم کیا پڑھ رہی ہو؟“ اس کی بات ان سنی کر کے وہ اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھنے لگا۔

بہن نے اسے گھورا تو پھر کتاب جھپٹ لی۔

”تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔“

”مجھے سمجھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔“ اس نے ناگواری سے ناک سیکڑ کر کہا۔

”اس کتاب کا نام ہی اس قدر خوفناک ہے کہ بندہ محبت سے ہی گھبرا جائے، اودہ گاؤ۔“

”محبت مردہ پھولوں کی سمفنی۔“ یہ کوئی نام ہے۔ ایک تو محبت پھر پھول وہ بھی مردہ اور یہ سمفنی کیا

بلا ہے؟ نجانے یہ اردو رائیٹرز کس قسم کے نام رکھتے ہیں۔ اب یہ دیکھو۔“ اس نے میز پر پڑی کتاب اٹھائی۔

”قربت مرگ میں محبت..... قربت مرگ.....“ یہ لفظ اس نے زیر لب دوہرایا تھا پھر سر کھچا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ قربت کیا ہوتی ہے؟“

”تمہارا سر ہوتی ہے۔“ زینب نے کتاب کھینچ لی۔

”اب خدا کے واسطے میرے سر کی شان میں قصیدے نہ پڑھنا بس جلدی سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ نا مارکیٹ تک جانا ہے۔“

”میں نہیں جا رہی۔“ زینب نے خفگی کے اظہار کے طور پر چہرے کے آگے کتاب کھول لی مگر ولید نے کتاب چھین لی۔

”خواتین وہ نہیں جا رہی..... بس اب میں ایک لفظ نہیں سنوں گا فوراً سے پیٹھ اٹھ جاؤ۔“

وہ رعب سے بولا اور اس رعب میں استحقاق تھا۔ زینب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ ولید کے دوست کی شادی تھی جس کے لیے اسے گفٹ لینا تھا تبھی چوٹس کے لیے اسے لے آیا تھا۔ گفٹ خرید کر وہ اس کے ”ننہ“ کے باوجود مارکیٹ سے منسلک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں سوپ پلانے لے آیا تھا۔ منیو کارڈ پر نظر دوڑانے سے پہلے ہی وہ اپنا فیورٹ سوپ آرڈر کر کے بیٹھ گیا پھر نگاہ نجانے کہاں گئی تو ”میں ابھی آیا“ کہہ کر کچھ فاصلے پر موجود ٹیبل کی طرف چلا گیا وہاں ایک بے حد خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔

”زینب یہ فاطمین ہیں۔“ ولید نے تعارف کر دیا تو زینب نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا وہ لڑکی خوب صورت ہونے کے ساتھ ہی خوش اخلاق و خوش گفتار بھی تھی۔ زینب کو اندازہ ہوا کہ وہ اور ولید آپس میں کافی فریک ہیں۔

”اچھا بھئی میں تو اب چلتی ہوں۔“ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی زینب نے ساتھ سوپ پیچے کی دعوت دی تو بولی۔

”ڈیوڑھا بھی تو میں اپنے کزن کے ساتھ آئی ہوں ابھی بھی وہ وہاں تنہا بیٹھا مجھے گالیاں دے رہا“

”گا۔“

”اسے بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔“ ولید کہنے کے ساتھ ہی اٹھ کر چلا بھی گیا تھا فاطمین اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ واپسی تک زینب کے ذہن میں ایک سوال کھد بھجنا تھا کہ ابھی جب ولید نے گاڑی فرسٹ گیسر میں ڈالی تو بولی۔

”بہت اچھی لڑکی ہے فاطمین..... ہے نا۔“

”ہم اچھے تو ہمارے فریڈز بھی اچھے۔“ اس نے فرضی کالر جھاڑے۔ زینب نے ایک چپت اس کے ذہن پر سیدھی تھی تو وہ ہنسنے لگا۔

”ہاں سنو میری ولید! ماں جی اب تمہاری شادی کر دینا چاہتی ہیں۔“

”ہاں تو ضرور کریں میں نے کب منع کیا ہے؟“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا زینب پر جوش انداز میں اس نے گھوم گئی۔

”کوئی لڑکی ہے نظر میں؟“

”صرف ایک..... بھئی بہت ساری ہیں۔“ آنکھوں میں شرارت ہنسنے لگی تھی۔ زینب کا جوش صابن کی کی طرح بجھ گیا۔

”سنجیدہ ہو جاؤ ولید! ماں جی واقعی یہ بولا نا چاہ رہی ہیں۔“

”پارسل سو فیصد سنجیدہ ہوں ماں جی حکم تو کریں میں ان کے قدموں میں آج ہی یہودوں کا ڈھیر لگا“

”مجھے نالے کی کوشش مت کرو..... سچ بتاؤ فاطمین ہے نا وہ۔“

”کیا غضب کر رہی ہو زینب! وہ صرف میری دوست ہے۔“

”وہ تو ہی محبت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔“ ولید نے یک دم گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”اب کیا تکلیف ہے؟“ وہ چڑ گئی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ ولید نے نفی میں گردن ہلا کر نظریں واپس باہر نکا دیں۔ زینب تپ کر باہر دیکھنے لگی اور اسے اظہار کے طور پر وہ باقی کا تمام راستہ خاموش رہی تھی۔ ولید خود ہی بولتا رہا۔ اس کی خاموشی پر اس کا ہاگم وہ خاموش رہی مگر پہنچ کر وہ بغیر کچھ کہے فوراً کار سے اتر جانا چاہتی تھی مگر ولید نے پکارا تو ٹال بٹنے نہ کچھ کہا اور نہ پلٹی۔

”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے زینب۔“ اسٹیرنگ پر دونوں ہتھیلیاں جمائے وٹا اسکرین سے باہر پورچ پر کی ان دیکھے ذرے کو کھوجتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ زینب ایک پل کو تھکی پھر اس بات کو انگھوستہ انداز کرتے ہوئے وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئی۔

”کچھ؟“ چہرے پر اس وقت حد درجہ سنجیدگی تھی۔ ولید نے گردن موڑ کر اس کی صورت دیکھی پھر جھجکے غلامی بولا۔

”تم..... خفا تو نہیں ہو گی؟“

”نہیں تم کہو۔“

”آں..... اچھا رہنے دو۔“ وہ اپنی جانب کا دروازہ کھول رہا تھا۔ زنب نے ایک دم اس کا بازو پکڑ لیا۔

”نہیں مجھے بتاؤ۔“ ساری سنجیدگی ہوا ہو گئی تھی۔ اب وہاں فقط تجسس ہی تجسس تھا۔ ولید نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”تم خفا ہو جاؤ گی زنب۔“ وہ بے بسی کے سے انداز میں اسے تنبیہ کر رہا تھا وہ ایک دم بولی۔

”نہیں میں خفا نہیں ہوں گی تم کہو۔“

”وہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....“ اس نے توقف کیا زنب کا تجسس انتہا کو چھونے لگا۔

”مکرم“ ”ذل“ مکرمت پہنا کر دھوئی لگتی ہو۔ اپنا جملہ کھل کرتے ہی وہ منہ چاڑھ کر ہنسنے لگا تھا۔ زنب کے اعصاب ایک پل کو ڈھیلے پڑ کر تن گئے۔ اسے اس قدر احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی ذہن میں تو اس کی شادی گھوم رہی تھی لہذا ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر اتر گئی ولید نے روکا بھی نہیں کیونکہ وہ ہنسنے میں مصروف تھا۔

+

چمکدار دھوپ کی حدت جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ بیرونی دیوار سے لپٹی بوگن ویلیا بھی بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ دھوین چڑیا کے ساتھ مل کر قمریوں نے ایک اودھم سا چاڑھ کھا تھا۔ زمردیں بیزہ گھر کر عربی چھب دکھلا رہا تھا اور ایسے میں لان کے پتوں بیچ کین کی سفید کرسیوں پر برابر اجمان ولید قائم کیوں سے مشغل فرماتے ہوئے بہت سنجیدگی سے کسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ زنب کے ساتھ عبدالکریم کو آتادیکھ کر اس نے موضوع بدل دیا۔ عبدالکریم غیر معمولی طور پر چپ تھا بلکہ سنجیدگی سے منہ پھلائے ہوئے تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ ماں جی نے پوچھا۔ وہ مڑے نیل پر پختے کے سے انداز میں رکھ کر سیدھا ہوا پھر دونوں بازو دھر کر رکھ کر ایک خفگی بھری نگاہ زنب پر ڈالی۔

”یار عبدال! یہ گھوریاں بعد میں ڈال لیتا پہلے یہ بتاؤ کدو کے جیسی شکل کیوں بنا رکھی ہے۔“

”آپ کو پتا ہے سر جی! یہ باجی جی کل جا رہی ہیں اپنے پانی جان کے گھر۔ پوچھیں ماں جی! کیوں جا رہی ہیں اتنی جلدی۔“ شکایتی سے انداز میں وہ ماں جی کی طرف گھوما۔

”میرا جانا ضروری ہے عبدال اور پورے تین دن سے میں یہیں تو ہوں۔“ زنب نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ پندرہ سولہ سال کا یہ لڑکا ماں جی نے جزوقتی کام کاج کے لیے رکھا ہوا تھادس سال کی عمر میں وہ اس گھر میں آیا تھا اور اب تک بہت کھل مل گیا تھا۔ زنب کے سمجھانے کے باوجود وہ ہنوز خفا شکل بنائے اندر کی طرف چلا گیا تو ماں جی بولیں۔

”ایک تو پہلے ہی اتنے دنوں بعد آتی ہو پھر جانے کی بھی جلدی ہوتی ہے۔ کتنی بار کہا ہے میرے ہی مکررم سختی ہی نہیں ہونے۔ میرا دل نہیں لگتا زنب۔“

”میرا بھی.....“ کسی کے دل میں گونج ابھر کر لیوں پر خفیف سا قسم بکھیر گئی تھی۔ زنب نے بڑے پیار لائی کے گلے میں بازو حائل کر دیے۔

”پاؤدھ اگلی بار آؤں گی تو آپ کے پاس بہت دن رہوں گی ابھی میرا جانا ضروری ہے۔ وہاں باں میں تینہ بھابی میرے بغیر تنہا ہو جاتی ہیں اور اب کل سے بخار میں پھنک رہی ہیں تبھی شعیب بھائی نے فون کیا ہے۔“

”کتنی تو تم بھی ٹھیک ہو۔ تنہائی بڑا عذاب ہے اور بڑھاپے میں تو ویسے بھی گھٹے صدیاں بن جاتے۔ ولید تو سارا دن آفس میں ہوتا ہے شام میں دوستوں کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ خالی گھر مجھے تو کاٹنے کو روزتا ہے۔“

”اواس مت ہوں ماں جی! آپ کہہ رہی تھیں تاکہ اب ولید کی شادی ہو جانی چاہیے تو یہ بہت بوقت ہے اس کی شادی کے لیے۔ اس کے بعد آپ ایک درجن بچوں کی دادی بن جائیں گی ساری اتم ہو جائے گی..... کیوں ولید؟“ وہ ان کی افسردگی ختم کرنے کے خیال سے بولی تھی ساتھ ہی اسے ہالنگھو کیا تھا۔

”اے صرف ایک درجن ہی کیوں؟ میں تو دو درجن کا ارادہ کئے بیٹھا ہوں۔“

”مکرم کرو۔ ماں کے سامنے اس قسم کی بات کرتے حیا نہیں آتی؟“ انہوں نے ڈپٹا تو وہ کرسی ان کے قریب گھسیٹ لایا۔

”میں تو صرف آپ کی وجہ سے کہہ رہا تھا ورنہ مجھے تو آدھ درجن بھی کافی رہیں گے۔“ اس کا انداز لڑکھاتا تھا۔

”تم بچوں کو ہم ماں باپ کی خوشیاں کا احساس ہوتا ہی کب ہے۔“

”اے.....“ وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا۔

”ایک وہ حیدر ہے۔ ایسا بیوی اور بیٹی، بیٹا کے ساتھ جا کر دینی بسا کہ ماں کو ہی بھول گیا۔ اتنا نہیں ہوتا لہال دوسال بعد آ کر بوڑھی ماں کو صورت دکھا جائے۔ مرحوم باپ کی قبر پر دو حرف فاتحہ کے ہی پڑھ کر وہ قلعے پچ در پچ کھوٹی ہی جا رہی تھیں۔ ابھی مزید ارادہ تھا مگر عبدال نے ان کی تندہ کے فون کی بابت لٹاؤ انداز میں گیس تو وہ افسردگی سے بولی۔

”دیکھاں جی، کتنی تنہائی محسوس کرنے لگی ہیں۔“

”میں دیکھا۔“

”تم واقعی شادی کرو لو ولید! بہو کے آنے سے کم سے کم ماں جی کی تہائی تو دور ہوگی۔“

”اچھا۔“ زنب نے تھوڑا لچھ کر اسے دیکھا۔

”تم واپس کب جا رہی ہو۔“ اس نے پوچھا تھا۔

”کل شام کو۔۔۔۔۔ شعیب بھائی آرہے ہیں لینے۔“

”ہوں۔“ وہ کچھ ہل خاموش رہا پھر بولا۔

”تمہیں پتا ہے ابھی ماں جی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ہماری زنب عام لڑکیوں جیسی بالکل بھی نہیں ہے۔“

”ہیں۔۔۔۔۔ بھلا اس بات کا کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم میں عام لڑکیوں والے گیس تو سرے سے ہیں ہی نہیں۔۔۔۔۔ سب لڑکیاں کتنی ہنس کر ہوتی ہیں۔ ہر دم ہنستی مسکراتی، شرارتیں کرتی ہوتیں جبکہ تم۔۔۔۔۔ اس نے ناگواری سے ناک سکڑی۔

”ہر وقت ہی سڑی بسی شکل لیے گھومتی ہو۔ ہنستی بھی ہو تو یوں گویا ہنسی ادھار لے رکھی ہو جسے سینت سینت کا استعمال کرنا فرض ہو۔“ زنب خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

”خیر سڑی بسی شکل تو نہیں ہے میری اور ہنستی بھی میں خوب ہوں۔ جہاں تک عام لڑکیوں والی بات ہے تو دو مہینے بعد میں پورے چھپیں برس کی ہو جاؤں گی اور اس عمر میں لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں یعنی سنجیدہ اور سوری۔“ اس نے آخری دو لفظوں پر زور دیا تو ولید بولا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ سنجیدہ اور سوری۔۔۔۔۔“ پھر کندھے اچکا کر بولا۔ ”ہمیں تو یوں بھی اس دادیوں والے اسٹائل میں اچھی لگتی ہو یعنی سنجیدہ اور سوری۔“ اس نے بھی آخری دو لفظوں پر ہی زور دیا تھا۔ زنب کا ہتھ بڑا بے ساختہ تھا۔ تعریف کا یہ انداز کوئی نیا تو نہ تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے ولید کے بال منتشر کرنا چاہے تو ولید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھیلی اپنے سامنے کھول لی اور کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ زنب نے بھی اپنی نگاہیں تھیلی پر جمائیں۔

”دیکھ رہا ہوں اس ہاتھ کی لکیروں میں میرا نام بھی ہے یا نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا مگر آنکھیں شرارت سے لبریز تھیں۔

”پھر مل گیا اپنا نام۔“ وہ بھی شرارت سے گویا ہوئی۔

”ہاں مل گیا۔“ ولید نے اس کا ہاتھ دونوں تھیلیوں میں جکڑ کر نگاہیں اس کے چہرے پر لگا دیں اور بولا۔

”زنب۔۔۔۔۔ مجھ سے شادی کرو گی۔“ ایک ہل اور اس ایک ہل میں آسمان پر موجود ستارے کی طرح دیکرے ٹوٹنے لگے۔ زنب تنگ سی اس کی صورت کے کئی شاید وہ مذاق کر رہا ہو۔ مگر وہاں مذاق تھا اور نہ

ابت ایک نرم سا تاثر تھا زنب نے ناگواری سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ اس کا خیال تھا کہ اسے یوں غصے میں دیکھ کر یقیناً وہ ہنس دے گا مگر وہ

”بکواس نہیں ہے لڑکی! پر پوز کر رہا ہوں میں تمہیں۔۔۔۔۔ کہو کر دگی مجھ سے شادی۔“

”بٹ اپ ولید۔۔۔۔۔ آئی سے جسٹ شٹ اپ۔“ وہ دھاڑی۔

”مگر تم مذاق کر رہے ہو تو یہ انتہائی گھٹیا مذاق ہے۔“

”مذاق۔۔۔۔۔“ اس نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی عقل پر افسوس کر رہا ہو۔

”مذاق نہیں ہے یہ زنب! میں سنجیدہ ہوں۔ شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے کیونکہ تمہیں چاہئے لگا ہوں۔“

”ہں۔۔۔۔۔“ زنب نے انگلی اٹھا کر روک دیا۔ ”بس ولید قاسم! اب آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔“ وہ

”زنب! امیری۔۔۔۔۔“ زنب جھٹکے سے اٹھی تھی اور پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھی۔ ولید نے اسے جاتے

”زنب! امیری۔۔۔۔۔“ زنب جھٹکے سے اٹھی تھی اور پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھی۔ ولید نے اسے جاتے

”زنب! امیری۔۔۔۔۔“ زنب جھٹکے سے اٹھی تھی اور پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھی۔ ولید نے اسے جاتے

”شکر ہے تم آگئیں پتا ہے میں تمہیں کتنا مس کر رہی تھی۔“ اسے چائے کا گک تھا کر تہینہ بھابی اس

”مہال آپ مس کرتی ہیں اور وہاں ماں جی۔“ وہ چائے کا بڑا سا سپ لیتے ہوئے مسکرائی۔

”صرف ماں جی؟۔۔۔۔۔ ولید بھی تو تمہیں مس کرتا ہو گا۔“ اسے لگا بھابی طنز کر رہی ہیں مگر ان کا انداز

”ہاں وہ بھی۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ آپ کی بیماری کا بتایا تھی آنے دیا اسٹیشن پر

”مہمت اچھا کیا تم نے جو آگئیں۔ اب کچھ دن اطمینان سے ہمارے ہی پاس رہو پھر تو وہیں رہنا

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ بھابی؟“ اب کے بھابی چونکیں بالکل ہی بے اختیاری میں کہہ گئی تھیں سو فوراً بات

”میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے زینی۔“ انہوں نے تجسس پھیلاتا جاہا اور نضب کے اندر خوف سا پھیل گیا۔

”کون سی خبر؟“

”آں.....“ بھابی نچلے ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے دیکھتی رہیں۔ اس پل بہت دُقریب مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

”تم پھوپھو بننے والی ہو۔“

”جج۔“ اس نے مارے خوشی کے چیخ ماری تھی۔ نو سال کی منتوں مرادوں کے بعد یہ خبر ملی تھی۔ بھابی ہنسنے لگیں۔

”سو فیصد جج۔“ نضب ان سے لپٹ گئی۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“ بھابی خوش ہونے کے ساتھ ساتھ شرمائی ہوئی بھی تھیں۔

”کیا نام رکھیں گی؟“

”ارے ابھی تو بہت وقت ہے۔“ وہ بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگی۔

”اتنی اچھی خبر اتنی دیر سے کیوں دی آپ لوگوں نے؟ کل جب شعیب بھائی کا فون ارے..... یاد آیا آپ کو تو بخار تھا نا۔“

”جھوٹ نہیں بولتے تو تم اتنی جلدی واپس کیسے آتیں۔“ وہ اپنے کارنامے پر خوش ہو رہی تھیں بھی فون کی بیل جج اٹھی۔ بھابی فون ریسیور کرنے چلی گئیں تو وہ چائے کے برتن دھونے لگی۔ ذہن محوم پھر کر پھر سے ولید قاسم میں جا اٹکا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پاری تھیں کہ اس کی بات نے غصہ دلایا ہے یا افسوس۔

”اے کہاں ہو؟“ بھابی نے اس کا کندھا ہلاتا تو وہ چونکی۔

”میں کب سے بول رہی ہوں مگر تم نجانے کہاں ہو۔“

”آں.....“ ہاں وہ اپنے بھتیجا بھتیجی کا نام سوچنے لگی تھی۔ اس نے بات بیانیہ در نہ حقیقت یہ تھی کہ اسے بھابی کے آنے تک کی خبر نہ ہوئی تھی۔

”کس کا فون تھا؟“

”شعیب کا۔“ بھابی نے بتایا۔

”کہہ رہی تھی لہجہ نام میں گھر نہیں آ سکیں گے کچھ ضروری کام ہے لہذا، ہم لوگ انتظار نہ کریں ان کا۔“ بھابی نے توجہ لے کر چڑھایا تو وہ ہنسی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گت گیا پھر جب وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں تو ایک بار پھر فون بجنے لگا۔

”دیکھنا ذرا کس کا ہے میں پانی لے آؤں۔“ بھابی کچن میں چلی گئیں وہ ٹیلی فون اسٹینڈ تک آ گئی۔

”ہیلو۔“

”کیسی ہو؟“ وہ خاموش رہی اگر وہ نہ بھی بتاتا تو وہ پہچان ہی لیتی۔ ”کچھ ہوگی نہیں؟“ وہ ”میں ہوں.....“

”اچھا ڈانٹ ہی دو۔“ وہ ابھی بھی خاموش رہی۔

”میں نے بہت اچھا کیا کہ ساہیوال چلی گئیں۔ اب میں جلدی آؤں گا تمہیں لینے باراتیوں کے۔“ وہ مسک کر رہ گئی۔

”نرود آنا باراتیوں کے ساتھ میرے جنازے میں شریک ہونے۔“ اس نے تڑخ کر فون شیخ دیا۔

”اتحاد میں ڈوب کر ابھر تھا۔ دماغ بس ایک پل کو ماؤف ہوا تھا اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

”کس کا فون تھا۔“ اسے آتا دیکھ کر بھابی نے پوچھا۔

”ولید۔“ وہ بیٹھ گئی اسے لگا بھابی سن کر مسکرائی ہیں اور یہ وہ ہم نہیں تھا وہ واقعی مسکرا رہی تھیں۔

”نضب! کیا خیال ہے تمہارا ولید کے بارے میں۔“ بھابی کا کھوجتا ہوا انداز اس کے سینے میں اتنی کی پست ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”تمہیں ولید نے نہیں بتایا؟“ انہوں نے بہت شریہ سے انداز میں اپنی ننگو دیکھا تھا۔ نضب کتنی ہی ہلکی نہ بول سکی۔

”کیا آپ سے ولید نے خود کہا ہے۔“ اسے اپنی آواز گہری کھائی میں گشت کرتی گونج سے مشابہ لگی

”نہیں اس نے تو کچھ نہیں کہا البتہ میں نے اندازہ ضرور لگایا ہے کہ تم اور وہ.....“

”بس بھابی.....“ اس نے انہیں ٹوک دیا بھابی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

”اگر ولید حقائق سر کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو

ما۔“ بھابی چپ سی رہ گئیں اس کے لہجے کی قطعیت نے انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

”لیکن نضب! اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ وہ تمہارا کزن ہے۔“

”وہ میرا پور ہے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”بہر حال میں ایسا کچھ نہیں چاہتی نہ آج اور نہ کل..... اور پلیز بھابی اس کے لیے آپ کو میرا ساتھ

ہلگا۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا اپنے اٹل فیصلے کے باوجود کوئی بات اسے اندر ہی اندر ہولائے دے

اٹا۔ بھابی نے اس کے چہرے پر گردش کرتے سائے کو دیکھا۔

”پوچھاں ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہاری مرضی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ اس نے سر ہلا دیا

”لیکن میں ہوا وہ سوچ رہی تھی بھابی نے اندازہ لگایا ہے اس سے پہلے کہ کوئی اور بھی لگائے مجھے کچھ کرنا

”دل کے معاملات میں عقل کا کیا کام؟“ معنوی تئیر سے آنکھیں پٹپٹا کر دریافت کیا گیا۔ بعض اوقات آپ وہ نہیں کر پاتے جو کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت وہ نہیں کر پار ہی تھی جو کہ وہ کرنا چاہتے تھے۔

”صرف اچھی؟“
 ”نہیں بہت اچھی ہے۔“ ڈسکوری پر والیوم سیٹ کرتے ہوئے ولید نے کہا۔
 ”لایب نام ہے اس کا۔ اگر تمہیں یاد ہو تو اس نے ایم بی اے تمہارے ساتھ ہی کیا تھا۔ میرے ہاں

”ہا۔۔۔ تمہارے جذبات۔“

”تم ختم اتنا بھڑک کیوں رہی ہو؟ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی کوئی غلط مطالبہ نہیں کیا۔ بتاؤ مجھے زینب! آخر کیا غلط ہے؟ میں تمہیں پسند کرتا ہوں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کوئی شرعی پابندی نہیں ہے پھر ازختم کیوں اعتراض کر رہی ہو؟“ وہ رکا مگر زینب کو خاموش پا کر کچھ سوچ کر بولا۔

”ہماری شادی کے متعلق میں کل ماں جی سے بات کرنے والا ہوں۔“

”تم ماں جی سے ایسی کوئی بات نہیں کرو گے۔“ زینب نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی تھی۔ ولید اس کی طرف مڑا۔ کچھ بل اس کے چہرے کو نگاہوں کی زد میں قید رکھنے کے بعد براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”میں وہی کروں گا جو میرا دل کہتا ہے اور تم مجھے روک نہیں سکتیں۔“ زینب کا سارا وجود آگ کی زد میں آگیا وہ جانا چاہتی تھی مگر رک گئی۔

”تم وہی کرنا ولید قاسم! جو تمہارا دل چاہتا ہے اور میں وہ کروں گی جو میرا دل چاہتا ہے روک تم بھی مجھے نہیں سکتے اور ہاں۔۔۔۔۔ وہ بچی۔“ یاد رکھنا ولید! میری مرضی کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ اب کی بار ولید کی نہیں تھی۔

+

ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی فائل بھی اس نے میز پر پینچ کر اٹھانے پر گرا دیا۔

عمر کیسے کئی ساری

دل نہیں لگ رہا فائلوں میں

اس نے حسب منشا شعر بکا ڈاؤن الجھا ہوا تھا کبھی ایک پہلو سامنے آتا تو کبھی دوسرا۔ وہ بہت اظہاری انداز میں دائیں ٹانگ ہلاتا تھا۔ بے چینی یوں ہی انسان کو مضطرب کر دیا کرتی ہے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنیں پھر انگلی کی پور سے اسے بجایا گیا تھا اس نے تھکے تھکے انداز میں سر اٹھایا۔

”ہائے فاطمین۔“

”ہائے پرنس۔“ وہ اندر آگئی تھی پھر اس کی شکل دیکھ کر جو ہنسا شروع کیا تو کتنی ہی دیر ہنستی ہی چلی گئی۔ ولید نے اسے ناگواری سے دیکھا اور دونوں تھیلیوں سے میز پر بوجھ ڈال کر آگے جھکا۔

”زہر لگ رہی ہو۔“ اس نے دانت کچکپائے فاطمین کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔

”کیا بنا تمہاری لڑائی کا؟“ وہ اپنی ہنسی پر قابو پاری تھی۔

”تم وہ رشتہ کیوں بھول رہے ہو جو ہمارے بچ ہے۔“

”میں کچھ بھی نہیں بھولا سب کچھ یاد ہے مجھے۔۔۔۔۔“

”اور وحید۔۔۔۔۔“

”وحید لالہ کے انتقال کو دو برس گزر چکے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا مگر پھر سے زینب نے ٹوک دیا۔

”اور اب تم چاہتے ہو کہ میں بھی مرجاؤں۔ ہے نا۔“ اس کی آواز غیر معمولی طور پر تیز تھی۔

”زینب۔۔۔۔۔“ ولید کی نگاہوں میں تاسف سمٹ آیا تھا۔ ”اسی موت سے تو بچانا چاہتا ہوں میں تمہیں،

حق لڑکی!“

”مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جس کے بعد لوگوں کی انگلیاں مجھ پر اٹھنے لگیں۔“

”بہت پرواہ ہے تمہیں لوگوں کی؟“ پہلی بار اس کے لبوں پر طنز چکا۔

”نہیں مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں ہے مجھے صرف اپنی پرواہ ہے اور میں نے تمہارے بارے میں کبھی ایسا

نہیں سوچا۔“

”تب اب سوچ لو اچھا خاصا ہینڈسم ہوں میں، اپنا بزنس ہے کوئی بری عادت بھی نہیں ہے مجھ میں،

لوگ چاند سورج سے تشبیہ دیں گے ہماری جوڑی کو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔“

”شرم نہیں آتی تمہیں اس قسم کی بکواس کرتے ہوئے۔“ وہ نفرت سے پونکھاری۔

”اب تک جسے بھائی سمجھتی رہی ہوں اسے شوہر بنانے سے بہتر ہے کہ میں ڈوب کر مرجاؤں۔“ ولید

کے لفظ کہیں اندر ہی ڈنگا گئے مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا۔

”ٹھیک ہے تم ڈوبنے کی تیاری کرو میں بہت اچھا تیراک ہوں۔“ ہونٹوں کے کونے یہاں سے

وہاں تک پھیل گئے۔

”خدا کے لیے میرا مذاق مت اڑاؤ ولید قاسم! آج تم ہنس رہے ہو کل کو پورا جہان ہنسے گا۔“ ضبط کی

کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے وہ گڑگڑائی تھی۔ آنکھوں میں جیسے کرجیاں بکھر گئی تھیں۔

”تمہیں صرف جہاں کی پرواہ ہے؟ میری نہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”لیکن مجھے کسی جہاں کی پرواہ نہیں

ہے چاہے ہنسے چاہے روئے۔ مجھے صرف تمہاری پرواہ ہے مجھے تم ہی سے شادی کرنی ہے اور میں کروں گا

بھی۔“ اس کا دونوک انداز زینب کو اندر تک سلگا گیا۔

”نہیں مسٹر ولید! تمہیں صرف اپنی پرواہ ہے کتنی تعریف کریں گے تاسب لوگ تمہاری کتنا عظیم کہیں

گے نا لوگ تمہیں کہ تم نے ”بیوہ بھادج“ پر ترس کھا کر اس سے شادی کر لی۔“ تمام تر زور ”بھادج“ اور

”ترس“ پر تھا ولید کی فراخ پیشانی پر اس الزام سے کئی سلونیں پڑ گئی تھیں۔

”میرے خدمات کے لیے اس قدر گھٹنا لفظ استعمال مت کرو زینب۔“

”فی الحال تو فلاپ جا رہی ہے۔“ وہ منہ ہٹا کر بولا۔

”طینا..... یار..... وہ مانتی ہی نہیں ہے۔“

”ریلیکس ولید..... مان جائے گی۔“ وہ قلمی آئیز مسکان سجائے بولی۔ ولید بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا اٹھا اور گلاس وڈو کے سامنے جا رکھا۔

”وہ سمجھ رہی ہے میں اس کی انسلٹ کر رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ میری فیلنگز کو کیوں نہیں سمجھ رہی۔ اب..... مجھے کیا پتا کہ میں اس سے کب محبت کرنے لگا۔“ اس کی جھنجھلاہٹ دے بے بسی انتہا کو چھو رہی تھی۔ فاطمین نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”مان جائے گی۔“

”کب؟“

”جب وقت آئے گا۔“ وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور وقت کب آئے گا؟“ وہ مڑا اور شانہ گلاس سے نکال کر سینے پر بازو باندھ لیے۔

”مجھے کیا پتا۔“ وہ سر کھجا کر رہ گئی۔

”فاطمین۔“ کتنی ہی دیر گلاس کے اس طرف نظر آتے نیلے آسمان پر نظریں نکالنے کے بعد وہ بولا۔ فاطمین استعجابیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں واقعی نہیں جانتا کہ کب اس سے محبت کرنے لگا۔“ اس نے کئی بار کہا ہوا فقرہ دوہرایا تو وہ تپ گئی۔

”ہاں محبت نہ ہو گئی تماشائی ہو گیا۔“

”شٹ اپ! میری محبت کو تماشا مت کہو۔“ وہ برا مان گیا تھا۔ ”میں جانتا ہوں وہ مان جائے گی اور نہ بھی مانے تو کیا فرق پڑتا ہے شادی تو میں پھر بھی اسی سے کروں گا۔“ وہ اپنی جون میں لوٹ آیا تھا فاطمین نے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اگر تم کہو تو میں نرنب سے بات کروں؟“

”نہیں یہ بات اسے اور بھی بری لگے گی۔“ وہ دونوں ایک پل کو خاموش ہوئے۔

”اف تم تو بالکل بھی اچھے میزبان نہیں ہو ولید! کم سے کم کافی ہی پلوا دو گھنٹہ بھر سے۔“ نرنب نامہ کھولے بیٹھے ہو۔

”ارے واہ! امیر! نرنب نامہ“ دو منٹ برداشت نہیں ہوا تم سے اور جو خود ہر وقت ”احمد نامہ“ کھولے رہتی ہو۔“ اس نے دوبارہ طعنہ دیا تو وہ ایک دم بولی۔

”طعنہ منت دو کافی کے ساتھ پڑا کھلو او۔“

”کس خوشی میں؟“

”اپنی متوقع شادی کی خوشی اور وہ بھی نرنب کے ساتھ۔“

”او کے۔“ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ ”میکڈونلڈ چلتے ہیں“ کہہ کر وہ فون پر سیکرٹری کو ضروری ہدایات دے لگا پھر ریسپورڈر تک کر بولا۔

”ویسے ایک بات ہے طینا۔“

”کیا؟“

”تم بھی اچھی خاصی ہو۔ حیرت ہے کہ مجھے تمہارا خیال کیوں نہیں آیا۔“ متبسم و شریر لہجے میں وہ رات کا اظہار کر رہا تھا۔ فاطمین نے گھور کر دیکھا پھر مصنوعی آہ بھر کر بولی۔

”ہائے اس زود بپشیاں کا پشیاں ہونا..... اب چلو“ وہ دونوں ہنستے ہوئے نکلے تھے واپس آیا تو ماں بہت پریشانی بھری تھیں۔

”کہاں تھے اب تک میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”جی ڈر فاطمین کے ساتھ چلا گیا تھا۔“ وہ مختصر آہتا کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کیا تاریخ طے ہوئی ہے اس کی شادی کی؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”کوئی بھی نہیں کیونکہ اس کا مگنیتیر چار ماہ کے لیے پیرس چلا گیا ہے اس کی واپسی پر ہی شادی ہوگی۔“

نا کردہ ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر سارا گھر چھان مارا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ واپس ماں جی کے پاس آیا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”نرنب، واپس لاہور چلی گئی ہے۔“ وہ خجل سا ہو کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”میں یہ تو نہیں پوچھ رہا۔“

”اچھا تو پھر کیا پوچھ رہے ہو؟“ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی چھوٹے سے بچے کی چوری پکڑ رہی ہوں اور بچہ صاحب ذرا سی ڈھیل پا کر فوراً پھیل گئے تھے۔

”آپ نے شعیب بھائی سے بات کی؟“ قریب پڑی پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”مقتل تمہیں اب بھی نہیں آئی۔ ہزار بار کہا ہے گلاس میں ڈال کر آرام سے پیا کرو مگر مجال ہے کہ تمہارے کان پر جون رینگ جائے۔“ وہ بغیر شرمندہ ہوئے مسکراتا رہا پھر ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

ماں کے لیے تو اتنی محبت بھی بہت ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا ابھی کچھ اصرار پہلے ہی تو وہ ان کی گود میں سمٹ جایا کرتا تھا۔

”میں نے شعیب سے بات کی تھی۔“ وہ انگلیاں اس کے بالوں میں پھیر رہی تھیں۔

”نہیں یونہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

+

وہ سوکھی تو کھڑکی سے باہر نظر آنے والا منظر موسم کی دلفریبی کی خبر دے رہا تھا۔ بادلوں کے موٹے ٹکڑوں کو ہوا نجانے کہاں اڑائے لیے جارہی تھی۔ اس کا کرہ گھر کے پچھلی جانب تھا۔ پچھلی دیوار والی کھڑکی سے کالونی کی صاف ستھری سڑک نظر آتی تھی۔ جس کے دونوں اطراف میں سفیدے اور سنبل کے درخت تھے جن کی نیم برہنہ ٹہنیاں سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ خاموشی اور پرسکون سڑک پر زرد رنگ چوں کا ڈھیر تھا جو ہوا کے ذرا سے تیز جھونکے سے دور تک گھومتے چلے جاتے تھے۔ دور کہیں کوئی لڑکی ایسے موسم میں بھی کوک کر زندگی کی نوا دے رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے نے درختوں کو چننے پر مجبور کیا تھا وہ ایک دم چونکی پھر منہ دھو کر کمرے سے باہر آ گئی۔ بھابی کچن میں مصروف تھیں اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”اچھا ہوا تم جاگ گئیں اب یوں کرو یہ بریانی کا سالہ بھون لو میں تب تک کو فٹے بنا لیتی ہوں۔

کمانے میں دیر ہوگئی تو شعیب خفا ہوں گے۔“

”اتنا اہتمام کس خوشی میں ہو رہا ہے بھی۔“ اس نے چولہے پر چڑھی دیکھو میں جھانکا۔

”ماں جی آئی ہیں۔“ وہ سرسری بتا کر کپے قیے میں مسالے ڈالنے لگیں۔ نرنب ایک ہل کو چپ ہوئی پھر بولی۔

”میں ان سے مل کر آتی ہوں۔“

”وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“ اسے آنچ مدھم کرتا دیکھ کر وہ بولیں۔

”وہ طارق بھائی ہیں نا میری خالہ کے بیٹے ان کی بیوی ہاسپٹل میں ہے۔ ماں جی اور شعیب اسی کی عیادت کے لیے گئے ہیں۔“ وہ سر ہلا کر ہنسیا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بھابی ہاتھ سے قیہ مسل رہی تھیں۔ کچھ سوچ کر انہوں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”نرنب.....“ وہ رکیں پھر بولیں۔ ”ماں جی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آئی ہیں۔“ نرنب دنگ سی رہ گئی۔

”میری مرضی کے بغیر.....“

”شعیب نے ہاں کہہ دی ہے۔“ بھابی نے کسی مجرم کی طرح اقبال جرم کیا۔ وہ مارے صدمے کے اسٹول پر ڈھسے ہو گئی۔

”یہ نہیں ہوگا..... قطعاً بھی نہیں ہوگا۔“ کتنی دیر بعد وہ زندگی آواز میں بولی۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ شعیب بھائی اور ماں جی ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ولید تو ناحق ہے، گدھا ہے،

”پھر کیا جواب دیا انہوں نے۔“ اس کے لہجے میں امید کے دیے کی تھر تھرائی ہوئی لوکی سی بے چینی تھی۔

”اسے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ہم میں سے کسی کو بھی اعتراض نہیں ہے۔ بس نرنب مان جائے تو.....“ وہ خاموش ہو گئیں تو وہ ان کا بالوں میں حرکت کرتا ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر بولا۔

”جب میں نرنب کے متعلق آپ سے بات کرنے والا تھا تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ نہیں مانیں گی۔“

”کیوں؟ بھلا تمہیں ایسا کیوں لگا؟“

”میرا خیال تھا کہ آپ روایتی ساسوں کی طرح تن کر کھڑی ہو جائیں گی۔“ وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”لیکن آپ میں تو ساسوں والے کلکس سرے سے ہیں ہی نہیں۔“

”خدا معاف کرے مجھے ایسے کلکسوں بلبوں سے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی پھر بولیں۔

”اور میں نرنب کی ساس نہیں ماں ہوں اور مائیں اپنی اولاد کی بہتری ہی چاہتی ہیں۔ وحید کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ہی میرے دل میں تم دونوں کی شادی کا خیال آیا تھا مگر تب تم پڑھ رہے تھے۔ اس دوران دو ایک رشتے بھی آئے تھے اس کے جو کافی سے زیادہ اچھے تھے مگر میرا دل راضی نہیں ہوا۔ مرحوم بھائی بھادج کی نشانی کو میں خود سے ڈبو نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”آپ اتنے عرصے سے کبھی کچھ سوچے بیٹھی ہیں اگر مجھے کوئی اور پسند آ جاتی تو؟ یا نرنب بھی تو کسی اور کو پسند کر سکتی تھی۔“

”کبھی کچھ ممکن تھا مگر خدا بڑا کار ساز ہے۔ دیکھ لو اس نے خود ہی تمہارے دل میں نرنب کا خیال ڈال دیا۔“ ان کی بات سن کر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ ماں کی زبان سے یہ بات سن کر اسے تھوڑی سی شرم آئی تھی جسے اس نے تھپڑ مار کر بھگا دیا اور فوراً سیدھا ہونٹیا پھر کچھ توقف کے بعد دھیرے سے بولا۔

”وہ مان جائے گی نا ماں جی؟“

”وہ کیا اس کا باپ بھی مانے گا۔“ وہ پر جوش انداز میں مسکرائیں تو وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

”لیکن اس کے باپ سے تو مجھے شادی نہیں کرنی۔“ وہ ہنسنے لگیں۔

”میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔“

”عبدال سے کہہ دیں۔“

”اسے میں نے بازار بھیجا ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر پھر رکیں۔ ”کل اتوار ہے تم فارغ ہونا؟“

”جی۔“ اس نے بتایا پھر پوچھا۔ ”کیوں؟“

بیوقوف ہے۔“

”ارے یہاں تو ہماری شان میں قصیدے پڑھے جا رہی ہیں۔“ ولید اسی بل کچن میں داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر نذیب یوں کھڑی ہوئی جیسے شیرنی اپنے دشمن کو دیکھ کر چوکی ہوتی ہے۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم ماں جی سے کچھ نہیں کہو گے۔“ اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔

”ارے بھئی میں نے تو ماں جی سے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ ان کا اپنا دل بریائی کھانے کو چاہ رہا تھا جی تو انہوں نے بھابی سے فرمائش کی۔“ وہ کمال معصومیت سے بولا۔ ساتھ ہی بھابی سے تائید بھی چاہی۔

”بکومت ولید قاسم! اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ جو تم چاہتے ہو اول تو میں زہ ہونے ہی نہیں دوں گی لیکن اگر کچھ ایسا ہوا تو.....“ اس سے کوئی بات بن نہ سکی اس ”تو“ کے آگے تو اس نے قطعاً نہیں ہوا تھا اسے اپنے ارد گرد لاؤ کے شعلے لپکے محسوس ہو رہے تھے۔

”تم..... تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ.....“ وہ انگلی اٹھا کر بڑے ضبط سے بولی۔

”ورنہ.....؟“ ولید کی نگاہوں میں لطف بھری سرکشی چمکے لکھارہی تھی۔

”ورنہ میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکال دوں گی۔“ ولید کے لبوں پر مسکان بکھر گئی۔ وہ غصے میں دوسو واٹ کے بلب کی طرح جل رہی تھی۔ وہ اس کے سین سامنے جا رکا۔

”اچھا ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کی طاقت۔“ ہچکچک انداز سراسر استہزائیہ تھا۔ نذیب کس کر رہ گئی۔ اس دیوار چین کو دھکا دے کر ذرا سامنے بھی ہلا سکتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔“ بھابی نذیب کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ نذیب نہایت غصے سے دھپ دھپ کرتی باہر نکل گئی۔ بھابی نے سر پیٹ لیا جبکہ ولید مسکرا کر بولا۔

”مجھے تو وہ ہوا ہے جو رویو کو جو لٹ سے ہوا تھا۔“

”اور اسے وہ ہوا ہے جو امریکہ کو تمام اسلامی ممالک سے ہوا ہے۔“ بھابی نے خالی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

+

دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ کتنی ہی دیر کھڑی رہیں۔ انہیں اپنے شوہر نامہ پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے انہیں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام کرنے کے لیے کہا تھا اور اگر چہ وہ اچھی کوہ پیما تھیں مگر نذیب جیسے پہاڑ کو سر کرنا کافی کٹھن تھا۔ پھر جس قسم کے رد عمل کا اظہار اس نے ولید کے سامنے کیا تھا انہیں تو اپنی خیریت بھی مشکل نظر آرہی تھی۔ بہر حال انہوں نے دل کڑا کیا اور اندر داخل ہو گئیں نیم تاریک کمرے میں ماؤنٹ ایورسٹ انہیں بیڈ پر دراز نظر آئی۔ وہ چھت پر نظریں گاڑے ہوئے

”کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے نذیب؟“ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے ٹیوب لائٹ ن کر دی۔ ایک جھماکے سے روشنی پھیلی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے تیزی سے بازو اٹھوں پر رکھ لیا پھر جب تک آنکھوں نے روشنی کو قبول کیا بھابی نہ صرف اس کے قریب بیٹھ چکی تھیں بلکہ بھابی اس کے کندھے پر تھا۔

”موسم بہت اچھا ہو رہا ہے چلو کچھ دیر میسر پر واک کرتے ہیں۔“ وہ اٹھ بیٹھی۔ بھابی اس کے کھڑے کی منتظر ہی رہیں جبکہ وہ آلتی پالتی مارے جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بھابی لفظ ڈھونڈنے میں کچھ دیر بعد نذیب کی آواز گونجی۔

”آپ نے شعیب بھائی سے کہا۔“ آنکھوں میں آس و نراش کی شمع جلائے وہ انہیں دیکھ رہی تھی بھابی کی نگاہیں جھک گئیں ابھی کچھ روز قبل ہی تو انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہ ہوگا اور اب.....

”اچھا نذیب! ایک بات بتاؤ۔ آخر تم ولید سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔ کیا اعتراض ہے تمہیں بکرم ولید کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہو۔“

”میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں تبھی انکار کر رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”کیا یہ اعتراض کافی نہیں ہے کہ وہ مجھ سے پورے دو برس چھوٹا ہے۔ میرے مرحوم شوہر کا بھائی ہے ذرا کم عمر قبل تک میرے گھنے پر سر رکھ دیا کرتا تھا۔ یاد ہے آپ کو وحید کے انتقال سے قبل وہ مجھے بھابی کہتا تھا۔“

”یہ اتنا بڑا اعتراض تو نہیں ہے جانو! اسلام نے اس قسم کی شادی کی اجازت دی ہے پھر جب ولید نہیں بھابی کہتا تھا تب وہ تمہیں صرف وحید کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ اب وہ بچہ تو نہیں رہا نا تو جوانی اور جوانی کے جذبات میں بہت فرق ہوتا ہے نذیب۔“ انہوں نے توقف کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سن رہی ہے یا نہیں۔

”عمر کو کافر بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ محض دو برس ہی تو بڑی ہو تم اس سے لیکن ساتھ کھڑی ہو تو ہمارا دل چھوٹی ہی لگتی ہو۔“ وہ لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

”جس پر پڑتی ہے وہی جان سکتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کہ اس خفت کا سامنا آٹا اور کل بھی مجھی کو کرنا پڑے گا۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”سیدھی طرح کیوں نہیں کہتیں کہ اب میرا وجود آپ کو ناگوار لگنے لگا ہے۔“ اس نے نہایت سہولت سے الزام ان کے سر لگا دیا۔

”خدا کے لیے نذیب! مجھے اتنا غلط مت سمجھو۔ میں تو تمہاری بھلائی چاہتی ہوں ورنہ تم سے بڑھ کر کھلا کون عزیز ہو سکتا ہے مجھے۔“ انہیں بے حد صدمہ پہنچا تھا۔

”میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ عمر کا یہ فرق.....“

”ابھی عمر پر آپ بہت لیکچر دے سکتی ہیں بھائی! لیکن ایک بات بتائیے خدا خواستہ شعیب بھائی کو کچھ ہو گیا تو کیا آپ مظہر سے شادی کر لیں گی؟ وہ بھی تو آپ سے صرف ایک برس چھوٹا ہے۔“ جب ساری دنیا دشمن لگنے لگے تو انسان عقل کا دامن نادانستہ طور پر چھوڑ دیتا ہے اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

”نذیب! وہ مارے غم کے حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اسی پل دروازہ دھاڑے کھلا اور شعیب بھائی غضب ناک چہرہ لیے اندر داخل ہوئے۔

”شرم تو نہ آئی ہوگی اتنی بڑی بات کہتے ہوئے۔ کس قدر خود غرض لڑکی ہو تم نذیب! بھائی کے مرنے کی دعائیں مانگ رہی ہو۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اس نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔“ بچاری بھائی فوراً گھبرا اٹھیں۔

”تم چپ رہو تبہ! مجھے بات کرنے دو اس سے۔“ انہوں نے گھورا تو وہ سہم کر چپ ہو گئیں۔

”بالکل بھائی آپ چپ ہی رہیں۔“ وہ شعیب کی طرف گھومی۔ ”اور آپ کیا بات کرنے آئے ہیں مجھ سے؟ خود غرض میں ہوں یا آپ؟ صاف صاف کہہ دیجئے میرا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے ہیں۔ کاش میں مر گئی ہوتی۔“ وہ رونے لگی۔ شعیب لنگ سے اسے نکلے گئے پھر کڑے ضبط سے بولے۔

”بہتر ہوگا اب اپنی زبان سے ایک لفظ بھی مت کہنا ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا ہر حسرت پوری ہو جائے گی۔“ شعلہ سا لپکا تھا۔

”شعیب پلیز۔“ بھائی پھر منٹنائیں مگر یہ منٹنا ہٹ دھاڑ میں کھو گئی۔

”ہاں یہی سچ ہے کہ تم بوجھ ہو ہم پر نہیں رکھنا چاہتا میں تمہیں اپنے گھر میں۔“

غم سے وہ بھی بولتے چلے گئے۔ نذیب کے اندر غصہ غم بن کر اودھم مچانے لگا۔ اسے اپنے وجود سے دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ شعیب کو اپنے لفظوں کی سختی کا احساس ہوا تو بولے۔

”ولید بہت اچھا ہے اسحق لڑکی..... بہت خوش رکھے گا وہ تمہیں۔ آخر کب تک تم یونی زمدگی گزارو گی؟“

”میری زندگی کو ماریں گولی۔ جہاں آپ کا فائدہ ہے وہاں چاہے مجھے کسی گدھا گاڑی والے سے بیاہ دیں۔“ اس نے گال رگڑے اور قطعیت سے بولی۔

”مگر ایک بات یاد رکھیے گا شعیب بھائی! میں بھی نذیب ہوں مگر جاؤں گی مگر شادی نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے عین بارات والے روز پتھکے سے لٹک جانا یا چوہے مار دوائی نکل لیتا۔ مگر اتنا تم بھی یاد

جنم میں تھا تو ہم بھی تمہیں نہیں رہنے دیں گے۔“ انہوں نے ترکی بہ ترکی دھمکی دی اور بھائی کا ہاتھ کر باہر نکال گئے۔

”یہ کیا کیا آپ نے آخر کیا ضرورت تھی اتنی سختی سے بات کرنے کی۔“ وہ مشکوک سے انداز میں بولیں۔

”کہہ دو بھائی! شعیب مسکرانے لگے باہر آتے ہی ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

”تم تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔“ وہ متبسم و شریک لہجے میں بولے۔

+

شام نے کب رات کا آنچل اوڑھ کر دن کے اجالے کو الوداع کہا۔ تھک ہار کر پرندے کب درختوں کی شاخوں میں سوئے؟ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کا نظارہ کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود وہ جان لیتی تھی۔ ذات کے ایوان میں دکھ اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ براجمان تھا۔ کمرے کی خاموش تنہائی میں بوجھ تھی مگر نہیں تھی۔ وہ وحید کی رفاقت میں گزارے لمحوں میں بھٹک رہی تھی کتنا مختصر دور تھا وہ اور دور بھی۔

”ٹھیک کر سکت ہو گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ کھٹکنے کی آواز سنی تھی۔ اس پل دل کا غبار لمحوں میں ٹھہرا ہوا تھا اور وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے کندھے پر نرم جھریوں سے لٹکا ہوا دباؤ محسوس کر کے بہت زور سے آنکھیں میچھنے لگیں۔ پھر دباؤ بڑھا اور اس کا رخ موڑ لیا گیا اس ناز چاہے ہوئے بھی آنکھیں کھول دیں ایک آوارہ بوند پلکوں کی قید سے رہائی پا کر گال پر لیکر چھوڑ گئی۔

”اے کائنات! میں نے تجھے تو مانا کہ تیرے درتپے میں مان کا دیا بجائے جس کی لوامید کے تیل سے

انجی۔

”کیا میری بات بھی نہیں مانو گی؟ مجھے تو مان کہتی ہوں تم تو کیا تمہارے آگے ہاتھ جوڑو؟“ نذیب ناکہ ٹٹانے پر سر رکھے بری طرح رودی۔

+

”ذرا سی ٹیکس اٹھا کر اس نے زرتار آنچل کی اور سے سارے کمرے میں نگاہ ڈالی۔ یہ کمرہ اس نے کوئی سال پہلے دیکھا تھا اور وہ کوئی پہلی بار بھی یہاں نہیں آئی تھی مگر آج تو اس کمرے کے تمام رنگ ہی بدلے ہوئے تھے۔ یقیناً سارے کمرے کو نئے سرے سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ زمین اور سارا بیڈ گلاب کی خوشبو سے ڈھکا ہوا تھا جن کی خوشبو اور مہک چاروں اور اڑتی پھر رہی تھی۔ بیڈ کے اطراف میں رکھے گئے لوہے کے گدھان و امیٹ اور ریڈیو گود میں لیے مسکرا رہے تھے جبکہ اس کے دماغ میں اذیت کے جھکڑ چل رہے تھے اسے اپنے سچے سنورے روپ سے سخت وحشت ہو رہی تھی لیکن ابھی وہ شدید خواہش کے باوجود

کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مبادا کوئی کمرے میں آ جاتا اور اسے عام حلیے میں دیکھ کر نجانے کیا سمجھتا ہے۔ ایک ہفتہ قبل اپنی کزن شادی کی کئی بات یاد آ گئی جب بھابی اسے مایوں بٹھانا چاہتی تھیں۔

”رہنے دو تہینہ! اس کی کون سی پہلی شادی ہے پھر پچھلی بار بھی تو مایوں بیٹھی تھی اس بار نہ بیٹھ گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔“ لوگ مزاح کے لہادے میں کتنا گہرا طنز کر جاتے ہیں یہ اس نے اسی پہل میں جانا تھا۔ شکست خوردہ سی نگاہ بھابی پر ڈال کر وہ بلیکس جھکا گئی۔ ایک اسی بات نے ساری ہمت کھینچ لی تھی پھر آنے والے دنوں میں وہ بھابی کی ہر بات مانتی چلی گئی۔ آف وائیٹ وال پر سرکتی اس کی نظر ولیدہ قاسم کی تصویر پر جا رکی۔ بلاشبہ بلیک ہائی نیک میں وہ بہت وجیہ لگ رہا تھا اور یقیناً آج اس کی وجاہت کو چار چاند لگے تھے کیونکہ اس نے کئی کزنز کو اس کے متعلق کہتے سنا تھا۔

”ویسے زنب! تم بہت خوش قسمت دوسری بار بھی کس شان سے بارات آئی ہے تمہاری۔“ پتا نہیں یہ رشک تھا یا.....

”بھئی ظاہر ہے زنب کے ارمان تو پہلی دفعہ ہی پورے ہو گئے تھے لیکن ولیدہ کی تو پہلی شادی ہے نا۔“ جانے کس نے کہا تھا اور محفل کشت زعفران بن گئی تھی۔ وہ بھابی سے کہنا چاہتی تھی مگر وہ ان سب کو ڈپٹ رہی تھیں۔

”یار چھوڑو ان سب باتوں کو۔ زنب! تم یہ بتاؤ ولیدہ نے تم سے پہلی بار اظہار عشق کب کیا تھا۔“ اس کی ماموں زاد کا خفہ اشتیاق سے اس کے پاس آ بیٹھی اور اس کا دل چاہا تھا کہ اس پہل ساری مصلحت بالائے طاق رکھ دے اور دھاڑیں مار مار کر روئے، کا خفہ کہہ رہی تھی۔

”تم دونوں اتنا عرصہ ایک ہی گھر میں رہتے رہے ہو کوئی بات تو ایسی ہوگی جو بات شادی تک پہنچی۔“

”تم یہ سب ولیدہ سے ہی پوچھ لیتا۔“ بھابی نے ان سب کو وہاں سے اٹھا دیا اور اس کے اندر بوند بوند نکلتا غصہ سوراخ کرنے لگا تھا اور اب جبکہ وہ اس کی دلہن کی حیثیت سے اس کے کمرے میں موجود تھی تو سوراخ کھائی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اسے اپنے گل بوٹوں سے حزین ہاتھوں سے غلیظ بو آ رہی تھی۔ تن سے لپٹا میرون عروسی جوڑا اسے خون رنگ لگ رہا تھا۔ خون ہی تو تھا اس کی امیدوں کا، اس کے بھروسے اور مان کا اور قاتل کون تھا؟ ولیدہ..... ولیدہ قاسم۔ جس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھتی تھی اور قد آدم آئینے کے سامنے رک کر زیورات اتارنے لگتی تھی۔

+

جس پہل وہ کمرے میں داخل ہوا زنب نہایت اطمینان سے بیٹھی تھی مگر جیسے ہی اس نے دروازہ لاک کیا۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر بیڈ سے اتری تھی۔ اس سے قبل وہ کھونٹکٹ پلٹنا نہیں بھولی تھی۔ وہ چہ

مرد ہیں کھڑا اسے نکلتا رہا پھر جیب سے والٹ اور دیگر ضروری اشیاء نکال کر میز پر ڈالیں اور صوفے پر نیم اڑھو کر بہت سہولت سے ٹانگیں میز پر پھیلا لیں۔ اب وہ نہایت اطمینان سے سر کے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے نوج کر زیورات اتارنا دیکھ رہا تھا جس کے ہر انداز سے وحشت چک رہی تھی۔ ولیدہ اسے پکارنا چاہتا مگر نجانے کیا چیز زبان کو تالو سے چپکائے ہوئے تھی۔ اپنا سجا سنورا روپ کس بے دردی سے اجاڑ لی تھی وہ۔ اتنا صبر بھی نہیں کر رہی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ ہی لے۔ پتا نہیں کیوں وہ اتنی متغیر ہو گئی تھی حالانکہ ان غلط فہمیوں نے اس نے اور تمنا بھی ایسی جسے حاصل کرنے میں اس کے ارد گرد کے سبھی لوگ اس کا خدے رہے تھے۔ وہ تو اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا مگر ماں جی کا خیال تھا کہ شادی باوجود سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور اس نے بھی امید پر اپنی دنیا قائم کر لی تھی۔

”اگر تم اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سن لو تو شاید بہت سے معاملات سلجھ سکتے ہیں۔“ اسے واش روم طرف جانا دیکھ کر وہ ایک دم بولا۔ زنب نے مڑ کر ایک قہر زدہ نظر اس پر ڈالی۔

”شاید نہیں یقیناً سلجھ سکتے ہوں مگر مجھے تمہارے ساتھ کوئی معاملات نہیں سلجھانے۔“ اس کے بازو میں سر دی قطعیت تھی۔

”کیوں؟“ وہ ایک پہل بھی ضائع کئے بنا اس کے سامنے آیا تھا۔

”کیونکہ یہ شادی ماں جی کی مرضی سے ہوئی ہے یا پھر شعیب بھائی کی زبردستی کی وجہ سے، لہذا مجھے تم کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ دونوں لہجے میں کہہ کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ ولیدہ نے ایک گہری سانس ہوا باہر دے دی تھی۔

”تم نے کسی اور کی مرضی کے آگے سر جھکایا ہوگا ہمیں تو ہمارے دل نے کہا تھا۔“ وہ خود بخود مسکرایا۔

”ٹھیک ہے زنب بی بی! ہم بھی دیکھیں گے کہ تم کب تک اپنی انا کا پرچم بلند رکھتی ہو۔“ اس کی ابا واش روم کے دروازے سے نکلا کر پلٹ آئیں۔ زنب باہر آئی تو وہ گردن تک کھیل تانے اطمینان سے سو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر وہ اندر تک تپ گئی۔ اگرچہ پہلے ہی ارادہ صوفے پر رات گزارنے کا تھا مگر ہاتھ تڑیل کا احساس ہو رہا تھا۔ تیز تیز بالوں میں برش یوں پھیرا گویا سارا غصہ ادھر ہی نکال دینا دھواڑے الماری کھولی کھینچ کھانچ کر کھیل نکالا۔ اسی دھواڑے بند کیا۔ راستے میں آئی ٹیبل کو ٹوکھو کمراری تکلیف سے لب بھینچ لیے۔ ساری رات صوفے پر لیٹ کر اکڑ گئی۔ رہ رہ کر ولیدہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اتنا نہ ہوا لاکر کہہ دے تم بیڈ پر سو جاؤ۔ میں صوفے پر سو جاتا ہوں۔

تھک کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں تھنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے۔ گھور گھور کر کھا جانے والی نظروں سے اسے لکھتی رہی جس کے چہرے پر بچوں جیسی مصعوبیت تھی۔

”بے ادب نہ ہو تو۔ بڑی ہوں میں اس سے اور بڑوں کا احترام تو لازم ہے۔“ جھنجھلا کر کھیل سر تک

”کاش یہ اونٹ بھی اس وقت نظر آ جاتا۔“ وہ بڑا کرواں روم میں گھس گئی اور جب ٹھنڈے بخ پانی پیا کر باہر نکلی تو بری طرح کانپ رہی تھی۔ بھائی بھابی سے وہ نارمل انداز میں ملی تھی۔ شعیب بھائی نے ہلکی سیٹانی پریا کر کیا تھا۔

”کتنی پیاری لگ رہی ہے تاہماری بیٹی۔“ انہوں نے بھابی سے کہا تھا اور لہجے کی شفقت محسوس کر کے بے ان کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔ ذرا سی نظر اٹھا کر قریب کھڑے ولید قاسم کو دیکھا۔ گرے کمر کے کرتا دارمیں وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ نرنب جھنجھلا سی گئی جب وہ خود خوش نہیں تھی تو اسے بھی خوش ہونے کا حق ملتا تھا۔

”نرنب! منہ دکھائی میں کیا ملا؟“ اس کی اکٹائی ہوئی صورت دیکھ کر بھابی اس کی طرف جھکیں۔ اس گہرا کر ولید کو دیکھا جو اس وقت دیگر کزنز کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اسے مناسب جواب نہ دیا تھا۔

”کیا دیا ہے ولید نے تمہیں؟“ بھابی نے اسے پھر ٹھوکا دیا تو وہ سر جھکا کر کلائی میں پڑی چوڑیوں سے لہلہا۔

”کچھ بھی نہیں۔“

”ہیں کچھ بھی نہیں۔“ وہ چونکیں پھر کچھ سوچ کر ولید کی طرف گھومیں۔

”تم نے نرنب کو کچھ بھی نہیں دیا۔“ یہ سوال انہوں نے شعیب اور کزنز کے باہر جانے کے بعد کیا تھا۔ ”اے واہ کچھ بھی نہیں کیوں؟ اپنا آپ ان محترمہ کو سوئپ دیا کیا یہ کافی نہیں ہے۔“ اس نے سرسری لہلہا نگاہ اس پر ڈالی جو اس وقت دنیا جہاں کی سنجیدگی چہرے پر سجائے نئی نویلی دلہن کی بجائے اماں لہلہا بیٹھی تھی۔

”وہ تو نمک ہے مگر کافی نہیں ہے تمہیں کچھ اور بھی گفت دینا چاہیے تھا۔“

”وہ کیوں؟“

”نرنب دکھائی کا تختہ الگ ہوتا ہے۔“

”کوئی سو بار تو یہ صورت دیکھ ہی چکا ہوں میں پھر اب کیوں الگ سے تختہ دیتا؟“

اس نے بہت شریر انداز میں بھابی سے دریافت کیا تھا۔ نرنب کو چمک کا شدید ترین احساس ہوا زبان اٹھانے تو بہت کچھ آیا تھا مگر بھابی کے خیال سے چپ رہی۔ بھابی ہنس رہی تھیں۔

”نمرود سو بار دیکھی ہوگی مگر دلہن بنی تو پہلی بار ہی دیکھی ہے نا۔“

”کیوں ولید! وحید بھائی کی شادی میں نہیں دیکھا تھا نرنب کو؟“ اسی پل ولید کی چچا زاد شازمین نے مال ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ ولید اور بھابی نے ایک ساعت میں نرنب کو دیکھا۔ وہاں کے تاثرات

تان لیا۔ پھر جب صبح مؤذن نے پہلی اذان دی جب اس کی آنکھ لگی۔ خواب میں اس نے وحید کو دیکھا جو بڑی برہمی سے اس کے سامنے کھڑے تھے جبکہ وہ منہ ساری تھی پھر وہیں کہیں ولید بھی آ گیا۔ نرنب کو اس کے چہرے پر بڑی خباثت نظر آئی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے پاس آیا تھا۔ پھر پورے استحقاق سے اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا تھا۔ وہ چل کر وحید سے التجا کرنے لگی بھی وحید نے پھروں سے ہوائی چیل اتاری اور ان دونوں کی طرف یوں بڑھے جیسے قصائی کمرے کی طرف بڑھتا ہے۔ انہوں نے کھینچ کر نرنب کو ولید کے گھٹنے سے آزاد کر دیا اور اس کے بعد دھپ دھپا دھپ..... ولید کی شامت آ گئی۔

”مت ماریں وحید، چھوڑیں وحید، بچہ ہے۔“ وہ انہیں روکنے کو آگے بڑھی اسی پکر میں ٹھاہ کر کے ایک ضرب اس کی سر پر لگی اور وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ سانس بیکھر غیر متوازن، دھڑکن ڈنگاتی ہوئی اور چہرہ عرق زدہ۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر گردن اوپر ادر گھمائی۔ وحید کہیں نہیں تھے البتہ ولید آئینے کے سامنے کھڑا بے حد حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں میٹر برش تھا اور کمرے میں ٹائم ہیں کے الارم کی آواز گونج رہی تھی۔ کھڑکھڑائی آواز ذہن پر کوڑے برساتی رہی۔

”کیا ہوا نرنب!..... اور کون بچہ..... کس کا بچہ۔“ ولید نے جھک کر تشویش سے اس کے زردو چہرے کو دیکھا وہ ابھی تک سانس بحال نہیں کر پائی تھی۔

”وہ..... وہ وحید.....“ سراسیمگی چہرے سے ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وحید ابھی کہیں سے نکل کر سامنے آئیں گے اور اسے مارنے لگیں گے۔

”اس کے ذہن سے تو شاید کبھی وحید لالہ نہیں نکلیں گے۔“ ولید ایک دم سیدھا ہوا۔

”شادی مجھ سے ہوئی ہے اور خواب ابھی تک وحید لالہ کے دیکھے جا رہے ہیں۔ جھکتو ولید میاں! محبت کرنے کی یہی سزا ہے۔“ وہ بڑبڑایا ایک دم ہی ولید کو وحید لالہ سے بے تحاشا جلن محسوس ہوئی تھی۔

”شعیب بھائی اور تہینہ بھابی ناشتا لے کر آئے ہیں۔ اٹھ کر فریش ہو جاؤ۔“

نرنب کے حواس بیدار ہو چکے تھے سوا یک اچھٹی نگاہ اس پر ڈالی جس کے چہرے پر اب خفگی رقم تھی۔

”کاش وحید دونوں چیل اتار لیتے تو میں بھی اس ولید کے بچے کا حشر بگاڑتی۔“ اس نے دانت کچکپائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں سورہی تھی مرنہیں گئی تھی جو مردوں کو جگانے والا الارم لگایا تھا۔“ الارم بند کرتے ہوئے اس نے ایک نگاہ بھی گلاب کی نیم جان تپوں پر نہ ڈالی تھی جو اپنی بے قدری پر اب تک ماتم کتاں تھیں۔ ولید نے اسے دیکھا اور قدم آدم آئینے کے سامنے جا رکا۔

”پچھلے آدمے کھٹے میں، میں آپ کو تقریباً پانچ بار آوازیں دے کر جگانے کی کوشش کر چکا ہوں مگر آپ تو یقیناً پورا اصابیل بچ کر سوئی تھیں۔“ انجبی انداز میں گہرا طعنے تھا۔

توقعات سے کچھ کم نہ تھے۔

”بالکل دیکھا تھا مگر تب دل نہیں بھرا تھا تبھی تو دوبارہ دیکھنے کا بندوبست کیا ہے۔“ حد درجہ اطمینان سے جواب دے کر وہ اٹھا اور وارڈروب کے داہنی کینٹ سے ہر انٹیمس کیس نکال لایا جسے کھول کر بھابی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ ہے، رات پہنا نہیں سکا تھا لہذا اب پہنا دیتا ہوں۔“ سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس نے گولڈ میگلکس نینب کے گلے میں پہنا دیا تھا۔ ساتھ ہی کڑے بھی تھے جنہیں ایک ہی کلائی میں ڈال کر وہ اس کا ہاتھ تمام کر بیٹھ گیا تھا۔ بھابی کو ایک گونا سکون ہوا جبکہ نینب کو یہ چونچلا ہٹ بالکل نہ بھائی تھی اور شازمین نظر ہر مسکراتے ہوئے اپنے دل کو تھکیاں دے رہی تھی۔ ولید جیسے شاندار بندے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیکھنے کا خواب تو اس نے بھی دیکھا تھا۔

+

”ہائے یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ ماں جی کی دلخراش ہائے پر اس کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹ گیا۔ وہ جھپکے سے پیچھے نہ مٹی ہوئی تو یقیناً گرم سالے سے اس کے پاؤں پر تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ بن گیا ہوتا۔

”تمہارا داغ تو ٹھیک ہے نینب، کیا کر رہی ہو تم؟“ وہ صدمے کے اثر سے نکل کر اب کسی قدر غصے سے پوچھ رہی تھیں۔

”کھانا پکا رہی ہوں ماں جی؟“ کفگیر اٹھاتے ہوئے اس نے کسی قدر استعجاب سے جواب دیا کیونکہ ان کی وجہ ناراضگی سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”کس گدھے نے کہا ہے یہ سب کرنے کو۔“ انہوں نے کفگیر اس کے ہاتھ سے لے کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

”کیا تم ہمارے خاندان کی رسموں سے ناواقف ہو؟ معلوم ہے جاہلیں کم سے کم بھی ایک مہینہ تک نئی دلہن سے کام نہیں کر دیا جاتا۔“ وہ اسے یاد دلانے لگی تھیں نینب کو ہنسی آگئی۔

”بھلا اب ہنس کیوں رہی ہو؟“

”میں کہاں کی ہنسی دلہن ہوں ماں جی ایک عرصہ سے اس گھر میں رہ رہی ہوں۔ کام کرنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ فارغ نہیں بیٹھ سکتی۔“

”پاگلوں جیسی باتیں مت کرو نینب!“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ”ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے تمہاری شادی کو۔ میں مانتی ہوں کہ بہت عرصہ تم وحید کے حوالے سے اس گھر میں آتی رہی ہو مگر اب بات دوسری ہے بھر ولید کیا سوچے گا میری نئی ٹوبلی دلہن کو کام پر لگا دیا۔“ اب کے انہوں نے بات کو مزاح کا رنگ دینا چاہا مگر وہ

ترا بھی نہ سکی۔

”پھر آرام کرنے کے یہی تو چند دن ہیں۔ اس کے بعد تو سب کچھ تم ہی کو سنبھالنا ہے اور کتنے دن ہوں میں یہاں؟“ انہوں نے گہرا سانس بھرا تو وہ آزرہ سی ہو کر ان سے لپٹ گئی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔“

”لا حول دلا۔“ انہوں نے جبر جبری لی بھرا سے خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

”خاطر جمع رکھو۔ تمہارے بچوں کی شادیاں کئی بغیر اس دنیا سے جانے والی نہیں ہوں میں۔“

”جی.....“

”جی۔“ وہ بولیں۔ ”میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ کچھ دنوں میں سارا گھر تم ہی کو سنبھالنا پڑے گا کیوں کہ جلد میرا دیرہ بھجور ہا ہے اور اگلے ماہ میں دہی جاری ہوں۔“

”کیوں جاری ہیں ماں جی۔“ وہ پریشان سے ہو گئی تھی۔ ”یہاں کوئی تکلیف ہے آپ کو میرا مطلب ہے میری یاد لید کی وجہ سے؟“

”ارے نہیں میرے بچے! بھلا اپنے گھر میں کیا تکلیف ہوگی۔“ وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

”اس کی بیوی کے لیے جڑواں بچوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ تبھی مجھے بلایا ہے ورنہ وہ کب ماں کو یاد کرتا ہے۔“ وہ ٹالنا دکھائی دے رہی تھیں مگر ماں تو ماں ہوتی ہے نا۔ بچوں کی غلطیاں کب غلطیاں نکلتی ہیں۔

”پھر ذاتی بزنس چلانا کوئی آسان کام ہے؟ وہ بیچارا بھی کیا کرے۔ اسی موئے بزنس کی وجہ سے بھابی کی شادی میں شرکت بھی نہیں کر سکا۔“ ان کے خاموش ہونے پر وہ افسردہ سی ہو گئی حیران تو خیر تھی ہی۔

”آپ نے پہلے ذکر ہی نہیں کیا کہ دہی جاری ہیں۔“

”ولید نے نہیں بتایا تمہیں؟“

”نہیں..... ہاں..... بتایا تھا۔“ اس نے بات بتائی کہ اپنے تعلق کی سر دمہری کو کمال خوب صورتی سے ب کے سامنے بہترین بیمار دکھا تھا۔ پھر مزید ایک ہفتہ ہی گزرا تو اس کی اکٹا ہٹ عرش کو چھوئے گئی۔

”بس بہت ہو چکا ماں جی! اب میں مزید ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ آج میں کھانا پکاتی ہوں۔“

ان نے چند لفظوں میں مدعا سمیٹا تو وہ گھور کر بولیں۔

”چکی بیٹھی رہو۔“

”ماں جی پلیز۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”میں حد درجہ بوریت محسوس کر رہی ہوں۔ بھلا آپ خود

تائیں کہ میں کیا کروں؟“

”گھومو پھر ویش کرو۔ تم دونوں کی حرکتیں مجھے کچھ مشکوک لگ رہی ہیں۔ شادی کے ابتدائی دن تو

لوٹے ہی گھومنے پھرنے کے لیے ہیں۔ تم دونوں کو تو خدا ہی سمجھے۔ دعوتوں کو بھی منع کر رکھا ہے۔ میں پوچھتی

ہوں دفتر سے اتنی دیر سے آنے کی کیا تک ہے؟“ کمان کارخ چیل سرچنگ کرتے ولید کی طرف ہوا تو وہ اطمینان سے بولا۔

”آفس میں کام بہت ہے ماں جی.....“

”ہاں، ہاں سارا آفس تمہارے ہی کندھوں پر سوار ہے۔“

”اچھا کیا چاہتی ہیں آپ؟“ وہ ہنوز ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”میں کیا چاہوں گی مگر..... پہلے اس ٹی وی کو تو بند کرو۔“ ولید نے دالیم بہت کم کر دیا البتہ آف نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر دل میں بیٹے کی عقل پر ماتم کرتی رہیں پھر اکتا کر بولیں۔

”زینب کو کہیں گھملاؤ۔“ ولید نے زینب کو دیکھا جو اکتا ہٹ کا شکار تھی۔

”چڑیا گھر تو اس نے دیکھ رکھا ہے۔“ وہ مذاق میں بی بات ٹال دینا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ زینب کبھی جانے پر راضی نہ ہوگی۔ زینب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ آج کل ویسے بھی مذاق سمجھنے کی صلاحیت کم ہو گئی تھی۔

”ولید! ماں جی نے اسے تنبیہی انداز میں گھورا تو وہ ہنسنے لگا۔

”شاہدہ اور اچھرہ یہ جا چکی ہے۔ شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد اور مینار پاکستان بھی دیکھ رکھے ہیں۔“ وہ اگھبین پر گھونے لگا۔ وہ ماں جی کی طرف متوجہ تھا مگر اس کے باوجود زینب کے تاثرات اسے اندر ہی اندر محفوظ کر رہے تھے۔

”یوں کر میرے لال! ہنر پہ اور موجوداڑو کی بنگلہ کروالے۔ شادی کے فوراً بعد گھونے پھرنے کے لیے اس سے زیادہ اچھی جگہ پورے پاکستان میں ہے ہی نہیں۔“ ماں جی جل کر بولیں۔ زینب کو اس جواب نے بڑا سکون دیا تھا جبکہ ولید کا قہقہہ چھٹ پھاڑ تھا۔

”اچھا کل ہم بھائی گیٹ جائیں گے ناشتا کرنے۔“ اسے زینب کی تملہاٹ مزہ دے رہی تھی جس نے تپ کر کہا تھا۔

”بھائی گیٹ کی بجائے لاہوری منڈی چلیں گے لسی پینے۔“ اس نے فقرہ دانتوں تلے چاڑا لیا تھا۔ ولید کی ہنسی دبانے کی کوشش ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ ماں جی نے باری باری دونوں کو دیکھا ان کی غنجدگی ماں جی کو حیران کر رہی تھی۔

”تم دونوں کی کہیں موت نہیں ماری گئی۔“

”آپ خفا مت ہوں۔ زینب سے پوچھ لیں یہ جہاں جانا چاہے گی میں بے جاؤں گا۔“ اس نے مزید جلانے کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے سارا بار اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ ماں جی جھجھلا گئیں۔

”کیوں تمہارا منہ دکھتا ہے پوچھتے ہوئے؟“ انہیں شک سا گزرا۔ وہ دونوں ان کے سامنے ایک

دوسرے کو بس منہ توڑ جواب ہی دیتے تھے۔

”رہنے دیں ماں جی! مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”لاہوری منڈی بھی نہیں۔“ اپنے پیچھے اس نے ولید کی آواز سنی تھی اور کوئی بھی جواب دیئے بنا کمرے میں گھس گئی۔

”بس اترا گیا دو دن میں عشق کا بھوت..... یہ نہیں کہتا کہ اپنے سے بڑی عمر کی بیوی کو ساتھ باہر لے جائے شرم آتی ہے۔“ بدگمانی ہر پہلو خود ہی تلاش کر لیا کرتی ہے۔ وہ بیڈ پر لیٹی تھی ایک دم کپٹھی کے قریب فی بی محسوس ہوئی اس نے چھو کر دیکھا۔

”ارے میں رو کیوں رہی ہوں؟“ وہ حیران ہوئی پھر جھلا کر اٹھ بیٹھی۔

+

عجیب خاموشی شام دھرتی پر اتاری تھی آشیانوں کو لوٹنے پرندے بھی کیسے اداس اور اسی کی طرح کوفت زدہ لگ رہے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر ٹیرس کی ہری گرل کے پاس کھڑے مشرقی افق پر پھیلتے سیاہی مائل بادلوں کو دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ شام بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔ اپنے گرد گرم شال اچھی طرح لپیٹ کر وہ نیچے آ گئی۔ ولید کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس نے سارے گھر کی لائٹس آن کیں اور لاؤنج میں آ گئی۔ ابھی ٹی وی آن کیا ہی تھا کہ فون گنگنا اٹھا۔ دوسری طرف ولید تھا جس نے سلام کا جواب دیتے ہی کہا تھا۔

”میں چندرہ بیس منٹ میں آ رہا ہوں تم تیار رہنا۔ آج فاطمین نے اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کر رکھا ہے۔“ زینب نے ناگوار سی سے لب بھینچ لیے اس خیال سے جو ذرا خوشی ہوئی تھی کہ ولید نے اس کی تنہائی کے خیال سے فون کیا ہوگا۔ اب ساری دھری رہ گئی۔ دل تو چاہا کہہ دے مجھے کہیں نہیں جانا مگر اچھا کہہ کر ریسور رکھ دیا۔ ایسی کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ اس نے میرون کرنا، پاجامے کا انتخاب کیا جس کے ساتھ فل انیمر ایئرڈ روڈ پیٹ تھا۔ سوٹ کی مناسبت سے ہلکی سی جیولری پہن لی اور میک اپ اس نے نسبتاً ڈارک کیا تھا اتنے عرصے بعد بہت دل سے تیار ہوئی تھی سواپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ شگنی کٹ بالوں کو اس نے یونہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ولید چندرہ منٹ کی بجائے پورے پینتالیس منٹ بعد آیا تھا اور آتے ہی جلدی چپا لٹی لٹی راستے میں اس نے فریش ریڈر دوز زکابو کے اور چاکلیٹ ایک خرید کر اسے تھما دیا تھا۔ فاطمین کے گھر فاطمین اس کی دو چھوٹی بہنوں اور والد نے ان کا استقبال کیا تھا۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔“ گال سے گال ملا کر بوسہ دیتے ہوئے فاطمین نے کہا تھا۔ اس نے بس مسکرا کر تعریف قبول کر لی۔ فاطمین کے بابا نے اس کے سر پر پیار دیا تھا۔ وہ بہت ہی شاندار پرسنلٹی

اور باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ زمین اور نوٹیشن بھی بے حد اچھی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار رہی تھی۔ ہر دو منٹ بعد کوئی ایسی بات ہوتی جو اسے ہنسنے پر مجبور کر دیتی اور وہ ہنستی ہی چلی جاتی کھانا بھی بہت اچھے ماحول میں کھایا گیا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہاں آنا حق نہیں گیا۔ ماں جی کے جانے سے وہ بہت تنہائی محسوس کرنے لگی تھی پھر عبدل بھی کچھ دنوں کے لیے گاؤں گیا اور تھا۔ کھانا کھانے کے بعد فاطمین اسے اپنا اسٹوڈیو دکھانے لگی تھی وہ فائن آرٹس میں ماسٹرز کر رہی تھی اس کی بیٹی ہوئی بیننگلز دیکھ کر بہت متاثر ہوئی تھی اور اس کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا۔ فاطمین اس کی بات سن کر ہنسنے لگی پھر بولی۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک سر پرانز ہے زینب!“ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اس نے تجس پھیلا نا چاہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”اچھا..... کیا؟“

”ادھر آؤ۔“ وہ اسے ایک کونے میں لے گئی پھر اس نے ایک تصویر اٹھا کر زینب کے سامنے کر دی۔

”ارے..... یہ تو میں ہوں۔“ زینب کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ فاطمین اپنے کارنامے پر خود ہی بہت خوش ہو رہی تھی۔

”ہاں بھی یہ تم ہی ہو..... میں نے بتائی ہے یہ تصویر۔“ اس نے بتایا۔

”اچھ نکلی تمہارے چہرے کے ایک ایک نقش کے بارے میں مجھے ولید نے بتایا تھا بس میں نے اندازے سے تصویر بنادی۔“ فاطمین تصویر پر نظریں ٹکائے شاید تنقیدی جائزہ لے رہی تھی جبکہ اس کا ذہن پہلی بات میں انک گیا تھا۔

”میری اور ولید کی نیٹ فرینڈ شپ ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ دوستی بڑھتی گئی پھر ملاقات ہوئی اور اب ہم بیسٹ فرینڈز بن چکے ہیں۔ یونہی ہم جب بھی ملتے تھے ولید سب سے زیادہ تمہارے بارے میں ہی باتیں کرتا تھا اور میں احمد کے بارے میں۔“ وہ رکی پھر بولی۔

”زینب! تم پلیز ہماری فرینڈ شپ کو غلط مت سمجھنا۔ ہم لوگ صرف دوست ہیں اور احمد سمجھتا ہے کہ.....“ وہ خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگی یکدم وہ بہت افسردہ نظر آنے لگی تھی زینب نے اس کا ہاتھ بہت پیار سے تھام لیا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم دونوں صرف دوست ہو پلیز..... پلیز تم رومٹ۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ولید کی محبت سے واقف ہو۔“ وہ افسردگی سے بھری۔

”تو کیا احمد تمہاری محبت سے واقف نہیں ہے؟“ وہ احمد کو نہیں جانتی تھی مگر فاطمین کے انداز سے جان گئی تھی۔ فاطمین نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔

”خیر فکر مت کرو میں ولید سے کہوں گی وہ احمد کو سمجھا.....“

”اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ فاطمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہماری منگنی ٹوٹ چکی ہے۔“

”اوہ۔“ زینب چپ سی رہ گئی جبکہ فاطمین ہنسنے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئی۔“

”میں نہیں تو کوئی اور سہی۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ وہ ولید مجھے کوس رہا ہو گا کہ نجائے میں اس کی بیوی کو کہاں لے گئی۔“ بعض اوقات انسان اندر کا حال چھپانے کے لیے ہنسی کا سہارا لیتا ہے اور اسے لگا کہ فاطمین بھی ایسا ہی کر رہی ہے بہر حال وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

”بہت خوش قسمت ہو تم زینب! کیونکہ تمہیں ولید جیسا ہر بینڈ ملا ہے۔ مگر تم سے بھی زیادہ خوش قسمت ولید ہے کیونکہ اسے تم ملی ہو۔“ کاریڈور سے گزر کر لوگ روم کی طرف جاتے ہوئے فاطمین نے کہا تھا اور وہ نکلتی سن کر بہت زور سے ہنسی تھی۔ ان کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی۔ راستہ بھر وہ منتظر ہی رہی کسی سڑائی جملے کی مگر..... اور اس کی وجہ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یہ وہی ولید تو تھا جسے وہ بچہ سمجھتی تھی اور جس سے شادی نہ کرنے کے لیے اس نے بہت احتجاج کیا تھا۔

+

وہ کچن سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آئی تو ادھ کھلے دروازے سے آتی ولید کی آواز نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم اچھی خاصی ہو۔ زینب کو چھوڑ کر تم سے شادی کر لیتا ہوں مگر تم نے کوئی رسالہ ہی نہیں دیا۔“ زینب کا سر گول گول گھومنے لگا۔ پیشانی پر کئی ایک سلونٹیں پڑ گئی تھیں۔ ولید کے بارے میں اس کی سوچ قدرے مثبت ہو گئی تھی مگر اب..... دوسری طرف سے نجانے کیا کہا گیا تھا جس پر ولید بہت زور سے ہنسا تھا۔

”ارے نہیں بھئی۔ تمہاری خوب صورتی کا تو میں قائل ہوں۔ یاد ہے اس دن ریسٹورنٹ میں وہ ساٹھ سال کا بابا کیسے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ تو شکر کر رہا تھا میں آ گیا۔“ گویا نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا دل دھڑا دھڑا پیچنے لگا۔ وہ پھر ہنس رہا تھا۔

”سوچ لو مجھ سے شاندار بندہ تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔“

”تم اشارہ تو کر دو میں کل ہی تم سے شادی کر لوں گا۔“ زینب نے گھومتے سر کو سنبھالتے ہوئے دروازے کا سہارا لیتا جا ہوا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ ولید نے اسے تیزی سے جاتے دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

”خدا کے لیے بھابی مجھے مت ڈرائیں۔“ اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

بہابی نے اسے روتے دیکھا تو بہت پیار سے اپنی بانہوں میں سیٹھ لیا پھر اس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھو کر بولیں۔

”میں پہلے بھی اس سے محبت کرتی تھی مگر.....“

”میرے چلیے کو کچھ مت کہیں۔“ وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ اندر خفگی بھری تھی۔

”اسے تو بس اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکیاں نظر آتی ہیں یا پھر اپنی یونیورسٹی فیلوؤں کی شان میں فیدے پڑھ سکتا ہے۔ وہ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے میری طرح اسے بھی اس شادی کے لیے ماں جی نے مجبور

”کیوں نہیں رہی ہیں بھابی۔“ اس نے جھنجھلا کر ٹوکا۔

”یہ شغل کسی اور وقت کے لیے اٹھارکھیے۔“

”جب ہوئی تمہاری جیسی سر جھاڑ منہ پہاڑ ہوگی تو شوہر پیارا لانیوں فلا نیوں کو ہی دیکھے گا نا۔“

”ہیں..... کیا کیا ہے میں نے؟“ اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔

”معلوم ہے۔“ حلق میں جاتی چائے یکدم ہی بے حد کڑوی ہو گئی تھی۔ بھابی کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں پھر منات سے بولیں۔

”اوہ، تو آپ اس کی وکالت کرنے آئی ہیں۔“

”خدا نہ کرے۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں بھابی! اور غلطی میری نہیں ہے۔ جھگڑے کی ابتدا ہمیشہ اس کی طرف سے ہوتی ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”وہ بھی تو خاموش ہو سکتا ہے آخر کو چھوٹا ہے مجھ سے۔“

”بکومت“ وہ دھاڑیں پھر اس کی نقل اتار کر بولیں۔ ”چھوٹا ہے مجھ سے۔ آخر کب تک تم کو
فرق لے کر بیٹھی رہو گی۔ صرف دو سال چھوٹا ہے۔ دس برس چھوٹا ہوتا ہے بھی رجب اسی کا بڑا ہوتا تھا۔ احمق نہ

”آپ ہر بار مجھے ہی غلط قرار کیوں دیتی ہیں؟“

”اس لیے کہ غلط تم ہی ہو۔“

”جی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے کوئی اور پسند آگئی ہے۔“ بلا خراس نے کہہ دیا۔

”ہیں کیا مطلب.....“ بھابی ایک دم سیدھی ہوئیں تو اس نے ساری بات بتادی جسے سنتے ہی انہوں

نے سر پٹ لیا۔

”اتنی بڑی بات اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ سچ بتاؤ پچھلے ایک ہفتے سے اسی لیے یہاں آ کر بیٹھی ہوئی ہوتا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ غصے سے بولیں۔

”تم سے بڑا حق تو اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ اب اس سے پہلے کہ وہ سچ سچ دوسرا نکاح کرے تم فوراً اپنے گھر چلی جاؤ۔ بلکہ میں ولید کو فون کر دیتی ہوں وہ تمہیں لے جائے گا۔“ انہوں نے بات کو زیب داستان کے لیے بہت بڑھا دیا تھا نینب نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔

”آپ رہنے دیجئے میں ہی فون کر دیتی ہوں۔“ وہ ٹیلی فون سیٹ اپنے قریب کھینٹ کر بولی اور جانے سے قبل اسے شعیب بھائی اور بھابی سے اپنے غلط رویے اور سخت لفظوں کے لیے معافی مانگتی تھی۔

+

کار کی پر حدت فضا میں خاموشی کو غ رہی تھی اور وہ مجسم کان بنی بیٹھی تھی شاید وہ کہے۔ میں نے تمہیں مس کیا تھا۔ ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی تم یاد آتی رہیں۔ یہ سات دن میں نے بڑی مشکلوں سے کاٹے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مگر سارا راستہ وہ یوں سنجیدگی سے ونڈا اسکرین سے باہر کچھی سڑک پر نظریں گاڑے رہا تھا گویا اس سے بڑھ کر ضروری کام اور کوئی نہ ہو۔ اب تو وہ لوگ لاہور میں داخل ہو کر اپنی کالونی کی حدود میں بھی داخل ہو چکے تھے۔

”بد تمیز کہیں کا۔ کیا میں نہیں جانتی اسے۔ اگر مجھے یاد کرتا رہا ہے تو کہہ کیوں نہیں دیتا..... ہونہانا جو آڑے آتی ہے۔“ وہ اندر ہی اندر جھنجھلاتی رہی تبھی گاڑی گیٹ کے سامنے رک گئی مگر وہ شخص انداز میں بیٹھی رہی۔ ولید نے کچھ پل اس کے اترنے کا انتظار کیا پھر حیرت سے اسے دیکھا وہ حد درجہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔

”کیا ساری رات کار میں ہی گزارنی ہے۔“ اس کے پوچھنے پر وہ ہنسی پھر خنسی ہو کر اتر گئی۔

”گیٹ اچھی طرح بند کر لینا چونکہ دارنوکری چھوڑ گیا ہے۔ میں کچھ دیر میں آؤں گا۔“

چابیاں اسے تھما کر وہ کار بھاگ لے گیا۔ وہ اندر آئی کچھ دیر کرسی پر بیٹھنے بیٹھنے اکر جی تھی پھر

پہرے تبدیل کیے اور اپنے لیے چائے بنا کر لاؤنج میں آگئی۔ ٹی وی آن کر کے وہ ولید کا انتظار کرنے لگی۔ آج وہ ہر معاملہ غماز بنا چاہتی تھی۔ وال پر بے کلاک نے چھ بجے کا اعلان کیا تو وہ صوفے پر لیٹ گئی پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ حیران ہوئی اٹھ بیٹھی ایسی بے سادہ ہو کر سوئی تھی کہ وقت گزرنے کا بھی علم نہ ہوا تھا۔ وہ ولید کو سوچ کر پریشان ہو گئی جواب تک نہ آیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے اس کی واپسی ہوئی۔

”نیو کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔“ اسے دیکھتے ہی وہ برس پڑی حالانکہ سوچ لیا تھا وہ غصہ نہیں کرے گی مگر پھر بھی کوفت نے غصے میں جھلا کر دیا۔

”تم اب تک میرے انتظار میں جاگ رہی ہو؟“ ولید کے لہجے میں استعجاب استغما تھا نینب سلگ کر رہ گئی۔

”نہیں موت کے فرشتے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ کچھ جواب صرف سوچنے کے لیے ہوتے ہیں۔“

”کھانا کھاؤ گے..... لگا دوں۔“

”نہیں میں کھا کر آیا ہوں۔“ وہ کمال رکھائی سے بولا۔

”اچھا چائے پیو گے۔“ نینب نے غصے کے ابال کو اندر ہی دبایا ولید نے رخ موڑ کر اپنی مسکراہٹ چھپائی اور احسان کرنے والے انداز میں بولا۔

”دل تو نہیں چاہ رہا البتہ اگر تم پینا چاہ رہی ہو تو تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔“ نینب سر ہلا کر کچن میں چلی گئی اور وہ بیڈروم میں آ گیا۔ اسے نینب کے رویے میں بڑی خوش گوار سی تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ جو تیر اس نے چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں آ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر کچن میں، نینب برز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ وہ وہیں چوکھٹ سے شانہ ٹکا کر اسے دیکھنے لگا۔

”لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔“ اس کے لبوں نے بے آواز حرکت کی پھر کل کر مسکرا دیئے۔

بلک کھدر کے سادہ سے سوٹ میں بھی اس کا سراپا بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ شاید یہ محبت کا خاص اعجاز ہوتا ہے کہ دل میں بسنے والے ہر حال، ہر انداز میں اچھے لگتے ہیں۔ استحقاق کہیں اندر ہی اندر انگڑیاں لینے لگا تھا۔ کوئی خوش کن جملہ زبان کی نوک پر چل اٹھا تھا۔ اس نے نگاہ چرائی مگر پھر جیسے بے بس ہو گیا۔ آج اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر دیکھتے رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے جا رکھا۔ ایک بے اختیاری سی اسے اپنے گہرے میں لے رہی تھی۔ اس کی نظریں سیاہ بالوں سے جھانکتی صراحتی دار گردن پر ٹھہر گئیں۔ جہاں ننھا سائل مثل ماہ مسکرا رہا تھا۔ بس ایک پل تھا جو اسے اس چاند کے اپنا صرف اپنا ہونے کا یقین دلا گیا۔ اس نے شہادت کی انگلی سے ریشمی پردہ ہٹا دیا اور.....

نہیں کرنٹ کھا کر بہت تیزی سے مڑی تھی۔ ولید اس کے بے حد نزدیک کھڑا تھا بس ایک ہی لمحہ تھا جو اس کا سب کچھ لے گیا۔ بے اختیاری سی بے اختیاری تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور ولید کے گال پر نادیہ محض چھوڑ گیا۔ اپنی اس جسارت پر وہ خود بھی حیران پریشان سی سن رہ گئی۔ ولید گال پر ہاتھ رکھے ہکا بکا سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا کر چکی ہے؟“

ولید کے اندر اشتعال کی تیز ترین لہر دوڑ کر چہرے پر سرخی رقم کر گئی وہ جڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر بجائے، ہتھیلیاں پیچھے اسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے صلیب سے لگی کھڑی تھی۔ شرمندگی اور سراسیمکی جیسے اثرات نے اس کے دل پر سوکھے پتے جیسا لرزہ طاری کر دیا تھا۔ چائے ابل کر مزید آگ کو بھڑکانے لگی۔ نہن کو لگ رہا تھا کہ ابھی ولید کوئی چھری اٹھا کر اس کی شہ رگ کاٹ دے گا۔ ورنہ چھروں کی بارش تو لازماً ہوگی مگر اس نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا تھا بلکہ وہ مڑا تھا اور تیزی سے راستے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا ہوا نکل گیا تھا۔

”ولید“ وہ جیسے خوف سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن اس نے نہیں سنا اور گیٹ کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔

+

اس کی آنکھ کھلی تو لوگ روم کے کونوں کھدروں میں سے نکل کر بھائیں بھائیں سناٹا بول رہا تھا۔ بلکے سے اجالے نے اسے احساس دلایا کہ وہ بہت دیر تک سوئی رہی ہے۔ اس کا سر اس وقت بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ شاید روتے رہنے کا اثر تھا۔ ولید ساری رات گھر نہیں آیا تھا اور اس وقت گیارہ کا وقت تھا۔ وہ بے دم ہو کر خود ہی کو کوٹنے لگی۔ اسی پل فون کی گھنٹی نے اسے متوجہ کیا تھا۔ کسی خوش گمانی کے زیر اثر اس نے چھپٹے کے سے انداز میں ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بھابی تھیں جن کی آواز سننے ہی وہ بے اختیار رونے لگی تھی وہ ایک آن میں گھبرا گئیں۔

”مجھے آپ بہت یاد آ رہی ہیں۔“ ان کے بار بار استفسار پر وہ یہی کہہ سکی۔

”اف میں تمہی ولید نے سچ سچ دوسری شادی کر لی۔“

”ابھی تک کی تو نہیں ہے مگر اب شاید کر لے۔“ اس کے دل میں گونج ابھری اور آنسو ایک تو اتار سے

بہنے لگے دوسری طرف بھابی نجانے کون سی تسلیاں دے رہی تھیں۔

”بھابی آپ یہاں آ جائیں پلیز مجھے..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا انہیں ساری

حقیقت بتا کر وہ مزید شرمندہ نہیں ہو سکتی تھی۔ معلوم جو تھا کہ ادھر سے بھی لعن طعن ہی ملے گی۔

”ارے ڈرنے کی کیا بات ہے بھئی ویسے میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں اور لب کو بیجا رہا ہے ہیں میری امی کا آپریشن ہے نا..... اچھا ولید کہاں ہے؟“ انہوں نے رک رک کر پوچھا تو وہ لہجہ کو خود بھی چپ سی رہ گئی کیونکہ اس بات سے تو وہ خود بھی ناواقف تھی۔

”ولید گھر پر نہیں ہے۔“

”میں اتنی جلدی باہر چلا گیا ابھی ایک منٹ پہلے ہی تو وہ مجھ سے بات کر رہا تھا پھر لائن کٹ گئی۔“ وہ ڈان ہو رہی تھیں جبکہ نہن اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے کرنٹ لگا ہو پھر تیزی سے بولی۔

”اپنی امی کو میری طرف سے پوچھیے گا بھابی اور آپ لوگ اپنا خیال رکھیے گا اللہ حافظ۔“ وہ پکارتی ہی ابھیں مگر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ صوفے پر لاوارثوں کی طرح جھوٹا دودھ پیندہ صوفوں پر ڈالا اور ولید اور اپنے لڑکے بیڈ روم کی طرف آ گئی۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اگلے کئی پل اسے اس خوف کی نذر کرنے لگے تھے جو ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ دل الگ دھڑ دھڑا کر رہا تھا۔ اس نے اندر ہی اندر آیت الکرسی کا ورد شروع کیا اور نہایت احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ولید اوندھے منہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا نہن نے بے اختیار جھرجھری سی لی وہ اتنی ٹھنڈ میں بغیر شرٹ کے لیٹا ہوا تھا۔ قریب ہی سفید سنگ مرمر کی الٹش نے سٹریٹ کے کٹروں سے بھری بڑی تھی۔ اسے دھچکا سا لگا مگر جلد ہی وہ اس کیفیت سے نکل آئی کیونکہ اگلے دو ڈھائی ماہ اس نے دانستہ اس شخص سے بیکانہ ہو کر گزار دیے تھے۔ اس نے اپنے دل کو بڑے پیار سے سہلایا اور طفل تسلی دے کر اس کے قریب چلی آئی۔

”ولید“ بہت ڈرتے ڈرتے اس نے دھیرے سے پکارا مگر جواب موصول نہ ہوا تو اس نے اپنا ہاتھ لاکے شانے پر رکھ دیا۔ جسے بڑی بے دردی اور نفرت سے جھٹک دیا گیا تھا۔ ولید نے ٹانگیں بیڈ سے نیچے نکالیں اور ساتھ ہی اخروٹی رنگ کی شرٹ پہن لی۔ نہن ابھی لفظ ڈھونڈ رہی تھی جب وہ شرٹ کے بٹن بند کرنا ہوا اٹھا۔ ایک پل میں اس کے دل میں گمان جاگا کہ وہ چلا جائے گا مگر اس نے دروازہ چوہٹ کھول دیا اور اب اس کی آنکھیں گھبرا گئیں۔ ظاہر ہے اسے جانے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں ولید کہ تم مجھ سے بہت خفا ہو مگر پلیز ایک بار میری بات.....“

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی جسٹ گیٹ آؤٹ آف ہیر۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ بولا۔ انداز و انداز میں لبو بخمد کر دینے والی سرد مہری تھی۔ وہ کبھی بھی اس سے اس انداز میں بات نہیں کرتا تھا۔ نہن کو اٹھاس کے لہجے و انداز کی نرمی و محبت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئی جو اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ لمبائی کی بوتل تھی جس سے بڑے بڑے گھونٹ غالباً غصہ کم کرنے کے لیے پئے جا رہے تھے۔

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے کیا تم مجھے.....“ اس کی بات پھر قطع کر دی گئی مگر اس بار ولید نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا بوسل سائینڈ ٹیبل پر شیخ کر وہ دروازے کے قریب جا کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے اس کے

پھر اس نے ریسپور رکھا اور عبدل کے پاس جا کر نجانے کیا کہا تھا۔ پھر اسی جگہ بھرے انداز میں اس کے قریب سے نہایت اجنبیت سے گزر کر باہر چلا گیا تھا۔

”عبدل! کہاں گئے ہیں تمہارے صاحب؟“ اس نے بہت جھجکتے ہوئے پوچھا تھا مگر عبدل کی ساری لہجہ میں تھی۔

”ایئر پورٹ گئے ہیں جی۔“

”ایئر پورٹ؟“ اس کا دھیان ماں جی کی طرف گیا تھا۔

”وہ جی پنڈی سے مہمان آرہے ہیں ان کو لینے گئے ہیں۔“ عبدل نے واپس بڑھا دیا تھا۔

+

”قمر بھائی کو یہاں لاہور میں کچھ آفیشل کام کے سلسلے میں آنا تھا۔ میں نے سوچا کچھ میری آؤنگ بھی ہو جائے گی تبھی چلی آئی۔“ ناشتا کرتے ہوئے شاز مین نے بتایا تھا۔

”بہت اچھا کیا بھئی۔“ ولید نے مسکرا کر کہا۔ کپوں میں چائے اٹھ پیتے ہوئے نرنب نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر ولید کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ قمر تو صبح ہی صبح اپنے کام کے سلسلے میں چلے گئے تھے جبکہ ولید نے محض شاز مین کی خاطر آفس جانا کینسل کیا تھا اور اس بات کا اظہار دانستہ یا نادانستہ کر بھی دیا گیا تھا۔

+

آج پورے تین دن گزر گئے تھے ان دونوں کو آپس میں بات کئے اور اب شاز مین کی آمد نے اسے بالکل ہی پابند کر دیا تھا۔ پچھلے کچھ دن اس نے اپنے پرانے بیڈروم میں گزارے تھے اور اب وہ ہنوز صوفے کو بیڈ بنائے ہوئے تھی۔ ساری رات بیڈ خالی پڑا رہتا کیونکہ ولید اسٹڈی کو بیڈروم بنائے ہوئے تھا۔ اسے دوبارہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ شاز مین کو سارا لاہور دوبارہ سے دیکھنے کا شوق ہوا تھا۔ رات کو اول تو وہ بہت دیر سے آتا اور آتے ہی اسٹڈی میں گھس جاتا۔ اس دن بھی وہ کسی کام سے روٹ میں آئی تو ولید وارڈروب کھولے ناٹی بیچ کر رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا پھر واپس گردن موڑ کر اپنے کام میں مگن ہو گیا تھا۔ نرنب نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا مگر اب ہمت نہیں ہو رہی تھی اگلا قدم اٹھانے کی۔ سو وہیں کھڑی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے دیکھتی رہی، جواب قد آدم آئیے کے سامنے کھڑا قاف ناٹی کی ناٹ لگا رہا تھا۔ نرنب ہولے ہولے چلتی اس کے پیچھے آن رکی۔ ششے میں اس لیے چوڑے شخص کا عکس اس کے عکس کو چھپائے ہوئے تھا۔ چہرے پر ایسی سنجیدگی جو کم سے کم نرنب کے لئے ہی اب ہرگز نہ رہی تھی۔ ولید اب بالوں میں برش کر رہا تھا۔ برش رکھ کر اس نے پرفیوم کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے ہی نرنب نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی اور اس کے اوپر آئیے کے بیچ

جانے کا خطرہ ہو۔ مارے بے بسی کے وہ رونے لگی نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلا جا رہا تھا۔

”پلیز ولید صرف ایک بار میری بات سن لو۔“ اس نے روتے ہوئے التجائی۔

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ ولید نے ہر لفظ دانتوں تلے چبا ڈالا تھا۔

”مجھے تمہاری کسی بھی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ شاید میں خود پر قابو نہ رکھ پاؤں۔“ اس نے نرنب کی طرف دیکھا اور اس کی روح تک لرز گئی۔ وہ بے دے تنہا لیجے میں کتنی درشتی اور برہمی تھی اور آنکھیں..... آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ گویا سارا غصہ اور نفرت وہیں سمٹ آئی ہو۔ نرنب کے حلق میں کانٹے کانٹے گئے اور پیشانی پر عرق چمکنے لگا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ آواز میں ڈھل ہی نہ سکے۔ دروازے کا ہینڈل چھوڑ کر ولید بڑے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ ہراساں ہو کر پیچھے ہٹی مگر اس سے بھی پہلے ولید نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ وہ خزاں گزیدہ پتے کی طرح لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی اور جب تک سنبھلی دروازہ ایک زوردار چیخ مار کر خاموش ہو چکا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بند دروازے پر نظروں سے دستک دیتی دیوار کے ساتھ لگی نیچے بیٹھتی چلی گئی وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ اسے رونے آ بھی نہیں رہا تھا مگر دل تو لرزیدہ تھا نا جو چیخ چیخ کر زیاں کا احساس دلایا تھا۔

+

وہ باہر نکل تو فضا کی خاموشی چھٹ کر بادلوں کا روپ دھار چکی تھی۔ گہرے رنگ کے بادل آسمان کے ایک کونے سے دوسرے کو نئے تک نہایت خباثت سے مسکرا رہے تھے۔ یقیناً اب شہر میں بارش کا غل چٹا تھا۔ وہ برآمدے میں لان سے منسلک ٹھنڈی رخ سیرھیوں میں بیٹھ کر سامنے والی دیوار سے لپٹی تیل کو دیکھنے لگی جس کے اکا دکا کاسنی پھول ہوا کی رخ بسگی سے قمر قمرارہے تھے۔ لان کی وہ حد جو پورج کولان سے الگ کرتی تھی علیک کی لمبی لمبی ٹہنیوں کو گود میں اٹھائے ساکت کھڑی تھی۔ اس سے بے نیکی گھاس بھی دبی دبی سی تھی۔ جس وقت آسمان سے پہلا قطرہ اس زمر دیں گھاس پر گرا تب ہی ایک گرم آنسو اس کے کال پر لکیر چھوڑ گیا تھا۔ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں روتی ہی چلی گئی غلطی جب اپنی ہو تو انسان کسی اور کو الزام دے کر بھلا کیسے بری الذمہ ہو سکتا ہے۔

”میں ولید کو منالوں کی۔ معافی مانگ لوں گی اس سے۔“ وہ خود ہی کو تسلیاں دینے لگی پھر چماچوں چماچ برستے مینہ اور ٹھنڈی رخ ہوانے اسے وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اندر عبدل اپنی سرخ ریشائی ارد گرد لپیٹتی دی کے مین سامنے بیٹھا نہایت انتہاک سے نجانے کون سی پنجابی فلم دیکھ رہا تھا۔ وہ ولید کو دیکھ کر ناچاچے ہوئے بھی وہیں دروازے میں رک گئی۔ جو بہت جگہ بھرے انداز میں فون پر بات کر رہا تھا

حائل ہوئی۔ کیمل کلر کی شرٹ پر لگے براؤن بنوں پر نظر جمائے بھی وہ ولید کے تاثرات جان سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پر فہوم اسپرے کرتی ولید نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھپٹ لی۔ نذب نے خائف ہو کر سکہا حلق ترک کیا۔

”عجبت میں کیا معاف کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی ولید؟“ ولید نے اسے بہت طنز بھری نظروں سے دیکھ کر پر فہوم پنجا اور بیڑ پر بیٹھ کر جلدی جلدی جوتے پہننے لگا۔

”پلیز ولید..... صرف ایک بار میری بات سن لو۔“ اس کے آواز میں ہی کھل گئی تھی۔

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ نہایت روکھے انداز میں کہہ کر وہ اسٹڈی میں چلا گیا اور فوراً ہی فائل لے کر واپس آیا۔

”میں جانتی ہوں کہ میں ایسا کوئی حق نہیں رکھتی مگر کیا تم مجھے اس محبت کے واسطے بھی معاف نہیں کرو گے جو تمہیں مجھ سے تھی۔“ اور بالآخر اس نے اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے جوڑ دیں۔ وہ گڑگڑا رہی تھی مگر ولید کے اعصاب کے تناؤ میں چنداں فرق نہ آیا۔ چہرے پر سنجیدگی اور سرد مہری کھد کے رہ گئی تھی۔ نذب کی آنکھوں سے برستے آنسو بھی اس کے لیے جیسے بارش سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے وہ اس کے چہرے پر اپنی آنکھیں گاڑے کھڑا تھا جن میں تازہ الاؤ کی سی تپش تھی اور جن کی حدت نذب نے اپنے اندر تک محسوس کی تھی تبھی تو اسکی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔

”دیکھو ولید.....“

”ولید ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ تراخ سے دروازہ کھول کر شاز مین اندر آئی تھی نذب نے تیزی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے ولید کی سرد مہری کو گہری و فریب مسکراہٹ میں بدلتے دیکھا تھا۔

”میں بس آ رہی رہا تھا۔“ ولید کی چپکتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانی پھر شاز مین کی کھٹک دار فہمی۔

”ارے کہیں میں غل تو نہیں ہوئی۔“

”ارے نہیں یار! اخیر چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”اوہ ہاں چلو۔ اچھا نذب آپ! اللہ حافظ۔“ بھاری جوتوں کے ساتھ ہائی ہیل کی ٹک ٹک بھر دروازہ بند ہونے کی آواز۔ کہیں دور کار اشارت ہوئی اور سکوت چھا گیا۔ کچھ دیر بعد نذب نے گردن موڑ کر دیکھا وہ دونوں کب کے جا چکے تھے اور اب وہ کمرے میں تنہا تھی۔

”نذب آپ! اس کے لبوں نے بے آواز حرکت کی تھی۔“

+

وہ نہایت اطمینان سے چیئمنل پر چیئمنل بدل رہی تھی۔ ایک سکون تھا آزادی کا احساس تھا جو اسے اپنے گھرے میں لیے ہوئے تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل اس نے عبدال۔ سے ڈھیر سارے لطیفے سن کر قہقہے لگائے تھے پھر جب ہنستے ہنستے تھک گئی تھی تو اسے پکڑے تیار کرنے کا آرڈر دے دیا تھا اور اب ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے وہ مسلسل ولید اور اس کے متوقع رویے کو سوچ کر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ولید کی کار کا مخصوص ہارن سنا تو چونکی ہو کر بیٹھ گئی مگر انداز ابھی بھی لا پروا سا تھا۔ ولید اندر آیا اور آتے ہی عبدال کو آواز دی تھی۔ نذب کی چونکہ اس کی جانب پشت تھی اس لیے چہرے کے تاثرات جان نہ سکی۔ البتہ آواز کی کڑتائی نے اسے عجیب سا احساس دلایا تھا۔ ولید نے عبدال کو سگریٹ لانے کے لیے کہا تھا اور اس کے جانے کے بعد اس کے سر پر آکھڑا ہوا تھا۔

”تم نے شاز مین سے کیا کہا ہے؟“ ہاتھ میں پکڑا کوہٹ صوفے پر پھینک کر اس نے سینے پر بازو باندھ لیے۔ نذب نے سر اٹھا کر اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔

”میں نے شاز مین سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔“ ولید نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا پھر لفظ چبا کر بولا۔

”کیا تم نے اس سے چلے جانے کے لیے نہیں کہا؟“

”نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”میں نے صرف یہ کہا تھا کہ لاہور میں اس کے کچھ اور رشتے دار بھی مقیم ہیں۔“ اس کا انداز سرسبز خبر دینے والا تھا ولید سیدک کر رہ گیا۔

”تم.....“ وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا۔

”وہ صرف ہم لوگوں سے ملنے لاہور آئی تھی۔“

”صحیح کر لو ولید!“ وہ ٹوک کر بولی۔ ”شاز مین ہم سے نہیں بلکہ صرف تم سے ملنے لاہور آئی تھی اور میرا خیال ہے دو ہفتے ملنے ملانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اب اسے کچھ دن اپنے ماموں کے گھر قیام کرنا چاہیے۔“ اس کا انداز بے حد دل جلانے والا تھا اور وہ واقعی جل گیا۔

”تم انتہائی کم عقل اور ال میئر ڈعورت ہو نذب۔“

”ہاں میں ہوں کم عقل اور ال میئر ڈعورت۔“ اس کا غصہ بھی باہر آیا تھا۔

”ایک کام کرو میئر ولید! اپنی اسی زیادہ عقل والی اور ویل میئر ڈ شاز مین کو لے آؤ اس گھر میں۔ پھر جی بھر کر اس کے ساتھ ہونٹنگ کرنا، سینما جانا اور رات کو دو ڈھائی ڈھائی بجے واپس آنا۔ کوئی روک ٹوک نہیں کرے گا پھر تم جی بھر کر عیش کرتے رہنا۔“

”شٹ اپ۔“ وہ دھاڑا تھا۔ سارا اعتراض ہی اس لفظ عیش پر تھا۔ پھر خود کلامی کے سے انداز میں جھنجھلایا۔

”نجانے کس جاہل سے پالا پڑا ہے۔“ وہ جو اس کے یوں دھاڑنے پر خائف سی ہو گئی تھی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔

”اس جاہل سے شادی کرنے کے لیے میں نے نہیں کہا تھا وہ تم خود تھے جو.....“ ولید نے اس کی بات نہایت تیزی سے قطع کر دی۔

”جانتا ہوں وہ میری حماقت تھی اور اپنی اس حماقت پر میں اب تک پچھتا رہا ہوں۔“ اور زنب کی ساری خوش گمانی دھری کی دھری رہ گئی۔ ولید رخ موڑ چکا تھا۔ وہ جھٹ سے اٹھی اور اس کے سامنے آ گئی۔

”بہت دیر تو ابھی نہیں ہوئی پھر تم تو خود مختار ہو ولید قاسم! جو چاہو کر سکتے ہو تو پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے۔ طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔“ وہ بہت زور سے بولی تھی مگر اس سے بھی زیادہ زور سے ولید کا آہنی ہاتھ اس کے گال پر پڑا تھا۔ وہ جوتن کر کھڑی ہوئی تھی توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ وہ کاؤچ پر گر گئی تھی۔ اپنے لرزتے وجود کو سنبھالا دینے کی کوشش نہ کی تھی البتہ وہ اسے، دیکھے جا رہی تھی پتا نہیں حیرانی سے یا دکھ سے۔

”بہت بکواس کر لی تم نے مگر اب ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہیں قتل ہی کر دوں گا۔“

وہ انگلی اٹھا کر بولا تھا اور پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو نیل کو کھوکھو کر مارتا باہر نکل گیا تھا۔

+

کتنی ہی دیر بلا مقصد سڑکوں پر کار دوڑاتے رہنے کے باوجود بھی وہ اپنے دماغ میں اٹھتے دھوئیں کو کم نہیں کر پایا تھا۔ اصل پچھتاوا تو اب ہو رہا تھا۔ ایک اذیت ہی تو تھی جو اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی جب وہ گھر سے نکلا تھا تب شام نے اپنا آنچل نہیں پھیلایا تھا اور اب سارا شہر رات کی تاریکی کو مات دینے کے لیے برقی قہقروں سے فروزاں ہو چکا تھا۔ اس نے روڈ کے دوسری جانب بازاروں میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا جن کے چہرے آسودگی سے دمک رہے تھے اور کچھ اس جیسے بھی تو تھے اکتائے ہوئے یا جھنجھلائے ہوئے۔ اس نے ایک گہرا سانس کار کی خاموشی اور اکتا دینے والی فضا میں خارج کیا اور کچھ سوچ کر آڈیو پلیئر آن کر دیا۔ ابرار الحق کا ”پریتو“ فل وائیم میں گونجنے لگا تھا اس نے چکر وائیم کی کیا پھر کار کے شیشے کھول دیے۔ ٹھنڈی ہوا اس کے منہ سے ٹکرا کر بھاگنے لگی تھی۔ اس نے دوسری کیسٹ لگائی۔ عدنان سمیع اپنی خمار آلود آواز میں نہایت بھونڈا گانا گارہا تھا اس نے پھر کیسٹ بدل دی۔ اب کی بار قدرے سکون تھا کیونکہ نصرت فتح علی کی آواز میں ”آپ سے مل کر ہم“ گونجنے لگا تھا۔

وہ قدرے ریلیکس انداز میں ڈرائیو کرنے لگا کبھی کبھی دل بھی عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ خود سے خودی باتیں اور پہلو گھڑ کر آپ کے سامنے رکھے جاتا ہے پھر آپ لاکھ چاہیں ان باتوں کو مان لینے کے سوا اور کوئی

چارہ نہیں رہ جاتا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل اٹھا لیا۔ دوسری طرف مسلسل تیل کے باوجود فون ریسیو نہیں کیا جا رہا تھا مگر وہ مستقل مزاجی سے موبائل کان سے لگا کر بیٹھا رہا۔ تھک ہار کر انجین ٹون آنے لگی تو اس نے دوسری بار نمبر ملایا۔ تیسری بار زرائی کرتے ہوئے اس کی انگلیاں ساکت ہوئیں۔ نصرت فتح علی اب ”کے دایار نہ دھڑے“ گارہا تھا۔ اس نے جھرجھری سی لے کر موبائل ڈیش بورڈ پر ٹیچ دیا اور ہاتھ گرانے والے انداز میں آڈیو پلیئر آف کر دیا تھا۔

بے سمت پریشانی، جھنجھلاہٹ کا باعث بنتی ہے مگر وہ بے سمت تو نہ تھا اس کے باوجود جھنجھلایا ہوا تھا نجانے خود پر یا اس پر..... اور بالآخر تھک کر اس نے کار اس سڑک پر ڈال دی جو اس کے گھر کو جاتی تھی۔ جہاں اس وقت وہ لڑکی تھا تھی جس سے وہ بے حد و حساب محبت کرتا تھا۔ جس کی آنکھوں میں اسے آنسو اچھے نہیں لگتے تھے۔ جس کی ہنسی سے اسے عشق تھا۔ جس نے ہاتھ جوڑ کر اسے اس کی محبت کا واسطہ دیا تھا اور..... اور جسے اس نے بہت زوردار تھپڑ مارا تھا۔

”پھول لے لیں صاحب جی!“ سنگل کھل چکا تھا پچھلی گاڑیاں اسے آگے بڑھنے کے لیے ہارن دے رہی تھیں جب دس، گیارہ سال کے لڑکے نے جھک کر لجاجت سے کہا تھا۔ پچھلی گاڑیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ولید قاسم نے والٹ سے روپے نکال کر اس بچے کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

+

اس کی توقع کے برخلاف گھر میں داخل ہوتے ہی خاموشی نے اس کا استقبال نہیں کیا تھا۔ سب سے پہلے تو گیٹ پر کھڑے دلدار چوہدری نے سر تک ہاتھ لے جا کر اسے سیلوٹ کیا تھا۔

”کیسے ہو دلدار؟“ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”اللہ میاں کا کرم ہے صاب۔“ پوری تپتی نکالے دلدار اسے کار لاک کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”اور تمہاری بیوی اب کیسی ہے؟“ اسے یاد آیا کہ وہ اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے چھٹی لے کر گیا تھا۔ دلدار نے مثبت انداز میں سر ہلایا پھر کچھ شرماتے ہوئے بولا۔

”آپ کو بہت بہت مبارک ہو صاب۔“

”مبارک..... وہ کس لیے؟“ ولید حیران ہوا۔

”وہ جی..... آپ چاچو بن گئے ہو۔“

”چاچو۔“ وہ کچھ اور حیران ہوا پھر ایک دم بولا۔

”مگر تمہیں کس نے بتایا۔“

”میری بیوی نے۔“

تھانہ بے سبب کر رہ گئی۔

”یہ سچ نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا تو وہ تلخی سے ہنسا اور بیڈ پر جا بیٹھا۔

”یہی سچ ہے نہ بے بی بی! کہ تمہاری اس گردن کو انا کا کلف لگا ہوا ہے جو تمہیں بعد میں بھی روکتی رہی ہے ورنہ..... ورنہ میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا تھا۔ وہ حق تھا میرا۔“ وہ اسے پچھلا قصہ یاد دلارہا تھا نہ بے بے پھر سے رونے لگی وہ وہیں زمین پر دوڑا نو بیٹھ گئی تھی۔

”تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو ولید! میں اپنا پسند تو کبھی بھی نہیں رہی۔“ اس نے آنسوؤں پر قابو پانے کی خفیف سی کوشش کی۔

”مجھے لگتا تھا کہ میری طرح تمہیں بھی اس شادی کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔“

”میرے اظہار کے باوجود؟“ وہ اس کے سامنے بالکل اسی کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں تمہارے اظہار کے باوجود کیونکہ مجھے تمہاری باتیں صرف جھوٹ لگ رہی تھیں۔ ہمارا ساتھ کوئی دو چار روز کا تو تھا نہیں، ہم لوگ بہت عرصے سے ایک ساتھ تھے اور اس سے پہلے مجھے کبھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ..... کہ تم مجھ سے دوسری قسم کی محبت کرتے ہو۔“ ولید کا تہمت بہت بے ساختہ تھا۔

”یہ دوسری قسم کی محبت کیا ہوتی ہے بھئی، میں نے تو تم سے ہمیشہ ایک ہی قسم کی محبت کی تھی۔ سچی اور سچی..... اب تم ہی آنکھیں پڑھنے کے فن سے ناواقف ہو تو اس میں میرا کیا قصور۔“ وہ بے حد شوخی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نہ بے بے نے پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور تھکے تھکے سے انداز میں ہنس دی۔

”مجھے دینا سے بہت ڈر لگتا تھا نہ جانے ہماری شادی کو لے کر لوگوں نے کیسی کیسی باتیں بنائی ہوں گی۔“ ولید کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ یہ لڑکی سرخے کی ایک ٹانگ چھوڑتی ہی نہ تھی۔

”دنیالوں کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ ہر وقت ہمیں یا ہماری شادی پر ہی باتیں بناتے رہیں اور جب ہمارے مذہب نے ہمیں نہیں روکا تو بھڑا میں جانے ساری دینا۔“

”صرف اپنے فائدے کے لیے مذہب کا سہارا لینا کہاں کی شرافت ہے؟ کبھی نماز تو تم نے ایک نہیں پڑھی۔“ اس نے چوٹ کی تو وہ بغیر شرمندہ ہوئے ہنسنے لگا۔

”اب پڑھوں گا بلکہ شکرانے کے نفل بھی ادا کروں گا۔“

”اور تمہیں اپنے الفاظ واپس لینے ہوں گے کیونکہ انا پسند میں نہیں بلکہ تم ہو۔“ ولید نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

”میرے انکار کو تم نے انا کا مسئلہ بنا لیا تبھی تو شادی کے بعد ایک بار مجھے سے ڈھنگ سے بات نہیں کی۔“

”کیا.....“ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”کیا ضروری ہے کہ ہر الزام میرے سر ہی آئے۔ میں تو اسی

رات ہر معاملہ نمٹا دینا چاہتا تھا مگر تم تو میری شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں کجا کہ مجھ سے بات کرنا اور بعد میں جب میں نے خود پیش قدمی کرنی چاہی تو تم سے جواباً تھپڑ کھانے کو ملا تھا۔“ وہ نروٹھے پن سے بولا اور پہلی بار نہ بے بے شرمندہ ہو کر نظریں جھکانے کی بجائے بہت پیار سے اپنے شریک سفر کو دیکھا تھا۔

”اپنی اس حرکت کے لیے میں شرمندہ تھا اور ہوں بھی اور میں نے تم سے معافی بھی مانگی تھی۔ پتا نہیں تم نے مجھے معاف کیا ہے یا نہیں..... ولید! وہ بے اختیاری میں ہوا تھا۔ یقین کرو میں نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں مارا تھا اور..... اور بدلہ تو تم لے ہی چکے ہو۔“ اس نے کہتے ہوئے سر سے دو پٹہ ہٹا دیا۔ دائیں گال پر انگلیوں کے نشان موجود تھے ولید نے ہاتھ کی پشت سے ان نشانات کو چھوا۔

”میں نے تمہیں بے اختیاری میں نہیں مارا تھا بلکہ جان بوجھ کر مارا اور وجہ بدلہ لینا قطعاً نہیں تھی..... تم اگر اب بھی میری زندگی سے نکلنے کی بات کرو گی تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ زور سے ماروں گا۔“ وہ بہت اپنائیت و محبت سے بول رہا تھا مگر آخری بات سن کر نہ بے بے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ولید ہنسنے لگا پھر ٹیبل پر پڑا لائینر اٹھا کر سگریٹ سلگانے لگا مگر اس سے بھی پہلے نہ بے بے اس کے ہونٹوں کے بیچ دبا سگریٹ کھینچ لیا اور خفگی سے بولی۔

”میں اپنے گھر میں اس قسم کی فضولیات بالکل برداشت نہیں کروں گی۔“

”اچھا تو پھر کس قسم کی فضولیات برداشت کریں گی آپ؟“ سینے پر بازو باندھ کر وہ شوخی سے اس کی طرف جھٹکا۔ نہ بے بے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں جاری ہوں۔ ماں جی کی آنکھ کھل گئی تو مجھے نہ پا کر پریشان ہوں گی۔“ ولید نے اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس ہٹا دیا۔

”پہلے میری آنکھوں میں جھانک کر بتاؤ تمہیں میری محبت پر یقین ہے یا نہیں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ نہ بے بے نے بہت سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ایسے شخص کی محبت پر تو میں یقین کر ہی نہیں سکتی جو کسی اور سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو۔“ ولید نے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ بڑی مشکل سے روکی۔

”ارادہ تو خیر میں اب بھی رکھتا ہوں بلکہ تم اجازت دو تو میں کل ہی دوسری شادی کر لوں۔“

”کر لو اور اپنی محبت کا یقین بھی اسی کو دلا نا۔“ ناراضگی سے کہتی ہاتھ چھڑوا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر ولید کے سامنے آ جانے کی وجہ سے اس کے قدموں کو وقفہ کرنا پڑا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا مگر زندگی کا رنگ ولید کی خواہش کے عین مطابق تھا۔

”شادی تو خیر میں کر ہوں لوں گا۔ البتہ محبت میں صرف تم سے کرتا ہوں اور یقین بھی تم ہی کو دلاتا ہے۔“ بند دروازے سے کمر نکالنے وہ بہت شرارتی انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے جانے دو ولید!“ دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔
 ”مجھے ابھی نیند نہیں آرہی اور تم سے ابھی بہت ساری باتیں بھی کرنی ہیں۔“
 ”نیند نہ آتا تمہارا مسئلہ ہے پھر کچن کا رستہ تمہیں معلوم ہے لہذا اپنی مدد آپ کے تحت کام کرو۔“ اس نے بے نیازی دکھائی۔

”اتنے دنوں سے اپنی مدد آپ ہی کر رہا تھا مگر اب.....“
 ”کل تک انتظار کرو۔“ وہ تیزی سے کہہ کر لاک کھولنے لگی تھی ابھی تو اسے گجبرے بھی پہنانے تھے۔
 ”اوہ نو یعنی چائے کے لیے بھی کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔ دس اڑناٹ فیئر۔“ اس کی پراحتجاج آواز پر وہ پلٹی پھر اس کے گھرے بالوں کو کچھ اور منتشر کر کے بولی۔
 ”لمبی ہے غم کی رات مگر رات ہی تو ہے۔“ بہت معنی خیز انداز میں کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔
 اور اندر ولید قاسم بہت آسودگی سے مسکراتے ہوئے بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گیا تھا اور اس رات آسمان پر ٹمٹماتے ستارے کچھ اور ٹمٹمانے لگے تھے اور ایک نے دوسرے سے پوچھا تھا۔
 ”محبت نے جیتنے کا فن کہاں سے سیکھا ہے؟“ اور یہ سوال سن کر ادھوری راتوں کے چاند نے ان کی عقل پر ماتم کیا تھا۔ مگر وہ اپنی نازک چاندنی کو وارفتہ نگاہوں سے تکتا نہیں بھولا تھا۔ کبھی کبھی اپنی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے جھکتا پڑتا ہے اور وہ جھکتا رائیگاں نہیں ہوتا۔